جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا
سیف خالد
(سوانح عمری)
احمد سلیم

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا:

سیف خالد

(سوانح عمری)

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا:

سیف خالد

(سوانح عمری)

احمد سلیم

مکتبہء دانیال

ناشر : حُوری نورانی

پہلی اشاعت : ۲۰۲۰ء

سرورق : خدا بخش ابڑو

طباعت : مقصود پریس، کراچی

قیمت : ۸۰۰ روپے

ISBN: 978-969-419-098-3

Jab Aankh Hee Se Na Tapka:
Saif Khalid
by Ahmed Saleem

PAKISTAN PUBLISHING HOUSE
مکتبۂ دانیال

Snowhite Centre, Opposite Jabees Hotel,
Abdullah Haroon Road, Karachi-74400
Phone:3568147-35682036-35681239
Email:danyalbooks@hotmail.com
fb:maktaba-e-danyal

انتساب

شمیم خالد کی محبوب یادوں کے نام

فہرست

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

مرزا غالبؔ

پیش لفظ

اپنے والد کے بارے میں میری ابتدائی یادیں اب دھندلا سی گئی ہیں۔ لیکن اپنی اولین ترین یادوں میں مجھے 1964ء کے موسم سرما کا وہ دن آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ شام کے وقت ان کے اسکوٹر کی آواز پر ہم سب بچے کھلونوں، مٹھائی اور دیگر تحائف کے انتظار میں گیٹ کی جانب دوڑتے۔ کبھی کبھی وہ ہماری ماں کے لئے یاسمین کے سفید پھول بھی لاتے۔ لیکن اس روز وہ سلیٹی رنگ کے پلاسٹک بیجوں کا تھیلا ساتھ لائے تھے جن پر لالٹین بنی ہوئی تھی۔ لاہور میں چوبرجی کے قریب واقع کرشن نگر کا محلہ راج گڑھ سیاسی سرگرمیوں اور نعروں سے گونج رہا تھا۔ ایوب خان اور فاطمہ جناح صدارتی انتخابات کے لئے ایک دوسرے کے مد مقابل کھڑے تھے۔ ایوب کے حامی امیر خانوادوں کے لوگ اپنے سینوں پر بھڑکتے چمکیلے پرکشش سرخ گلاب کے بیج آویزاں کئے ہوئے تھے جبکہ غریب اور نچلے درمیانے طبقے کے لوگ اپنے سینوں پر سستی بھدی سلیٹی لالٹین سجائے پھرتے تھے۔ بہت سالوں تک میں یہی سمجھتا رہا کہ فاطمہ جناح یہ الیکشن ان غیر دلکش بیجوں کی وجہ سے ہاری ہیں۔

میری دوسری یاد ان دنوں کی ہے جب ایوب خان کے خلاف تحریک عروج پر تھی۔ میرے والد ایک بڑے جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ پولیس نے جلوس کو منتشر کرنے کے لئے لاٹھی چارج کیا اور میرے والد سمیت سینکڑوں لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ میری عمر اس

وقت دس سال تھی اور میں بھی تماشہ دیکھنے کی غرض سے والد کے علم کے بغیر ہی جلوس میں شامل ہو گیا۔ لاٹھی چارج کے دوران ایک سپاہی نے مجھے گردن سے دبوچ لیا اور مجھے پولیس کی لاری کی طرف دھکیلنے لگا جو کہ گرفتار شدہ مظاہرین سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے سپاہی کو بتانے کی کوشش کی کہ میں اسکول سے آرہا ہوں اور میرا مظاہرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سپاہی نے جواباً مجھے چپت رسید کی اور کہا مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ آج سارے سکول ہنگاموں کی وجہ سے بند ہیں۔ ایک لمحے کے لئے اس کی توجہ مجھ سے ہٹی اور جیسے ہی اس کی گرفت کمزور پڑی، میں سرپٹ بھاگ کھڑا ہوا اور گھر پہنچ کر ہی دم لیا۔

اگلے دن تمام اخبارات نے میرے والد اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری کی خبر جلی سرخیوں میں شائع کی۔ ان کی بہادری پر میرا سینہ تن گیا۔ جہاں تک اپنی بزدلی کی بات تھی، وہ میں نے کسی کو نہیں بتائی۔

ایوب مخالف تحریک کے دوران طارق علی نے بھی لائل پور کا دورہ کیا۔ جب بائیں بازو کے کارکن ان کے استقبال کے لئے ریلوے اسٹیشن پہنچے تو وہاں پولیس اور جماعت اسلامی کے لاٹھی بردار غنڈوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ اس کے باوجود طارق علی کو جلوس کی شکل میں کچہری بازار لایا گیا جہاں انہوں نے لوگوں سے پر جوش خطاب کیا اور انہیں ایوب آمریت کے خاتمے کے لئے جدو جہد تیز کرنے کو کہا۔ طارق علی جو ان دنوں یورپ میں بائیں بازو کی طلباء اور نوجوان تحریک کے نمایاں رہنما تھے اور یورپی ممالک میں نوجوانوں کی جمہوری آزادیوں اور ویتنام جنگ کی مخالفت کر رہے تھے، نے عوام کو یورپ میں چلنے والی تحریک کی کامیابیوں سے بھی آگاہ کیا۔

ایک دفعہ ولی خان ایک بڑے جلوس کی قیادت کرتے ہوئے لائل پور آئے جہاں ان کے جلوس کا اختتام ہمارے گھر پر ہوا۔ ہم بچے اس سیاسی گہما گہمی پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ اس واقعہ نے بعد میں محلے میں ہمارے بہت سے مخالف بھی پیدا کئے جو میرے والد کو غدار اور باچا خان / ولی خان کا پیرو کار کہتے تھے۔ ہمارے ہمسائے میں دو ریٹائرڈ ایس ایچ او رہا کرتے تھے۔ بہت عرصہ بعد ہمارے ایک رشتہ دار جو فوج

میں کرنل تھے، نے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد انکشاف کیا کہ اُنہیں میرے والد کی جاسوسی کرنے پر لگایا گیا تھااور بعد میں میرے والد کی جتنی گرفتاریاں ہوئیں، گھر میں ان کی موجودگی کی اطلاع وہیں سے جاتی تھی۔

حبیب جالب جب بھی لائل پور آتے، ہمارے گھر پر قیام کرتے ہم اسکول جاتے ہوئے انہیں ڈرائنگ روم کے صوفے پر محوخواب دیکھتے۔ وہ عوام میں بے حد مقبول تھے اور جلسوں میں اپنی شاعری ڈرامائی انداز میں گا کر سناتے۔ لوگ ان کی انقلابی آمریت مخالف شاعری اور گائیکی سے بے حد محضوظ ہوتے۔

دوسری جانب فیض احمد فیض جب بھی لائل پور تشریف لاتے، ان کی محفلوں میں دانشور، صحافی، اہل قلم اور شرفاء کی اکثریت انہیں گھیرے رکھتی۔ وہ زیادہ تر میرے والد کے دوست ساقی صاحب کے گھر پر محفل جماتے جو رات گئے تک جاری رہتی۔

70ء کے عام انتخابات کے وقت میرے والد پنجاب نیشنل عوامی پارٹی کے سیکرٹری جنرل تھے جب کہ میاں محمود علی قصوری پنجاب نیپ کے صدر تھے۔ نیشنل عوامی پارٹی مشرقی پاکستان، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں زیادہ مقبول تھی اور مظلوم قومیتوں کی نمائندہ جماعت سمجھی جاتی تھی۔ پنجاب میں اس کے پاس متحرک کارکن تو تھے لیکن چونکہ پنجاب میں عوام کی اکثریت مظلوم قومیتوں کے حقوق کوتسلیم کرنے سے انکاری تھی۔ اس لئے قومیتوں کے حقوق کی بات کرنے والے سیاست دان پنجاب میں زیادہ مقبول نہیں تھے۔ جب میاں محمود علی قصوری نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور انہیں وہاں ایک اہم حیثیت ملی تو انہوں نے میرے والد کو بھی پی پی پی میں شمولیت کی دعوت دی۔ قصوری صاحب ہمارے گھر آئے اور ان کے درمیان بات چیت پورے دن جاری رہی۔ اس وقت لائل پور میں پیپلز پارٹی کے پاس ایسے کارکن اور رہنما نہیں تھے جو الیکشن میں حصہ لے کر جیت سکتے۔ قصوری صاحب نے میرے والد سے پی پی پی کی تنظیم کاری کے لئے مدد چاہی اور انہیں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن میں امیدواروں کا چناؤ کرنے کے لئے کہا۔ لائل پور شہر کی مرکزی سیٹ میرے والد کو آفر کی گئی۔ میرے والد علالت کے

باعث بستر پر تھے۔ میاں قصوری نے انھیں کہا کہ تم بستر ہی سے الیکشن جیت جاؤ گے۔ بھٹو نے بھی ان سے ملاقاتوں کے دوران پی پی میں شامل ہونے کے لئے کہا۔ اس زمانے میں پنجاب سے بہت سارے ترقی پسند لوگ اس نئی جماعت میں شامل ہو رہے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی نے اپنے کارکنوں کو پیپلز پارٹی میں شمولیت کی اجازت نہیں دی۔ کمیونسٹوں کو جمہوری تحریک میں صرف نیشنل عوامی پارٹی تک محدود کرنا پنجاب کی سیاست کی حد تک شاید کوئی اچھا فیصلہ نہ تھا۔ پنجاب میں ترقی پسند کارکنوں کو عوام کے زیادہ قریب تر رہنے میں یہ پلیٹ فارم شائد زیادہ کار آمد رہتا۔ لیکن جو ترقی پسند کارکنان اس جماعت میں شامل ہوئے بھی تو ان کو بعد میں بھٹو صاحب نے چن چن کر نکال دیا۔

لائل پور میں سیف خالد کے بہت سے ساتھیوں اور رفقاء کار نے بہر حال پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور اسمبلیوں میں منتخب ہوئے۔ ان میں والد کے دوست میاں اقبال، سخاوت علی خان، بدر چوہدری، رانا مختار، طاہر رانا، ان بائیں بازو کے رہنماؤں میں شامل تھے۔ پیپلز پارٹی کا پہلا جلسہ کوتوالی روڈ پر میرے والد کے دفتر کی چھت سے مخاطب کیا گیا جو رحمت گراموفون ہاؤس کے برابر واقع تھا۔ یہ اسٹور موسیقی کا انمول خزانہ رکھتا تھا اور میں نے حال ہی میں سنا کہ ٹیکنالوجی میں تبدیلی کے باعث وقت کا ساتھ نہ دے پایا اور حال ہی میں بند ہو گیا۔

میں نے اپنے والد کو ہمیشہ نا انصافی، استحصال اور ہمارے سماج میں موجود بد صورتی کے خلاف جدو جہد کرتے ہوئے دیکھا۔ بے شک اس لڑائی میں انہیں اکیلے ہی کیوں نہ کھڑا ہونا پڑتا۔ جب انہوں نے مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن کے خلاف کھلے عام آواز بلند کی تو لائل پور میں ہمارے گھر کی دیواروں پر انہیں غدار اور ہندوستانی ایجنٹ قرار دیا گیا۔ یہ 1971ء کے موسم گرما کا ذکر ہے جب انہوں نے ایک دن مجھے پاکستان کا نقشہ تلاش کرنے کو کہا وہ بہت غور سے نقشے کا مطالعہ کرتے رہے۔ پھر انہوں نے اپنا سر مایوسی سے جھٹکا اور کہا کہ پاکستان کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ کچھ ماہ بعد جب میں نے سقوط ڈھاکہ کی خبر سنی تو ان کی سیاسی بصیرت اور شعور پر میرا اعتماد اور بڑھ گیا۔

1960ء کے عشرے میں انہوں نے لائل پور میں پاکستان سوویت دوستی کی انجمن کی داغ بیل رکھی۔ یہ سوسائٹی اکتوبر انقلاب، یوم مئی، لینن ڈے منانے کا اہتمام کرتی جن میں تقاریر کے علاوہ روسی اور مشرقی یورپ کی کمرشل اور دستاویزی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ یہ فلمیں اور پروگرام عام طور پر آرٹس کونسل میں دکھائی جاتیں۔ گورکی کی ''ماں'' آئیزنسٹین کی "Ivan the terrible" اور "Battle ship Potemkin" میرے ذہن میں ایک واضح یاد کے طور پر محفوظ ہیں۔ ایک بلغارین فلم "The Peach Thief" نے مجھ پر گہرا اثر چھوڑا۔ فلم میں دکھایا گیا تھا کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران بلغاریہ کے فوجی افسر کی بیوی کو سربیا کے جنگی قیدی سے پیار ہو جاتا ہے۔ دشمن ممالک کے درمیان دوستی اور شادی شدہ لوگوں کا رومان میرے لئے ایک اچھنبے سے کم نہ تھا۔ ان فلموں نے میرے نوزائید ذہن میں سنجیدہ موضوعات پر یورپین سینما کا گرویدہ کر دیا اور مجھے ہالی وڈ اور دیسی سینما میں دلچسپی نہ ہوئی جب تک کہ 80ء کی دھائی میں ہندوستانی آرٹ سینما اور ایرانی متبادل سینما نے اپنی دھاک نہیں جمائی۔

پاک سوویت فرینڈشپ سوسائٹی پاکستان کے دوسرے شہروں میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھی لیکن لائل پور کی شاخ زیادہ متحرک تھی اور اس نے 60ء کے عشرے میں لائل پور اور قریبی قصبوں اور دیہات سے طالب علموں کو سوویت یونیورسٹیوں میں تعلیم کے لئے بھیجنا شروع کیا۔ 100 کے قریب طالب علم سوویت یونین اور دیگر مشرقی یورپی سوشلسٹ ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے اور بعد میں لوٹ کر معیشت کے مختلف شعبوں میں خدمات انجام دینے لگے۔ یہ سیف خالد کی دور اندیشی اور ویژن تھا کہ غریب اور نچلے متوسط طبقے کے طالب علم بیرونی ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر پائے۔

مجھے اپنے محلہ داروں اور دوستوں کی جانب سے وہ طعنے ابھی بھی یاد ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اگر تم سوشلسٹ ہو تو اپنا گھر ان بے گھر لاچار لوگوں کو کیوں نہیں دے دیتے جو گھر کی نعمت سے محروم ہیں۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اور میں شرمندہ ہو کر رہ جاتا۔ میں اب سوچتا ہوں تو مجھے ہنسی آتی ہے کہ سات لوگوں پر مشتمل ہمارا کنبہ 7

مرلے کے مکان میں رہتا تھا۔ یہ طعنے ہمیں اپنے والد کے ماؤسٹ دوستوں سے بھی ملتے جو ہمیں سوشل امپیریلسٹ کہتے تھے۔میاں محمود احمد ایڈووکیٹ میرے والد کے دیرینہ ساتھی تھے لیکن جب بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے سیاسی کارکن روسی اور چینی کیمپوں میں تقسیم ہو گئے اور نیپ بھی بھاشانی (چین نواز) اور ولی خان (روس نواز) میں تقسیم ہوئی تو یہ پرانے دوست بھی علیحدہ ہو گئے۔

میری دادی میرے والد کے اپوزیشن کی طرف جھکاؤ سے خوش نہیں تھیں۔ انہیں یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی کہ میرے والد ایوب، یحییٰ، بھٹو اور ضیاء جنہیں وہ خاص طور پر بہت نیک اور پرہیزگار جانتی تھیں، کے کیوں مخالف ہیں۔ بہت سال بعد ایک دوست نے میرے والد جیسے لوگوں کو دریا سندھ کی پلہ مچھلی سے تشبیہ دی جو ہمیشہ دریا کے بہاؤ کے مخالف سمت میں تیرتی ہیں۔ انہیں سماج میں نا برابری، ظلم اور نا انصافی کے خلاف جدو جہد کے جرم میں متعدد بار گرفتار کیا گیا۔

سیف خالد پڑھنے لکھنے کے دلدادہ تھے اور ان کی لائبریری سیاست، تاریخ، ادب اور کلچر کے موضوعات پر کتابوں سے بھری رہتی۔ ہمیں اپنی زندگی کے ابتدائی سالوں ہی میں ڈکنز، ہارڈی، موپاساں، چیخوف، مارک ٹوئین، والٹئیر، ٹالسٹائی، مارکس اور لینن کے ناموں سے شناسائی ہوئی جن کو پڑھنے کا موقع ہمیں بہت بعد میں ملا۔ ایک دفعہ جب پولیس نے انہیں گرفتار کیا تو وہ گھر کو سیل اور ان کی لائبریری ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن بعد میں انہیں احساس ہوا کہ تھانے میں ان کے پاس اتنی جگہ نہیں تھی کہ تمام کتابیں وہاں سما جاتیں۔ پولیس نے اسی میں غنیمت جانی کہ ان کتابوں کی فہرستیں تیار کر لیتے۔ یہ کام بھی انہیں مجبوراً ادھورا چھوڑنا پڑا جب انہیں احساس ہوا کہ ان کے پاس کوئی ایسا پولیس والا نہیں تھا جو انگریزی زبان میں لکھ سکتا۔

60ء کے عشرے میں کسی وقت انہوں نے اپنی وکالت کو خیر باد کہا اور مختلف کاروبار کرنے میں قسمت آزمانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ ان کا دل بائیں بازو اور جمہوری سیاست ہی میں رہا اور بزنس عدم توجہی کا شکار رہا۔ یہ میری ماں اور

میرے والد کے پارٹنر عبدالرزاق تھے جنہوں نے کاروبار سنبھالا۔ میری والدہ لائل پور کے قدامت پسند ماحول میں غالباً پہلی عورت تھیں جنہوں نے اپنا بزنس شروع کیا۔ انہوں نے روسی ٹی وی بیچنے کے کاروبار میں بہت کامیابی حاصل کی اور گھر کا خرچہ چلایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ٹی وی نیا نیا متعارف ہوا تھا اور لائل پور میں لاہور اور امرتسر ٹی وی کے سگنل بہت کمزور تھے اور تصویر صاف دکھائی نہیں دیتی تھی ۔ البتہ ابر آلود دنوں میں لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی، جب لاہور اور امرتسر ٹی وی سٹیشن کے پروگرام واضح دیکھے جا سکتے تھے۔ جب امرتسر سے مغل اعظم اور پاکیزہ فلمیں دکھائی گئیں تو بازار سنسان تھے اور لوگ ٹی وی کے گرد جمع تھے۔

دوستوں اور خاندان کے لئے وہ ایک بہت شفیق اور خیال رکھنے والے شخص تھے۔ لڑکوں کو اکثر ان کے غصے کا سامنا کرنا پڑتا، لیکن ہماری بہن ان کی لاڈلی تھی۔ وہ اکثر گایا کرتے "بی بی روبڑی ری، تو تو پانیوں کی رانی، بی بی روبڑی ری" ۔ہمارا گھر ہمیشہ دوستوں ، رشتہ داروں ، سیاسی کارکنوں ، ادیبوں اور شاعروں سے بھرا رہتا۔

ان کی زندگی کے آخری حصے میں جب وہ اپاہج ہو گئے تو ہمیں احساس ہوا کہ ان کے دوستوں کی تعداد کتنی وسیع تھی، نہ صرف لائل پور بلکہ لاہور، کراچی، پشاور، کوئٹہ اور اسلام آباد اور بیرون ممالک ان کے بے شمار دوست تھے جن کو ہم جانتے بھی نہیں تھے۔

وہ اپنی بیماری کے خلاف بھی ویسے ہی لڑے جیسے وہ معاشرے میں موجود دوسرے ناسوروں کے خلاف نبرد آزما تھے ۔ اسی زمانے میں میری والدہ بھی کینسر کے موذی مرض کا شکار ہوئیں جو جان لیوا ثابت ہوا اور وہ 1981ء میں صرف 47 سال کی عمر میں چل بسیں۔ والدہ کا یوں اچانک چلے جانا ان کے لئے بہت بڑا صدمہ تھا۔ میں بیرون ملک زیر تعلیم تھا اور میری بہن اور بھائیوں پر کم سنی ہی میں اس مشکل وقت میں گھر کی ساری ذمہ داریاں آن پڑیں۔ ہم چاروں بہن بھائیوں نے اپنی کم عمری کے باوجود اس ذمہ داری کو سنبھالا اور آخری دم تک ان کی خدمت گزاری کی۔

سیف خالد تمام زندگی ایک سیکولر انسان رہے اور اپنے اصولوں پر سختی سے کاربند

رہے۔ انہوں نے اپنے ترقی پسند خیالات اور نظریئے سے ایک پوری نسل کو متعارف کروایا۔ سامراج، فوجی حکومتوں، قومی استحصال اور اقلیتوں کے خلاف امتیازی سلوک کے بارے میں خیالات آج بہت پاپولر ہو چکے ہیں لیکن اپنی جدو جہد کے ان دنوں میں یہ خیالات پنجاب کے بہت چھوٹے سے حلقے تک محدود تھے۔

اپنی زندگی کے آخری حصے میں، میں ان کی بڑھتی ہوئی بے چینی کو دیکھ سکتا تھا جب وہ ضیاء کے تاریک دور میں ہونے والے ظلم اور جبر کے خلاف اپنے غصے کا اظہار کرنے سے قاصر تھے چونکہ فالج نے ان کی قوت گویائی ان سے چھین لی تھی۔ صبح صبح وہ اخبار تھامے میرے کمرے کے باہر ٹہل رہے ہوتے کہ مجھے ضیاء کے کسی سیاہ کارنامے کے بارے میں بتاسکتے۔ وہ خوش قسمت تھے کہ انہوں نے سوویٹ یونین اور دیگر سوشلسٹ ممالک کے بکھرنے کے عمل کو نہیں دیکھا جو انہیں بہت عزیز تھا۔ ان کے انتقال کے وقت ان کی عمر صرف 60 سال تھی لیکن انہوں نے اپنے پیچھے ایک ایسی روایت چھوڑی ہے جو پاکستان کو یک ترقی پسند، فلاحی معاشرہ قائم کرنے میں مدد دے گی۔

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم
(فیضؔ)

★★★

یہ کتاب لکھنے کا خیال بہت سالوں سے تھا لیکن ایک ایک کر کے میرے والد کے ہم عصر اس دنیا کو چھوڑتے گئے اور ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم رہ گئی جو انہیں براہ راست جانتے تھے۔ چند سال پہلے جب میں نے والد کی یاد میں ایک مختصر تحریر قلم بند کی تو بہت سے عزیزوں اور دوستوں نے اصرار کیا کہ ان کی زندگی پر ایک کتاب لکھی جائے۔ آس پاس نظر دوڑائی تو نظر انتخاب اپنے والد کے دیرینہ ساتھی اور مشہور ادیب احمد سلیم پر پڑی لیکن ان کی گونا گوں مصروفیات اور صحت کی بنا پر ہمت نہ پڑی کہ انہیں یہ مشکل کام کرنے کو کہا جائے۔

احمد سلیم ان دنوں جام ساقی پر ایک کتاب مکمل کر رہے تھے۔ جب میں نے ان سے کتاب لکھنے کی فرمائش کی تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے بڑی گرم جوشی سے حامی بھر لی۔

سیف خالد سے احمد سلیم کا تعلق بہت پرانا تھا جب احمد سلیم زمانہ طالب علمی میں ہی بائیں بازو کی تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ یہ تعلق اگلے بیس سال رہا۔ 80ء کے عشرے میں ضیاء کے سیاہ دور میں جدو جہد کے دوران ان سے میری دوستی ہوئی۔ زیر زمین کام کرنے والے کمیونسٹوں نے لکھاریوں کا ایک سیل بنا رکھا تھا۔ جس میں احمد سلیم کے ساتھ انور پیرزادہ، منصور سعید، اکبر زیدی، شمعون سلیم وغیرہ شامل تھے۔

جن دنوں میں نے احمد سلیم سے سیف خالد پر کتاب لکھنے کی فرمائش کی، ان کے ذہن میں اپنی عمر بھر کی کمائی، اپنی بیش قیمت کتابوں کو ایک گھر فراہم کرنے کا خواب سمایا ہوا تھا۔ وہ اس تگ و دو میں تھے کہ اسلام آباد کے نزدیک ایک لائبریری بنائی جائے۔ لیکن اپنی طبیعت کے عین مطابق انہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود اس کتاب پر بھرپور طریقے سے کام شروع کر دیا۔ ایک روز انہوں نے مجھے 1951ء میں سی آئی ڈی کی لکھی ہوئی ایک خفیہ رپورٹ بھیجی جو اس زمانے کے کمیونسٹوں کی سرگرمیوں سے مطلق تھی۔ اس رپورٹ میں سیف خالد پر اچھا خاصا مواد موجود تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کمیونسٹوں کی جانب سے کن کن محاذوں پر سرگرم عمل تھے۔ اب میں مطمئن تھا کہ ہم صحیح سمت میں سفر کر رہے ہیں۔

غالباً احمد سلیم پاکستان میں وہ واحد شخص ہیں جو بائیں بازو کی تنظیموں کے بارے میں اتنا زیادہ مواد رکھتے ہیں، آزاد پاکستان پارٹی سے لے کر نیشنل عوامی پارٹی، کمیونسٹ پارٹی اور اس کے مختلف دھڑوں سے لے کر ٹریڈ یونینوں، صحافیوں، وکلاء، اہل قلم کی تنظیموں پر جتنا مواد ان کی لائبریری میں موجود ہے شاید ہی کہیں ہو۔ اسی مواد کی بنیاد پر یہ کتاب لکھنی ممکن ہوئی۔

احمد سلیم نے اس کتاب کو لکھنے میں لندن، لاہور، لائل پور، اسلام آباد میں سیف

خالد کے ساتھیوں ، دوستوں اور عزیز و اقارب سے انٹرویو لئے ۔ بہت سے انٹرویو ٹیلیفون پر ہوئے۔ سب سے زیادہ مواد انہیں سیف خالد کے کالج کے زمانے کے دوست میاں اکرم اور بائیں بازو میں ان کے دیرینہ دوست اور ساتھی نواز بٹ سے ملا ۔ ان دونوں کی یاد داشت بلا کی تیز ہے کہ انہیں 70-60 سال پرانی باتیں ایسے یاد تھیں۔ جیسے کل کی بات ہو۔

پچھلے دو برسوں میں یہ کتاب لکھنے میں جو تھوڑی بہت تاخیر ہوئی وہ میری کاہلی اور سستی کی وجہ سے تھی ورنہ احمد سلیم ایک سال میں یہ کتاب مکمل کر چکے ہوتے۔ میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی صحت اور دیگر مصروفیات کو اس کتاب کی تکمیل میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس کتاب کی تکمیل کے بعد وہ اپنی سوانح حیات لکھنے پر توجہ دیں گے جو نوجوان دوستوں کے لئے بے حد دلچسپ ہو گی اور ایک پورے عہد کو سمجھنے میں مدد دے گی۔

ندیم خالد
اکتوبر 2019

سیف ایک دوست، ایک فائٹر

یہ غالباً 30 سال قبل کا واقعہ ہے جب مجھے یہ تکلیف دہ خبر ملی کہ سیف اب دنیا میں نہیں رہا۔ یہ خبر میرے لیے ایک گہرے صدمے اور سانحے سے کم نہ تھی میں اپنی بیوی کے ساتھ کلفٹن برج پر اُس کے فلیٹ پر پہنچا اور اپنے دیرینہ اور پیارے دوست کو آخری بار الوداع کیا، جس کا چہرہ ہمیشہ مسکراہٹ سے چمکتا تھا اور جس کا دل ایک سوشلسٹ پاکستان دیکھنے کے لیے دھڑکتا تھا۔

اس سے کچھ ہی عرصہ پہلے اُس نے ایک ملاقات میں بتایا کہ پشاور میں ایک نئی پارٹی کا کنونشن ہونے جا رہا ہے جس کی قیادت مختار باچہ اور افراسیاب خٹک کر رہے ہیں اور یہ کہ پروفیسر جمال نقوی اس میں شامل نہیں ہے۔ سیف نے اصرار کیا کہ میں اس کنونشن میں ضرور شریک ہوں۔ میں اس کنونشن کے بارے میں ڈاکٹر اعزاز نذیر اور علی امجد ایڈووکیٹ سے سن چکا تھا، لیکن جب سیف نے مجھ سے اصرار کیا تو میں ہاں کیے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ بات نہیں کہ ڈاکٹر اعزاز نذیر اور علی امجد قابل اعتبار نہیں تھے۔ لیکن میں نے زندگی میں ہمیشہ سیف کی بات کو زیادہ اہمیت دی۔

میں سیف سے پہلی بار 1962 میں ملا جب ہم 11 طالب علموں کو پولو گراؤنڈ میں کنونشن مسلم لیگ کا جلسہ درہم برہم کرنے کے الزام میں کراچی سے ایک سال کے لیے شہر بدر کر دیا گیا تھا۔ اس جلسہ عام میں ایوب خان کو اپنی مسلم لیگ کا اعلان کرنا تھا جسے

بعد میں کنونشن مسلم لیگ کا نام دیا گیا۔ ہمیں صرف کراچی ڈویژن سے ہی نہیں، بلکہ حیدر آباد اور سکھر ڈویژن سے بھی دیس نکالا مل چکا تھا۔ عملی طور پر ہمیں سندھ سے نکال دیا گیا تھا۔ حالانکہ اُن دنوں پاکستان میں ون یونٹ تھا اور صوبے وجود نہیں رکھتے تھے۔ جب ہماری ٹرین منٹگمری ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تو ہمیں گاڑی سے اتار کر ریلوے ریسٹ ہاؤس لے جایا گیا اور ہمیں مطلع کیا گیا کہ لاہور اور راولپنڈی ڈویژن میں بھی ہمارا داخلہ ممنوع ہے۔ اگلے دن معراج محمد خان، جوہر حسین اور چند دوسرے دوست کوئٹہ کی جانب روانہ ہوگئے جہاں ان کے کوئی عزیز رہتے تھے جبکہ میں اور فتحیاب پشاور روانہ ہوگئے۔

ایسا نہیں تھا کہ وہاں ہمارے کوئی عزیز واقارب تھے لیکن ہمارے لیے کوئی اور شہر نہیں بچا تھا جہاں پناہ لی جائے۔ کچھ دنوں بعد فتحیاب بھی کوئٹہ روانہ ہوئے اور مجھے پشاور میں اکیلا چھوڑ گئے۔ اس دوران میرا زیادہ وقت شیر افضل ملک کے ساتھ گزرا جو میری طرح ہی شہر بدر تھے اور پشاور ہی میں رہتے تھے۔ میں نے پشاور یونیورسٹی کے لاء کالج میں داخلہ لے لیا اور یونیورسٹی ہوسٹل میں رہنے لگا۔ اس زمانے میں فون ایک ایسی آسائش تھی جو صرف امیر لوگوں کو میسر تھی۔ ہمارے دو شہر بدر ساتھی سید سعید حسن اور آغا جعفر لائل پور میں تھے۔ میں نے آغا جعفر کو خط لکھا اور اس نے مجھے لائل پور آنے اور اپنے ساتھ رہنے کی دعوت دی۔ غالباً اکتوبر کا مہینہ تھا جب میرے کالج میں چھٹیاں تھیں کہ میں نے ٹرین میں لائل پور کا رخ کیا۔ آغا جعفر نے ریلوے اسٹیشن پر میرا خیر مقدم کیا اور مجھے اپنے ساتھ غلہ منڈی کے کمرے میں لے آیا۔ جہاں وہ رہائش پذیر تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ سید سعید حسن مسلم لیگ کے کسی بڑے رہنما میر عبدالقیوم کے گھر پر رہ رہے ہیں۔ آغا جعفر نے بتایا کہ یہ کمرہ اُسے ایک دوست سیف خالد نے دیا ہے جہاں پہلے اُس کا دفتر تھا۔ چونکہ اب یہ کسی استعمال میں نہیں تھا اور سیف نے آغا جعفر کو وہاں ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔ اُسی شام میری ملاقات ایک ہنستے مسکراتے نوجوان سیف خالد سے ہوئی جو کہ گلی وکیلاں میں رہتے تھے۔ سیف نے مجھے شام کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا اور بعدازاں اصرار کیا کہ میں وہیں اس کے گھر کی اسٹڈی میں رک جاؤں۔ میں سیف کی

اسٹڈی دیکھ کر حیران تھا جہاں مارکسزم پر اگر ہزاروں نہیں تو سینکڑوں کتابیں تھیں۔ آئندہ آنے والے دنوں میں میں ان کتابوں میں مکمل طور پر غرق ہوگیا اور یہ سارا وقت کتابیں پڑھنے اور سیف اور میاں محمود سے مباحث کرنے میں گزرتا۔ مجھے دوسرے دوستوں سے بھی ملنے کا موقع ملا جن میں شرافت بھی تھا جو سیف کے گھر کے قریب ہی ایک اکاؤنٹنگ فرم چلاتا تھا۔

مغربی پاکستان کی کمیونسٹ تحریک کے لیے یہ دن بہت اہم تھے۔ یہاں کمیونسٹ پارٹی ایک اکائی کی حیثیت سے وجود نہیں رکھتی تھی۔ سندھ کی کمیونسٹ پارٹی نازش ابروہی کی قیادت میں چلتی تھی جو خود تو روپوش تھے اور ان کی نمائندگی پروفیسر جمال نقوی کرتے تھے۔ کراچی میں پارٹی کی نمائندگی طفیل کرتے تھے۔ مغربی پاکستان کے دوسرے علاقوں میں پارٹی موجود نہیں تھی۔ اس کے باوجود کہ راولپنڈی سازش کیس کے تمام ملزمان رہا ہوچکے تھے لیکن لاہور کے شاہی قلعے کا ٹارچر اور ہیبت کسی بھی ذی ہوش شخص کے حواس خطا کرنے کے لیے کافی تھی۔ سجاد ظہیر کو جواہر لال نہرو اپنے خاندان کے دوست کے طور پر پاکستان سے نکال کر ہندوستان لے جاچکے تھے۔ سی آر اسلم اور فیض صاحب کے علاوہ غیر منقسم ہندستان کے اس حصے سے تمام دیگر دوست ناشناس تھے۔ کامریڈ لال خان جو کہ غالباً جہلم سے تعلق رکھتے تھے سید سبط حسن کے کوریئر تھے۔ سبط حسن کو ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے امریکا سے بلا کر پارٹی کو لاہور میں منظم کرنے کی ذمہ داری دی تھی۔ سبط حسن لاہور کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ وہ مال روڈ پر کمیونسٹ پارٹی کے فراہم کردہ ایک فلیٹ میں رہا کرتے تھے۔ لال خان سبط حسن کو لانے لے جانے کا کام کیا کرتے تھے۔ لال خان کو قلعہ میں بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور ان کی ٹانگ توڑ دی گئی۔ اُنھوں نے تین دن تو تشدد برداشت کیا لیکن پھر تشدد کی تاب نہ لاتے ہوئے سبط حسن کا جائے وقوع بتانے پر مجبور ہوگئے۔ پولیس نے سبط حسن کو گرفتار کر لیا۔ فیض صاحب کو جسمانی تشدد کا نشانہ تو نہ بنایا گیا لیکن ذہنی کرب اور توہین ناقابل برداشت تھی۔ فیض صاحب انڈین آرمی میں کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہو کر پاکستان ٹائمز اور

امروز کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ لاہور کے شاہی قلعے میں تین ماہ قید تنہائی میں محبوس رہنے کے بعد جب ایلس فیض کی رٹ پٹیشن پر اُنھیں لاہور ہائی کورٹ میں پیش کرنے کے لیے پیدل لے جایا گیا۔ تو اُن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں زنجیروں میں جکڑے تھے۔ اسی موقع پر فیض کی شہرآفاق نظم ''آج بازار میں پابا جولاں چلو'' تخلیق ہوئی۔ جنرل اکبر خان کو اُن کی بیوی کے ساتھ حراست میں لیا گیا۔ برطانوی قبضہ گیروں سے سیکھے ہوئے ریاستی جبر وتشدد کے سامنے سردار شوکت علی کی طرح بہت سے دوست ہتھیار ڈال بیٹھے۔

حیدر آباد دکن کے متمول زمیندار گھرانے سے تعلق رکھنے والے حسن ناصر کو کراچی سے گرفتار کر کے لاہور کے شاہی قلعہ لے جایا گیا جہاں اُنھیں تشدد کا نشانہ بنا کر مار ڈال گیا۔ خوف و جبر کا یہ عالم تھا کہ میاں محمود علی قصوری جیسے وکیل جو انسانی حقوق کے کیس لینے کے لیے مشہور تھے، نے حسن ناصر کا کیس لینے سے مجبوری ظاہر کی۔ میجر اسحٰق جنھیں میں پہلے مارچ 1961 میں مل چکا تھا نے مجھے بتایا کہ ملٹری کورٹ میں طلباء کے کیس کے لیے میاں قصوری سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں پھر بھی قصوری صاحب سے ملا لیکن انھوں نے تفصیل سننے کے بعد کہا کہ بہتر ہے کہ یہ کیس کراچی ہی میں لڑا جائے۔ اُنھوں نے مجھے فخر الدین جی ابراہیم کا نام دیا جو بعد میں وکالت پاس کرنے کے بعد میرے مربی اور محسن بنے۔

یہ ساری باتیں بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ایک مارکسٹ اور کمیونسٹ پارٹی کے لیے یہ صورتحال کس قدر خطرناک تھی۔ لیکن اس مشکل وقت میں بھی لائل پور میں کمیونسٹ پارٹی کی شہری تنظیم موجود تھی جس کی قیادت میاں محمود اور سیف خالد کرتے تھے۔ یہ وہ دن تھے جب بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک میں سٹالن ازم کے اثرات کے خلاف مہم جاری تھی۔ میاں محمود اور سیف کے ساتھ اس موضوع پر بھرپور مباحث ہوئے۔ ایک دن سیف مجھے اپنے گھر کے پچھلے دروازے سے نکال کر لاری اڈے لے آئے اور ہم نے لاہور کی راہ لی جہاں جانا میرے لیے ممنوع تھا۔ لاہور میں میرے بہت رشتہ دار تھے لیکن سیف

نے مجھے اُن سے ملنے سے روکا۔ ہم سی آر اسلم اور دیگر دوستوں سے ملے لیکن کوئی بھی مغربی پاکستان کی سطح پر کمیونسٹ پارٹی کے تنظیمی ڈھانچے کو کھڑا کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ رات میں ہم مال روڈ کے اُسی فلیٹ میں رہے جہاں ایک زمانے میں سبط حسن رہا کرتے تھے اور مجھے پتہ چلا کہ اب یہ سیف کے استعمال میں ہے۔

کچھ ہی عرصہ بعد میں واپس پشاور چلا آیا اور اپنے تجربات اور تجزیے سے شیر افضل ملک کو آگاہ کیا۔ ہم نے طے کیا کہ ہم اکھٹے لائل پور جائیں گے۔ شیر افضل ملک کا آبائی گاؤں کھابکی ضلع خوشاب میں تھا۔ ہم نے وہاں آغا جعفر اور سید سعید حسن کو بھی مدعو کیا اور ہم نے تین چار دن وہاں کے قریبی جنگلوں میں شکار کھیلا۔ واپسی پر ہم لائل پور میں رکے اور سیف اور میاں محمود سے سیر حاصل مباحث لیے۔ شیر افضل نے لائل پور کے دونوں رہنماؤں کو ہماری شہربدری ختم ہونے کے بعد کراچی آنے کی دعوت دی۔ اس پس منظر کو بیان کرنے کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ بتایا جائے کہ میں سیف سے کیسے ملا بلکہ یہ بھی ہے کہ یہ واضح ہو کہ لائل پور کمیٹی کس طرح سے سندھ پارٹی کمیٹی سے مضبوط روابط بنانے میں کامیاب ہوئی۔

میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ کس طرح ایڈونچر سیف کی طبعیت کا حصہ تھا۔ ہماری کراچی سے شہربدری کے دوران، سی آئی ڈی کے گارڈز گھر کے باہر ہمہ وقت پہرہ دیتے تھے۔ جب میں پشاور کے ہوسٹل میں تھا تو سی آئی ڈی 24 گھنٹے مجھ پر نظر رکھتی تھی اور اسی طرح لائل پور میں بھی مجھ پر سی آئی ڈی کا پہرہ رہتا۔ آغا جعفر اور سید سعید حسن کے معاملے میں بھی یوں ہی تھا۔ ان تمام خطرات کے باوجود سیف نے نہ صرف اپنا دفتر آغا جعفر کو رہنے کے لیے دیا بلکہ مجھے بھی اپنی اسٹڈی میں رہنے کی اجازت دی۔ جہاں گلی وکیلاں میں ایک سی آئی ڈی کا آدمی میری نگرانی پر معمور تھا۔ اور یہ بھی کہ سی آئی ڈی سے نظر بچا کر مجھے لاہور بھی لے آیا۔ کسی بھی قسم کے اقتدار کے خلاف چاہے وہ پولیس ہو یا حکومت کا کوئی دوسرا ادارہ ہو، سیف ہمیشہ لڑنے کے لیے تیار ہوتا۔

کچھ عرصہ بعد جب شہر بدری کا ایک اور دور چلا تو اُس نے ہم آٹھ دوستوں کو اپنے

گھر میں مہمان ٹھہرایا۔ صرف وہ خود ہی نہیں بلکہ اُس کی اہلیہ بھابھی شمیم بھی ہمیشہ ہمارا خیر مقدم کرتیں۔ 1972 اور 1975 کے درمیان جب ہم دونوں نیشنل عوامی پارٹی کی سنٹرل کمیٹی میں تھے۔ اور جب 1974-1975 میں اس پر پابندی لگی، سیف، جالب اور میں ہمیشہ اکھٹے سفر کیا کرتے۔ بھٹو مرحوم کے دور میں مجھے متعدد بار جیل کی ہوا کھانی پڑی اور بعض اوقات مجھے زیر زمین بھی جانا پڑا۔ اُن دنوں میں بھی سیف کے جوتوں کی کرائے کی فیکٹری میں ایک کمرہ تھا جہاں میں زیر زمین رہنے کے دوران قیام کرتا۔ مال روڈ لاہور پر سیف کا فلیٹ بائیں بازو کے تمام کارکنان کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا جہاں وہ آتے، قیام کرتے اور اپنے اپنے کاموں کے لیے نکل جاتے۔

ایک دفعہ جوہر حسین مہینوں کے لیے وہیں مقیم رہے۔ جالب بھی شام کو وہاں پینے پلانے کے سامان کے ساتھ موجود ہوتے۔ بائیں بازو کے تمام کارکنوں کے لیے یہ بالکل مفت تھا۔ ہم ہمیشہ خود کو وہاں محفوظ تصور کرتے۔ جب نیپ پر پابندی لگائی گئی تو مجھے قریباً ایک سال جیل میں رکھنے کے بعد کوئٹہ سے تعلق رکھنے والے امتیاز حنفی کے ساتھ سہالہ پولیس ریسٹ ہاؤس سے اچانک رہا کیا گیا، جہاں ہمیں ولی خان، غوث بخش بزنجو، عطا اللہ مینگل، نواب خیر بخش مری اور غلام محمد بلور کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ ہم دونوں نے ٹیکسی لی اور چونکہ ہمارے پاس کوئی رقم نہیں تھی ہم نے اسلام آباد میں نیپ کی قیادت کی طرف سے کرائے پر لیے جانے والے گھر کا رخ کیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو وہاں جمع ہونے والے دوستوں نے حیرت سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ سیف بھی وہاں موجود تھا۔ میں نے اپنی بیوی کو فون کیا اور اُسے راولپنڈی آنے کو کہا۔ سیف نے ہماری گفتگو سن لی اور اصرار کیا کہ کراچی جانے سے پہلے ہم لائل پور آئیں گے۔

جب نیپ پر پابندی لگا دی گئی تو میں اور سیف نے پورے پاکستان کا چکر لگایا تاکہ شیر باز مزاری کو نئی پارٹی بنانے پر آمادہ کیا جاسکے، جس کا نام نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی تجویز کیا گیا۔ بلوچستان سے سینیٹر ہاشم غلزئی مرحوم نے بھی ہماری کاوشوں کی حمایت کی۔ لیکن جب نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی بن گئی تو ہمیں محسوس ہوا کہ ہم دونوں کو اُس میں خیر

مقدم نہیں کیا جا رہا۔ سیف اور میں نے مل کر نئی نیشنل پروگریسو پارٹی بنائی جس کا کنوینر سیف خالد اور سیکریٹری جنرل میں تھا۔ وہ ایک سال میرا اور سیف کا بہت قریبی ساتھ رہا۔ سیف مزدور، کسان، طلباء کمیٹی کے قیام میں بھی پیش پیش تھا اور لاہور کے ایک بڑے ہال میں اس کی جنرل باڈی اجلاس کی صدارت بھی کی جس میں پنجاب کی تمام 23 اضلاع سے آئے ہوئے مندوبین موجود تھے۔

سیف اور میں نے بیگم نسیم ولی خان کو سیاست میں لانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اُس وقت تک نسیم ولی خان ایک گھریلو خاتون تھیں اور سنٹرل کمیٹی کے اراکین میں ماسوائے اجمل خٹک کے جنھیں وہ اپنا بھائی کہتی تھیں، کسی سے رابطے میں نہیں تھیں۔ ہم نے اُنھیں مختلف جلسوں میں آ کر اپنا اظہار خیال کرنے کی دعوت دی۔ اُنھوں نے یہ کام بخوبی انجام دیا۔ لیکن بعد میں اُنھوں نے NDP بنانے کے دوران خود کو شیر باز مزاری کے زیادہ قریب پایا اور ہمیں مین اسٹریم سیاست سے نکالنے کا فیصلہ کیا۔

میں اور سیف پارٹی بنانے کے عمل کے دوران بعض معاملات میں اتفاق نہ رکھتے تھے لیکن پالیسی معاملات میں ہماری سوچ ایک تھی۔ سیف جانتے تھے کہ پنجاب سے تعلق رکھنے والے ساتھیوں کا کردار تحریک میں ثانوی رہے گا چونکہ پنجاب سے تعلق رکھنے والی فوجی اسٹیبلشمنٹ کے جبر و استبداد کا بنیادی ہدف چھوٹے صوبوں سے تعلق رکھنے والے ساتھی تھے۔ ولی خان نے ایک دفعہ کہا کہ فوج کا 71% حصہ پنجاب سے تعلق رکھتا ہے اور پنجاب سے تعلق رکھنے والے تمام خاندانوں کا بلواسطہ یا بلاواسطہ رشتہ کہیں نہ کہیں فوجی اسٹیبلشمنٹ سے مل جاتا ہے۔ سیف کو یہ حقیقت اچھی طرح معلوم تھی۔

سوویٹ یونین کے ساتھ قریبی تعلقات کی اہمیت سیف کے نزدیک بہت زیادہ تھی۔ جب سوویٹ یونین نے لومبا یونیورسٹی میں تعلیم کے لیے طالب علم مدعو کیے تو سیف کا بھانجہ عبدالوحید اُس یونیورسٹی کا پہلا پاکستانی طالب علم تھا۔ بعد میں سیف کا بیٹا۔ ندیم بھی اسی یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے گیا۔ سیف کا خاندان آپس میں بہت قریب تھا اور میں نے اُس کے بھائی اقبال کو انتہائی ملنسار اور مددگار پایا حالانکہ اُس نے سیاست میں

کبھی براہ راست حصہ نہیں لیا۔

نیشنل پروگریسو پارٹی بنانے کے ایک سال بعد سیف اور میں نے اپنی ذمہ داریاں ڈاکٹر اعزاز نذیر اور افراسیاب خٹک کو سونپ دیں، جو بعد میں پارٹی کے صدر اور جنرل سیکریٹری بنے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے شروع سے علم تھا کہ یہ پارٹی چلنے والی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ کمیونسٹوں اور ان کے قریبی اتحادیوں کا پبلک فرنٹ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سیف کا بھی یہی موقف تھا لیکن اُس نے کبھی کھلے طور پر اس کا ذکر نہیں کیا۔

1979ء میں سیف پر فالج کا حملہ ہوا۔ جب کچھ عرصہ بعد میں ناظم آباد میں واقع کرائے کے گھر میں اُس سے ملنے گیا تو میں نے تیز وطرار، جارح انداز رکھنے والے، بہت سے لوگوں کے لیے رول ماڈل رہنے والے سیف کو بستر میں ایسے حال میں پایا کہ اُس کے لیے ہلنا جلنا بھی ممکن نہیں تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور مجھے ساتھ بتائے وہ دن یاد آ رہے تھے جب سیف لائل پور کا کامیاب وکیل تھا اور سیاست کے لیے بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ میں ایک فالج زدہ سیف کو زیادہ دیر دیکھ نہ پایا اور بھابھی شمیم سے اپنے آنسو چھپاتا وہاں سے نکل آیا۔ کچھ دیر بعد مجھے پتہ چلا کہ بھابھی شمیم کو کینسر ہو گیا ہے اور سیف اُن کے ساتھ علاج کے لیے لاہور منتقل ہو گیا ہے۔ جب میں نے سیف کو کراچی سے افسوس کے لیے فون کیا تو یکے بعد دیگرے آنے والے مصائب کے باوجود استقامت سے ڈٹا ہوا پایا۔ مجھے یقین ہے کہ سیف کے لیے یہ انتہائی کاری وار تھا۔

اگلی دفعہ سیف سے میری ملاقات کراچی میں سوویٹ یونین کے کلچرل سینٹر میں ہوئی جہاں میر غوث بخش بزنجو سوویٹ یونین کے دورے کے بعد "Perestroika" پر گفتگو کرنے آئے تھے۔ اس اصطلاح کے بارے میں میں نے پہلے نہیں سنا تھا۔ سیف پہلی رو میں اپنے ہاتھوں میں چھڑی تھامے بیٹھا تھا۔ اُس نے مجھے اپنے ساتھ بٹھانے کے لیے بلایا۔ حالانکہ میں بزنجو صاحب کی تقریر سن رہا تھا لیکن میرا ذہن سیف کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کس طرح ایک انتہائی جذباتی بحث و مباحث کا شوقین، سیاست میں متحرک سیف ایک خاموش تماشائی کی طرح دوسروں کو سن رہا ہے۔ مجھے اپنے ساتھی اور

پارٹنر کے لیے افسوس تھا جو صبح سے شام دیر تک اپنی گاڑی میں پشاور سے اسلام آباد، اسلام آباد سے لاہور اور پھر لاہور سے لائل پور بلا تھکان میرا ہم سفر تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ہم پشاور سے واپس آتے ہوئے پارلیمان کے اراکین کے لیے لاجز میں گئے لیکن ہمیں اپنے جاننے والا کوئی نہ ملا۔ میں کسی ہوٹل میں رات گزارنے کا سوچ رہا تھا کہ سیف نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ مفتی محمود کی رہائش پر چلا جائے جو اُس وقت پارلیمنٹ میں اپوزیشن کے لیڈر تھے۔ ہم وہاں پہنچے تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُنھوں نے ہمیں خوش آمدید کیا اور ہمیں علیحدہ کمرے میں رہنے کا انتظام کر دیا۔ مفتی صاحب کے پاس اپوزیشن کے لیڈر ہونے کی وجہ سے دو کمرے تھے۔ خود انھوں نے اصرار کیا کہ وہ ہمیشہ فرش پر سوتے ہیں اور قالین والے فرش پر سو گئے۔

کچھ سال بعد سیف اپنے بیٹے ندیم کے پاس کراچی منتقل ہو گئے۔ میری سیف سے ملاقات ہوئی لیکن بہت باقاعدگی سے نہیں۔ میں نے 1979ء میں کمیونسٹ پارٹی سے کچھ انتظامی معاملات میں اختلافات کے بعد علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ بیمار ہونے کے باوجود سیف کو اس بارے میں معلوم تھا۔ اس کے باوجود کہ میں 1979ء میں عملی سیاست چھوڑ چکا تھا، مجھے پی آئی اے کے طیارے کو کابل ہائی جیک کرنے کے الزام میں زندگی میں نویں لیکن آخری دفعہ گرفتار کر کے کراچی سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ جب میں اس دفعہ جیل سے باہر آیا تو میں اپنا ذہن بنا چکا تھا کہ میں بیرون ملک منتقل ہو کر اپنے خاندان کی کفالت کے لیے معاش کا کوئی ذریعہ ڈھونڈوں گا۔ اُس وقت تک میں پارٹی کے لیے بلامعاوضہ کل وقتی کارکن کے طور پر کام کرتا تھا۔ میں نے 1979ء میں ایک گارمنٹ فیکٹری میں ملازمت کر لی تھی اور کچھ عرصہ ملازمتیں بدلتا رہا۔ لیکن جب مجھے طیارہ ہائی جیکنگ کیس میں گرفتار کیا گیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ پاکستان سے نکل کر نئی زندگی شروع کرنے کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ میں دبئی اور بعد میں امریکا اور یورپ میں بہت سی جگہ پر کام کرنے گیا۔

اب سیف کراچی میں تھا لیکن میں باہر تھا۔ ہم کبھی کبھار ندیم کے گھر پر ملتے۔

یہیں سے ہم اُسے ڈیفنس قبرستان لے گئے۔ جب سیف کو قبر میں اُتارا جا رہا تھا تو جناح اسپتال میں بلڈ بنک کے بانی ڈاکٹر رحمان علی ہاشمی نے وہاں موجود لوگوں سے خطاب میں 1953 سے سیف سے وابستگی کی تاریخ بیان کی جب آل پاکستان اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام ہوا اور سیف اس میں لائل پور کی نمائندگی کر رہے تھے۔

میں جانتا ہوں کہ میری تحریر طویل ہوتی جا رہی ہے لیکن سیف کے ساتھ میرا تعلق میری زندگی میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اس تعلق کے بغیر میری اپنی زندگی کی کہانی نامکمل ہے جو اس کے اس دنیا سے چلے جانے تک قائم رہا۔

میں سیف سے پیار کرتا تھا اور اُس کے ساتھ بتائے جانے والے سال میری زندگی کا ایک قیمتی اثاثہ رہیں گے۔

نواز بٹ

سیف کی یاد میں

ندیم خالد نے دو اہم فیصلے کیے۔ پہلے اس نے اپنے والد سیف خالد کی زندگی اور جدوجہد پر کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک اہم فیصلہ تھا کیونکہ سیف کی زندگی بھر کی جدوجہد پاکستان میں بائیں بازو کے کارکنوں کی آزمائشوں کی داستان ہے۔

ان سیاسی کارکنوں کو کمیونسٹ پارٹی جیسی نظریاتی جماعت کے زیر سایہ پنپنے کا موقع نہیں ملا چونکہ اس پارٹی کو بہت سالوں تک کالعدم رکھا گیا لیکن جب اسے کسی حد تک شدید پابندیوں سے آزاد ہونا چاہیے تھا اُس وقت بھی اس کے رہنماؤں، کارکنوں حتیٰ کہ اُن کے خیرخواہوں کو بھی تنظیم کاری اور اظہار رائے کی آزادی نہیں تھی۔ جب بھی فوجی آمریت ملک پر مسلط ہوئی بائیں بازو کے ان کارکنوں کو ایک قائدے کے مطابق جیل بھیج دیا جاتا۔

بائیں بازو کے کارکن جب ٹریڈ یونین، طلباء تنظیموں اور ادبی ثقافتی تنظیموں کے ذریعے لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے تو اُسے بھی ناکام بنا دیا جاتا۔ اکثر اوقات انہیں مقبول عام سیاسی جماعتوں کے پلیٹ فارم سے بھی کام کرنا پڑتا اور بعض ایسے سمجھوتے کرنے پڑتے جو اُنھیں اپنے مقصد سے دور لے جاتے۔ ان جماعتوں میں بھی اُن سے تعصب برتا جاتا اور انھیں دوسرے اراکین کے برابر نہیں سمجھا جاتا تھا۔ سیف خالد نے اپنی زندگی کے 60 سالوں میں سے 40 بیش قیمت سال بائیں بازو کی سیاست کے لیے

وقف کیے اور اُن تمام مصائب کا سامنا کیا جو یہاں بیان کیے گئے ہیں۔ سیف کی زندگی کی کہانی پاکستان کے عوام کی سیاسی تاریخ کا ایک بیش قیمت حصہ ہے۔ پاکستان کے بائیں بازو کے کارکنوں کی جدوجہد بہت سے لوگوں کی سوانح حیات کی صورت میں موجود ہے لیکن بلاشک وشبہ اس موضوع پر ایک سیر حاصل کتاب دستیاب نہیں ہے۔اس لیے ہمیں ندیم کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اُس نے اس کتاب پر کام کرنے کا بیڑہ اُٹھایا۔

ندیم کا دوسرا اچھا فیصلہ احمد سلیم کو یہ کتاب لکھنے پر آمادہ کرنے میں تھا۔ احمد سلیم کو ترقی پسند موضوعات پر سنجیدہ کام کرنے میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اسے اپنے شاعری اور نثر میں کام پر اور اپنے باغیانہ خیالات کے باعث بہت سے مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس لیے احمد سلیم کے لیے یہ قطعاً مشکل نہیں تھا کہ وہ سیف خالد کی انتخاب کردہ راہ کے پیچھے محرک مجبوریوں کو سمجھ پاتے اور اُن کی ایسی تصویر کشی کرتے جس سے سیف کی زندگی کے خدو خال بہت واضح نظر آتے ہیں۔ احمد سلیم نے گہری تحقیق کے ذریعے سیف کی زندگی کے دور کو اُجاگر کیا ہے۔ اپنے نقطہ نظر کو اُجاگر کرنے کے لیے انھوں نے متعلقہ تنظیموں کی قرار دادوں اور سرکلرز کی مدد بھی لی ہے۔ احمد سلیم نے سیف خالد کی سوشلسٹ کاز کے ساتھ نظریاتی وفاداری کی سطح کو بھی نمایاں کیا ہے اور سیف کی اس صلاحیت کو بھی اُجاگر کیا ہے جس کے ذریعے وہ ریاستی جبر کے ذریعے دبائی جانے والی جدوجہد کی جگہ مزاحمت کی نئی شکلوں کو تلاش کرنا جانتے تھے۔ اس طرح سیف خالد کی زندگی کی نمایاں خصوصیات کو اجاگر کرتے ہوئے احمد سلیم نے بائیں بازو کی چار دہائیوں 1950-1980 کی سیاسی تاریخ بھی بیان کی ہے جب سرکار کے لیے ممکن نہ تھا کہ بائیں بازو پر پابندیوں اور جبر کے بغیر وہ عوام کے بنیادی اور جمہوری حقوق کی پامال کا سوچ بھی سکتے۔حالانکہ احمد سلیم نے سیف خالد کی زندگی اور دور کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے، لیکن میں اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اُس بے چین روح کے متعلق اپنی یادداشتوں کا اضافہ کرنا چاہوں گا جس کا نام سیف خالد تھا۔

میرے ذہن کے اُفق پر سیف سے میری وابستگی اور دوستی تین ادوار میں بٹی نظر

آتی ہے۔ 1960 کے اوائل سے 1969 تک 1970 سے 1977 تک اور 1978 سے 1987 تک۔

شروع کے ادوار میں ہماری ملاقاتیں گاہے بگاہے ہوتیں اور گفتگو بھی محدود تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ سیف سے میری پہلی ملاقات امتیاز شاہ کے ذریعے ہوئی جو کہ کمیونسٹ پارٹی کے ممتاز رہنما شمیم اشرف ملک کے قریبی ساتھی تھے اور پچھلے چھ سال سے میرے اُن سے دوستانہ روابط تھے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ کامریڈ سیف کے والد سول اینڈ ملٹری گزٹ یا شیخ نصیر احمد کی کالونی ٹیکسٹائل ملز سے وابستہ تھے۔ یہ سردیوں کے دن تھے اور سیف نے اپنے پیٹ پر کسے ہوئے سویٹر کے اوپر ایک کوٹ پہنا ہوا تھا اور اُس کا سفید کالر کھلا تھا۔ اُس کے پیکر کا سب سے نمایاں حصہ ایک اخبار تھا جسے وہ پوری ملاقات کے دوران اپنے ہاتھوں میں مڑوڑتا رہا۔ اپنی پہلی ملاقات کے بعد سیف کے بارے میں جو تاثر لے کر اُٹھا وہ ایک غصیلے نوجوان کا تھا، حالانکہ وہ عمر میں مجھ سے دو سال بڑا تھا لیکن اُس نے اس بات کا کبھی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ میں پاکستان ٹائمز سے گزشتہ دس سال سے وابستہ تھا اور روزنامے کے چیدہ لکھاریوں میں شامل کیا جانے لگا تھا اور اسی مناسبت سے مجھے بائیں بازو کا باخبر شخص گردانا جاتا تھا باوجود اس کے کہ میں اس کا اہل نہیں تھا۔

1960 کے عشرے میں اپنی ملاقاتوں میں میں نے سیف کو ایک انتہائی پرعزم سرگرم کارکن پایا۔ وہ ایوب آمریت کا شدید مخالف تھا۔ وہ بائیں بازو کے ان سیاستدانوں پر بھی شدید تنقید کرتا تھا جو ایوب مخالف مظاہرین کو گالیاں دیتے تھے اور اس عمل سے جمہوریت کی مخالفت کرتے تھے۔ وہ اپنے خیالات اور دلائل کا اظہار ایسے جذبے کے ساتھ کرتا تھا جو وقت کے ساتھ مدہم نہیں ہوا۔ جب وہ لائل پور واپس چلا گیا تو اُس کے ساتھ ملاقاتیں کم ہونے لگیں۔

سیف کے بارے میں ایک اور بات جو مجھے اُن دنوں پتہ چلی وہ اُس کی اپنے دوستوں کے لیے بے لوث محبت تھی۔ اپنے دوستوں کی مہمان نوازی میں سیف بہت وسیع

القلب تھا۔ لاہور کی نقی بلڈنگ میں اُس کا فلیٹ جو مال کے سب سے بارونق علاقے میں تھا، مختلف النوع دوستوں کی محفلوں کا ٹھکانہ تھا اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ سیف وہاں موجود ہے یا نہیں۔ یہ اُس کے بعد کے عرصے کا ذکر ہے جب سبط حسن کو یہاں سے شاہی قلعے کے عقوبت خانے میں لے جایا گیا تھا۔ بہت سے لوگ یہاں رات میں بھی ٹھہر جاتے۔ مجھے بھی اکثر وہاں سنجیدہ مباحث اور محفلوں میں شرکت کا موقع ملتا البتہ سیف کی غیر موجودگی میں سنجیدہ بحث کا حصہ بہت کم ہوتا۔

1970 کے عام انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی ضلع لائل پور کی تمام نونشستوں پر کامیاب ہوئی۔ کامیاب ہونے والے بہت سے امیدوار اُس کے دوست تھے، لیکن سیف نے الیکشن کو زیادہ سنجیدگی سے نہ لیا۔ پی پی کے بارے میں سیف زیادہ اچھی رائے نہیں رکھتا تھا لیکن سیاسی اختلافات نے ان دوستوں سے ذاتی مراسم میں کوئی فرق نہیں دیا جو پی پی کی جانب چلے گئے تھے۔ نہ ہی میاں محمود احمد سے اُس کے تعلقات خراب ہوئے جو نیشنل عوامی پارٹی کے بھاشانی دھڑے میں اہم حیثیت حاصل کر چکے تھے جبکہ سیف خود نیشنل عوامی پارٹی۔ ولی خان کے دھڑے میں تھے۔

بھٹو کے اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی میں معائدہ ہوا جس کے تحت خیبر پختونخواہ اور بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت العلما اسلام کے درمیان مخلوط حکومت تشکیل پائی۔ نیپ ولی کا نیشنل کنونشن پشاور میں ہوا جس میں پنجاب کے کمیونسٹوں نے اپنے رفیق کمیونسٹ غوث بخش بزنجو کو بھٹو کے ساتھ معائدہ کرنے کا معمار قرار دیا اور اُن پر کڑی تنقید کرتے ہوئے ولی خان کا ساتھ دیا۔ میں نے کنونشن کا احوال سیف سے نہیں سنا حالانکہ میں کنونشن کے فوراً بعد اُس سے ملا تھا، لیکن میں نے اس واقعے کا ذکر کرنا اس لیے مناسب سمجھا کیونکہ اس کا تعلق ایک ایسی بات سے تھا جو سیف نے مجھے چودہ پندرہ سال بعد ہونے والی ملاقات میں منکشف کی۔

30 مئی 1974 میں مختار رانا کی نااہلی کے بعد لائل پور قومی اسمبلی حلقہ نمبر 1 میں ضمنی انتخابات ہوئے۔ پیپلز پارٹی کے ابتدائی ایام میں مختار رانا انتہائی متنازع شخصیت کے مالک

تھے۔ میں ڈان کے ناصر عثمانی کے ساتھ الیکشن کا جائزہ لینے لائل پور پہنچا۔ ہم چنیوٹ بازار میں سیف کے گھر پولنگ سے ایک رات پہلے ہی پہنچ گئے جہاں ہم نے ایک پرتکلف ڈنر کیا اور رات، سیف کے مہمان کے طور پر اُسی کے گھر میں گزاری۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ میں سیف کی اہلیہ سے ملا جن کی باکمال اور لاجواب شخصیت کے پہلو آنے والے سالوں میں مجھ پر آشکار ہوئے۔ اگلی صبح آملیٹ اور پراٹھے کے زبردست ناشتے کے بعد سیف نے ہمیں اپنے کام پر چھوڑا جس میں مختلف پولنگ اسٹیشن کا دورہ، وہاں پولنگ اسٹاف اور امیدواروں کے حامیوں سے انٹرویو شامل تھے۔

الیکشن کے نتائج پیپلز پارٹی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا اظہار کر رہے تھے جس میں اس کے امیدوار پنجابی زبان کے نامور شاعر اور ناول نگار افضل احسن رندھاوا نے نہ صرف یہ سیٹ جیت لی بلکہ گزشتہ الیکشن میں مختار رانا کو پڑنے والے ووٹوں سے چند ہزار ووٹ زیادہ لیے۔ میاں زاہد سرفراز جو سیف کے دوست تھے دوسرے نمبر پر رہے اور اپنے ووٹ میں اسی تناسب سے ووٹوں کا اضافہ کر پائے۔ جبکہ مختار رانا کی ہمشیرہ زرینہ رانا تیسرے نمبر پر آئیں۔ زرینہ رانا کے خلاف جس طرح کا ماحول تھا اُس میں یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ اس الیکشن کے بعد سیف کا تبصرہ قابل ذکر تھا۔ رحمان صاحب اُس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''یہ پیپلز پارٹی کے زوال کی ابتدا ہے'' 1977 کے الیکشن میں پیپلز پارٹی ضلع لائل پور کی 13 میں سے 12 نشستیں جیت گئی لیکن لائل پور حلقہ نمبر 2 میں میاں زاہد سرفراز سے ہار گئی۔

1974 کے ضمنی انتخابات سے پہلے میں پاک سوویٹ یونین دوستی کی انجمن کے سیکریٹری جنرل کا عہدہ سنبھال چکا تھا جس کے صدر فیض احمد فیض تھے۔ ہم سوشلسٹ ممالک میں تعلیم کے لیے طالب علموں کی مدد کرنے لگے۔ اس شعبے میں سیف یہ کام ہم سے بہت پہلے سے کر رہا تھا۔ میں نے اس دوران سوویٹ یونین کا دورہ کیا جہاں میری ملاقات سیف کے بیٹے ندیم، اُس کے پرجوش بھتیجوں شاہد اور زاہد اور حوری نورانی سے بھی ہوئی سوشلسٹ ممالک سے دوستی میں ہماری مشترکہ دلچسپی نے سیف سے میرے مباحث

میں ایک نئے پہلو کا اضافہ کر دیا تھا اور جب بھی مجھے ضرورت پڑتی وہ میری مدد میں بھرپور دلچسپی لیتا۔ ایک دفعہ جب میں ماسکو روانہ ہونے والا تھا، میں نے نوٹ کیا کہ میری ایئر لائن ٹکٹ پر میرا نام غلط لکھا ہوا ہے اور کسی دوست نے یہ بھی اطلاع کی کہ ضیا حکومت نے شاید میرا نام ای سی ایل میں بھی ڈال دیا ہے۔ سیف کراچی میں مجھے ملنے آیا اور بتایا کہ مسئلہ حل کر لیا گیا ہے۔ مجھے ایئر لائن کے کاؤنٹر پر جلد از جلد پہنچنا تھا، ویٹنگ لاؤنج کے ایک کونے میں بیٹھنا تھا اور طیارے میں سوار ہونے والے پہلے جتھے میں جہاز پر چلے جانا تھا۔ سیف کو ایسے وقت میں بھی ڈرامے کا شوق تھا جب اُس کی زیادہ ضرورت نہ ہوتی۔

7 مارچ 1977 میں ایم بی نقوی (جسے میں 1970 ٹوبہ ٹیک سنگھ کانفرنس کے دنوں سے جانتا تھا) سیف خالد اور میں نے فیصلہ کیا کہ ہم اسلام آباد کے کچھ پولنگ اسٹیشن میں الیکشن کا جائزہ لیں گے۔ جہاں ووٹر ابھی آنا شروع ہوئے تھے۔ لیکن جب تک ہم روات تک پہنچے۔ ووٹروں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ ہم سوہاوہ اور بعد میں گوجر خان تک پہنچے تو میں سیف خالد اور ایم بی نقوی سے یہ وعدہ کرتے ہوئے اسلام آباد لوٹ آیا کہ وہاں میں شام میں چند پولنگ اسٹیشن دیکھوں گا۔ ہمارا خیال تھا کہ ووٹنگ بڑی حد تک شفاف ہوئی ہے اور پیپلز پارٹی الیکشن جیت رہی ہے۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ پیپلز پارٹی کے کچھ رہنما لاہور اور چند دوسری جگہوں پر Over Kill کرنے کا پلان بنا رہے ہیں اور وہ بھی فلیٹیز ہوٹل جیسی نمایاں جگہوں پر جو سب کی نگاہ میں تھی۔ سیف اور نقوی اپنی اپنی جگہ لائل پور اور لاہور لوٹ آئے۔

بھٹو کو پھانسی دینے سے کچھ دن قبل سیف نے مجھے ایک مشہور سیاسی شخصیت جس کی وہ بہت قدر کرتا تھا کی کایاپلٹ کے بارے میں بتایا۔ سیف کہنے لگا: ”میں نے اُس کی آنکھوں کی پتلیوں میں ضیا کو ملٹری یونیفارم میں دیکھا ہے“ ان چند الفاظ سے سیف نے ضیا اور اُس کے نئے چاہنے والے کو بری طرح بے نقاب کرتے ہوئے ڈھیر کر دیا۔ تعجب کی بات ہے کہ جب سیف کے جسم کا بایاں حصہ مفلوج ہو گیا اور وہ قوت گویائی سے محروم

ہوگیا تو وہ مجھ سے سیاست پر زیادہ بات کرنے لگا۔ سیف اپنی اکڑی ہوئی ٹانگ کو گھسیٹتے ہوئے لاٹھی کے سہارے اپنے دوسرے بیٹے نیاز (جسے پیار سے سب موبی کہتے تھے) کے ساتھ ویو پوائنٹ میں میرے کمرے میں آتا اور وہ اپنی تمام تر کوشش سے مجھ سے سیاست پر بات کرتا۔ لیکن سیف نے مجھے بالکل حیران کر دیا جب ایک دن وہ اپنی تمام تر قوت ارادی کو استعمال کرتے ہوئے ٹمپل روڈ میں دوسری منزل پر واقع میرے فلیٹ میں آگیا۔ انھی ملاقاتوں کے درمیان ایک دن سیف نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا کہ وہ 1972ء کے پارٹی کنونشن میں بزنجو کو تنقید کا نشانہ بنانے پر شرمندہ ہے۔ سیف کہنے لگا ''یہ واقعہ ہمیشہ میرے سینے پر ایک بوجھ رہا ہے اور بہت مشکل سے میں اس بوجھ کو سینے سے اتار پایا ہوں'' خود تنقیدی کی اس منفرد خصوصیت نے سیف کے لیے میرے دل میں اُس کی قدر اور منزلت مزید بڑھا دی۔ یہ وہ حقیقی سیف تھا جسے میں جانتا تھا اور اُس کی قدر کرتا تھا۔

آئی اے رحمان

پہلا باب

سیف خالد۔ ابتدائی زندگی اور تعلیم

مشرقی پنجاب کے جنوب میں جیند ریاست کے دارالخلافہ سنگرور کے قریب سوندے وال نامی گاؤں واقع ہے۔ اس گاؤں کی بنیاد سیف خالد کے پردادا سوندے خان نے 1870ء میں رکھی۔ راجہ جیند کی ملکیت والی اراضی ریاست میں راج گڑھ کے نام سے جانی جاتی تھی۔ سوندے خان ماہر تعمیرات تھے جنہوں نے سنگرور شہر کی منصوبہ بندی اور تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔ بالخصوص بنا سر باغ کے ڈیزائن میں انہوں نے یورپی باغات کی طرز تعمیر کو بنیاد بنایا۔ ان کی خدمات کے عوض راجہ گجپت سنگھ نے راج گڑھ کی زمین انہیں تحفے میں دی جو بعد میں سوندے خان کے نام سے منسوب ہو کر سوندے وال کہلائی۔

ریاست جیند، پٹیالہ اور نابھہ کی ریاستوں کی تاریخ 1763ء سے شروع ہوتی ہے جب سرہند صوبے میں احمد شاہ ابدالی کا مقرر کردہ گورنر سکھوں کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔ اور سرہند کے صوبے کو پھلکیاں ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ان ریاستوں کے راجاؤں کا سلسلہ جیسل میر راجستھان کے بانی جیسل سے جا ملتا ہے۔ نابھہ، پٹیالہ اور جیند کی ریاستوں کے حکمران راجہ پھول کی اولاد میں سے تھے۔ خاندانی روایات کے مطابق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سیف خالد کے پرکھوں کا تعلق راجستھان کے راجپوت بھاٹیوں سے تھا۔ جو اٹھارویں صدی میں راجستھان سے نقل مکانی کر کے گھگھر دریا کے کنارے آباد ہوئے۔ اس دریا کو ہندو دیو مالا میں سرسوتی دریا کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ صرف

برسات کے مہینوں میں بہتا ہے اور پنجاب سے گزرتا ہوا راجستھان میں ختم ہوتا ہے۔ غالب امکان ہے کہ راجستھان سے پنجاب کی جانب نقل مکانی اس دریا کے کنارے سفر کرتے ہوئے ہوئی۔ بعد میں یہی راجپوت بھائی ارائیں ذات سے پہچانے گئے۔

ایک اور روایت کے مطابق جب 1877ء میں ملکہ وکٹوریہ کو ہندوستان کی ملکہ قرار دیا گیا۔ تو ہندوستان میں شاندار تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔ تمام نوابی ریاستوں (Princely States) کے وفود ان تقریبات میں شریک ہوئے۔ ریاست جیند کی جانب سے بھیجے جانے والے سرکاری وفد میں سوندے خان بھی شامل تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب برطانوی راج بہت تیزی سے اپنی سلطنت کو وسیع کرنے میں مصروف عمل تھا۔ کہیں تو مقامی حکمران کو فوج کشی سے اپنے ساتھ ملایا گیا تو کچھ ریاستوں کے حکمران اپنی ملکیت اور حاکیت کو برقرار رکھنے کے لئے انگریزوں کے آلہ کار بنے۔ پھلکیاں ریاستوں کے لئے یہ ایک پر آشوب دور تھا۔ ایک جانب مہاراجہ رنجیت سنگھ پنجاب میں اپنا اقتدار مستحکم کر رہا تھا اور اس نے شمال مغربی سرحدی صوبے تک اپنا دائرہ کار اور حکومت پھیلائی تھی، تو دوسری جانب فرنگی سرکار ہندوستان میں برطانوی راج کو وسیع کرنے میں مصروف تھی۔ پھلکیاں ریاستوں کے حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ سے اچھے تعلقات رکھنے کے باوجود اس سے خائف بھی تھے اور اسے اپنے اقتدار کے لئے خطرہ تصور کرتے تھے۔ ان حالات میں پٹیالہ، نابھہ اور جیند کی ریاستوں نے برطانوی راج کو خوش آمدید کہنے میں عافیت جانی اور برطانوی راج کو ایک سالانہ مقررہ رقم کے عوض اپنا مقامی اقتدار بحال رکھا۔ ان نوابی ریاستوں کو برطانوی راج میں ایک خاص حیثیت حاصل تھی۔

نابھہ، جہاں سیف خالد پیدا ہوئے، سیاسی افراتفری کا شکار تھا اس قصبہ کو سری ہمیر سنگھ نے 1755ء میں آباد کیا تھا جو بعد ازاں ریاست کی راجدھانی کا درجہ اختیار کر گیا۔ جیند ریاست کی طرح نابھہ بھی سرہند کے افغانی ناظم زین خان کے خلاف اتحاد کا حصہ تھی۔ سری ہمیر سنگھ نے اس اتحاد میں بھرپور حصہ لیا۔ پرگنہ املوہ پر قبضہ کرنے کے بعد سری ہمیر سنگھ نے علاقے میں اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ 1774ء میں جیند کے راجہ

گجپت سنگھ نے نابھہ پر فوج کشی کی اور جنگی چال چلتے ہوئے سری ہمیر سنگھ کو قید اور قصبہ سنگرور پر قبضہ کر لیا۔ 1783ء میں سری ہمیر سنگھ نے وفات پائی اور ان کے کم سن اور نابالغ بیٹے جسونت سنگھ کو ریاست کے تخت پر بٹھایا گیا۔ اس کی سوتیلی ماں رانی دیسو اس کی سرپرست بنی جس نے بڑی دلیری سے راجہ جیند سے اپنی ریاست کو نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ راجہ گجپت نے ریاست کا جو علاقہ قبضے میں لے رکھا تھا اس کا بہت سا حصہ واپس چھیننے میں کامیاب بھی ہو گئی۔ یہ شمشیر زن رانی 1790ء میں انتقال کر گئی۔ کچھ عرصہ بعد نابھہ اور جیند کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں نابھہ اور پٹیالہ کی ریاستوں کے درمیان جھگڑے شروع ہو گئے۔ انگریزی دخل اندازی کے باعث 9 جولائی 1923ء کو نابھہ کے راجہ کو حقِ حکمرانی سے دستبردار ہو کر ریاست چھوڑنا پڑی۔ اس کا نابالغ بیٹا تخت پر بٹھایا گیا۔ ریاست کا انتظام چلانے کے لئے ایک کونسل آف ریجنسی قائم ہو گئی۔ 1928ء میں معزول راجہ سے خطابات اور اعزازات واپس لے لئے گئے اور اس کا وظیفہ کم کر دیا گیا۔ پنجاب کی ریاستوں میں مہاراجہ جیند، تیسرے اور ریاست نابھہ کے راجہ کا چوتھا درجہ تھا۔ یہ سب واقعات، سیف خالد کی پیدائش کے ارد گرد کے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس سیاسی ماحول میں پیدا ہوئے۔

سیف خالد 7 جولائی 1929ء کو نابھہ میں پیدا ہوئے۔ نابھہ نوآبادیاتی ہندوستان کی ایک اہم ریاست تھی۔ان کا نام سیف، جنگِ آزادی کے عظیم ہیرو اور رولٹ ایکٹ کے خلاف تحریک کے مرکزی قائد سیف الدین کچلو کے نام پر رکھا گیا جن کی اس وقت بھی پورے پنجاب میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ 1929ء کا سال بین الاقوامی، قومی اور مقامی طور پر بے حد اہمیت کا حامل تھا۔ یہ عالمی کساد بازاری کا سال تھا۔ عالمی سرمایہ دارانہ معاشی بحران 1933ء تک جاری رہا۔ 30 جنوری 1933ء کو جرمنی میں فاشسٹ آمریت کا آغاز ہوا۔ اس وقت سیف بمشکل ساڑھے تین سال کے تھے۔ پورا یورپ اور دنیا کے کئی دیگر ممالک اس معاشی بحران کا شکار بنے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد سے دنیا کو اب تک امن نصیب نہیں ہوا تھا۔ 1933ء میں ہٹلر کے اقتدار پر قبضے نے دوسری عالمی جنگ کے

خدشات بڑھا دیئے تھے، اسی عرصہ میں افغانستان میں ترقی پسند امان اللہ کی حکومت کا تختہ الٹ کر حبیب اللہ نامی ایک سازشی، جو بچہ سقہ کے نام سے مشہور ہوا، کی سامراج نواز اور رجعت پسند حکومت کے خلاف افغانستان نے آزادی حاصل کی۔

قومی سطح پر پورا ملک تحریکِ آزادی کی لپیٹ میں تھا۔ 26 جنوری 1929ء کو لاہور میں انڈین نیشنل کانگریس نے ہندوستان کے لئے کامل آزادی کی قرار داد منظور کی۔ لاہور کی گلیوں میں گھوڑے پر سوار پنڈت نہرو کی تصویر بہت مشہور ہوئی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ہی پنجاب جنگِ آزادی کا مرکز بن چکا تھا جہاں سے کئی انقلابی تحریکوں نے جنم لیا۔ ''پگڑی سنبھال جٹا'' تحریک، غدر پارٹی موومنٹ، ریشمی رومال تحریک، پنجاب پر سوویت انقلاب کے اثرات، جلیانوالہ باغ المیہ، ہجرت اور خلافت تحریکیں، ببراکالی موومنٹ اور بھگت سنگھ کی نوجوان 'بھارت سبھا۔ 1928ء میں بھگت سنگھ اور ساتھیوں کے ہاتھوں انگریز پولیس افسر سانڈرس کا قتل، 18 اپریل 1929ء کو بھگت سنگھ اور ساتھی بی کے دت نے لیجسلیٹو اسمبلی نیو دہلی کے ہال میں ایک بے ضرر بم اس طرح پھینکا کہ اس سے کسی کی ہلاکت نہ ہو۔ بم پھینکنے کے بعد انہوں نے گیلری کی نشستوں پر انڈین سوشلسٹ ری پبلیکن آرمی کی طرف سے ایک پوسٹر اچھالا، جس پر فرانسیسی انقلابی شہید ویلان کے الفاظ کہ ''بہرے کانوں کو سنانے کیلئے کافی اونچی آواز کی ضرورت پڑتی ہے'' درج تھے۔ دراصل اس سال انگریز حکومت پبلک سیفٹی بل، ٹریڈ ڈسپیوٹس بل اور پریس سیڈیشن ایکٹ ہندوستان پر جبراً مسلط کر رہی تھی اور مزدور رہنماؤں کو دھڑا دھڑ گرفتار کیا جا رہا تھا۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے کمیونسٹ رہنماؤں کے خلاف 1929ء میں میرٹھ سازش مقدمہ کا آغاز کیا گیا جو 1933ء تک چلتا رہا۔ اس پوسٹر میں پہلی بار انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کیا گیا تھا۔

اپنی آئندہ زندگی میں سیف خالد بھگت سنگھ کو ہمیشہ ایک انقلابی ہیرو قرار دیتے رہے۔ وہ ایک جمہوریت پسند انقلابی تھے اور بھگت سنگھ کی طرح پر امن ذرائع سے انقلاب کے متمنی تھے۔ یہ حوالہ اس لیے بھی اہم ہے کہ بھگت سنگھ کے سیاسی طریق کار کے

طور پر انہیں عام طور پر تشدد پسند سمجھا جاتا ہے۔

سیف خالد کا خاندان تعلیم یافتہ تھا اور ریاست جیند میں اہم انتظامی عہدوں پر فائز تھا۔ ان کے دادا مولا بخش ریاستی پولیس آفیسر تھے۔ سیف خالد کے والد چوہدری نیاز محمد کی شادی ریاست نابھہ کے معروف خاندان میں زینب النسا سے ہوئی۔ سیف خالد کے نانا چوہدری فتح محمد فارسی کے عالم تھے اور ریاست نابھہ کی جانب سے دوسری ریاستوں سے روابط کے ذمہ دار تھے۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں ریاستوں کے درمیان خط و کتابت فارسی زبان میں کی جاتی تھی اور سکولوں میں ہندی کے ساتھ ساتھ فارسی اور اردو کو اہم مقام حاصل تھا۔ سیف خالد کے ماموں چوہدری مسعود ریاست کے مالی امور کے وزیر تھے۔ نیاز محمد کے بڑے بھائی فیض محمد کی شادی بھی اسی خاندان میں زینب بی بی کی بہن سے ہوئی تھی۔

چوہدری نیاز محمد نے شادی کے بعد اپنے سسرال کی رضامندی سے اپنی تعلیم جاری رکھی اور گریجویشن کے لئے ایف سی کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ لاہور سے گریجویشن کے بعد انہوں نے ریاست نابھہ میں سرکاری ملازمت اختیار کی اور ناظم کے عہدے پر تعینات رہے۔ اس زمانے میں نابھہ تین نظامات پر مشتمل تھا۔ ملازمت کے سلسلے میں وہ ریاست کے مختلف شہروں میں تعینات رہے۔ سیف خالد بھی اپنے دیگر بھائی بہنوں سمیت ان شہروں میں رہے اور پنجاب کی دیہی اور شہری زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

سیف خالد اپنے آٹھ بہن بھائیوں میں پانچویں نمبر پر تھے۔ ان کی بہنوں میں اختری بیگم، انوری بیگم، بلقیس خانم، زبیدہ خانم اور اشرف جہاں شامل تھیں جبکہ بھائیوں میں بڑے بھائی محمد اقبال اور چھوٹے بھائی امتیاز خالد شامل تھے۔

سیف خالد نے ابتدائی تعلیم نابھہ ہی میں حاصل کی اور بعد میں سنگرور کالج میں داخلہ لے لیا۔ چوہدری نیاز محمد اس زمانے کے لحاظ سے لبرل اقدار رکھتے تھے اور لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کی تعلیم کے بھی قائل تھے۔

ان کی والدہ زینب بی بی جو پورے خاندان میں بی بی کے نام سے جانی جاتی

تھیں، قدامت پسند خیالات رکھتی تھیں اور مذہبی رسومات کی سخت پابند تھیں۔

ریاست میں مسلمان اقلیت میں تھے لیکن ریاستی عہدوں پر تعیناتی سمیت ان سے کوئی امتیازی سلوک نہیں برتا جاتا تھا۔ خاندان کے زیادہ تر افراد ریاستی عہدوں پر فائز تھے۔ سیف خالد کے تایا اور چچا دونوں پولیس میں تھے جبکہ والد ناظم تھے۔ لڑکے اور لڑکیوں کے سکول علیحدہ تھے اور مسلمان گھرانوں کی خواتین میں پردے کا رواج تھا۔ سیف خالد کے کاغذات میں ان کے ہندو اور سکھ دوستوں کے خطوط موجود ہیں جو سلیس اردو میں لکھے گئے ہیں۔

سیف خالد ابھی سکول ہی میں تھے کہ جدو جہد آزادی کی تحریک زور پکڑنے لگی۔ سیف اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کی بہن بلقیس کو لکھنے کا شوق تھا۔ سیف ان کی بہت حوصلہ افزائی کرتے اور ادبی رسالوں میں ان تحریروں کو چھپوانے میں ان کی مدد کرتے۔ بلقیس کا ادبی تخلص بلقیس جمال انہوں ہی نے رکھا۔ دونوں بہن بھائی سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ جلسے جلوسوں اور تقریروں میں شریک ہوتے۔ انہی حرکات کی وجہ سے ایک دفعہ سکول سے نکالے بھی گئے۔ تحریک آزادی کے دوران ہی ان کا رابطہ بائیں بازو کی تنظیموں سے ہوا۔ ایک روایت کے مطابق کالج کے ابتدائی سال میں وہ اکثر جیل چلے جاتے تھے جہاں اُن کے تایا جیل اسپرنٹینڈینٹ تھے۔ وہاں اُن کی ملاقات ایک سکھ انقلابی سے ہوئی جو بائیں بازو سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ طویل ملاقاتیں اُن کے انقلابی خیالات سے روشناس ہونے کا سبب بنیں۔ یہ تعلق وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گہرا ہوتا گیا۔

ریاست میں مذہبی رواداری عام تھی۔ پنجاب کے زیادہ تر تہوار تمام مذاہب کے لوگ ایک ساتھ مناتے۔ مذہبی تہواروں کے ساتھ ساتھ بیساکھی، بسنت اور دھیاں دا میلہ خوب جوش وخروش سے منایا جاتا۔ دھیاں دا میلہ خواتین میں خاص طور پر مقبول تھا جو برسات کے شروع میں دریا یا نہروں کے کنارے گھنی چھاؤں والے درختوں کے سائے میں منایا جاتا۔ وہ لڑکیاں جو بیاہ کے بعد دوسرے علاقوں میں جا بسی تھیں وہ اپنے آبائی

شہروں اور دیہات میں لوٹ آتیں اور گیت سنگیت و ناچ کی محفلیں منعقد ہوتیں۔

دوران ملازمت چوہدری نیاز محمد کا تنازعہ ملیر کوٹلے کی مسلمان ریاست کے راجاؤں سے ہو گیا۔ یہ لوگ کچھ ملکیتیں ناجائز طور پر اپنے نام کروانا چاہتے تھے۔ چوہدری نیاز محمد جو اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں بہت نیک نام تھے، یہ بات گوارہ نہ کر سکے اور انہوں نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ تقسیم سے پہلے ہی 1946ء میں مستعفی ہو کر لائل پور آ گئے اور یہاں کالونی ٹیکسٹائل ملز میں ملازمت کرنے لگے۔

خاندان کے دیگر افراد نابھہ اور سنگرور ہی میں رہے۔ تقسیم کے دوران نابھہ ریاست زیادہ قتل و غارت سے محفوظ رہی۔ چوہدری نیاز محمد کے بھائی جو پولیس آفیسر تھے اپنے ہندو اور سکھ دوستوں کی مدد سے پاکستان کی جانب ہجرت کر گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ایک سکھ دوست راجندر سنگھ نے جب انہیں نابھہ سے نکلنے میں مدد کی پیش کش کی تو وہ تذبذب میں تھے کہ کہیں ان کے خاندان کو گھیر کر قتل نہ کیا جائے۔ جس پر راجندر سنگھ نے اپنے سات سالہ بچے کو ان کے ساتھ بھیجنے میں آمادگی ظاہر کی۔ البتہ چوہدری نیاز محمد کے بڑے بھائی فیض محمد سوندے وال میں اپنی آبائی زمینیں چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے اور تقسیم کے فساد میں مارے گئے۔

تقسیم کے تقریباً 66 سال بعد خاندان کے کچھ لوگ جو اب امریکہ میں مقیم ہیں نے نابھہ اور سنگرور جا کر آباؤ اجداد کی تاریخ کو کھنگالنے کی کوشش کی۔ طاہر، طارق اور محمود نے سوندے وال کا گاؤں ڈھونڈ نکالا جو اب دوبارہ راج گڑھ کہلانے لگا تھا۔ لیکن سوندے وال کی تختیاں اب بھی وہاں موجود تھیں۔ نابھہ میں خاندان کے گھر اب بھی ویسے ہی تھے۔ چوہدری نیاز محمد کا گھر دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اپنے بڑے بزرگوں سے انہوں نے حلوائی، سبزی، گوشت والی جن دکانوں کا ذکر سنا تھا ویسے ہی موجود تھیں۔ ایک بزرگ مسلمان دکاندار جو پورے خاندان سے واقف تھا نے شکوہ بھی کیا کہ چوہدری خاندان کے علاوہ بیشتر مسلمان تقسیم کے دنوں میں وقتی ہجرت کے بعد وطن واپس آ گئے تھے۔

آزادی کے فوراً بعد حکومت پاکستان کے پاس سرکاری ملازمین کی کمی تھی۔ چوہدری

نیاز محمد کو ایک بار پھر سرکاری ملازمت کی دعوت دی گئی اور وہ ابتداء میں مال افسر (ریونیو آفیسر) اور بعد میں مجسٹریٹ درجہ اوّل مقرر ہوئے۔ انہیں ملازمت کی غرض سے جہلم، گجرات، جھنگ، منڈی بہاؤالدین کے اضلاع میں کام کرنے کا موقع ملا۔

سیف خالد، آگے چل کر جس نظریے سے وابستہ ہوئے اور جس نظریے پر انہوں نے اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا دیا، اسے عملی شکل اختیار کیئے، ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا، ان کی پیدائش سے صرف بارہ سال قبل 1917ء میں وی آئی لینن کی قیادت میں سوشلسٹ انقلاب برپا ہوا اور سوویت یونین وجود میں آیا۔ سوویت انقلاب کے بانی نے جلد ہی ہندوستان کے محنت کشوں اور ترقی پسند رہنماؤں سے اپنے روابط کا آغاز کر دیا۔ انقلاب کے صرف تین سال بعد ہندوستان سے کچھ انقلابی سوویت یونین پہنچے اور انہوں نے اکتوبر 1920ء میں تاشقند کے مقام پر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی داغ بیل ڈالی۔ 27-1922 کے دوران ان انقلابیوں پر پشاور میں کمیونسٹ سازش مقدمے چلائے گئے۔ یہ مقدمے ہجرت تحریک کے ان مجاہدین پر بنے جو سوویت یونین سے مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے واپس ہندوستان پہنچے اور انہیں گرفتار کر کے پشاور سیشن کورٹ میں ان کے خلاف سازش مقدمے چلائے گئے۔ پشاور سازش مقدموں میں فیروزالدین منصور، فضل الٰہی قربان، محمد شفیق، میر عبدالمجید، اکبر شاہ بدرشی اور بعض دوسرے انقلابی شامل تھے۔ قربان اور فیروزالدین منصور قیام پاکستان کے بعد کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے ممتاز رہنما کے طور پر نمایاں ہوئے۔ 1924ء میں کانپور کے مقام پر مختلف انقلابی گروپ اکٹھے ہوئے تاکہ کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ قیام کے حالات کا جائزہ لیا جا سکے لیکن ایم این رائے کا ایک پیغام پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ چنانچہ 1925 میں بارہ ممتاز انقلابیوں کے خلاف کانپور کمیونسٹ سازش مقدمہ چلایا گیا جس میں مظفر احمد، نلنی گپتا، ڈانگے، شوکت عثمانی اور مشہور کرکٹر فضل محمود کے والد غلام حسین کے نام شامل تھے۔ بعد ازاں معافی مانگنے پر غلام حسین کا نام مقدمے سے نکال دیا گیا۔ 1929ء سے جس سال سیف خالد پیدا ہوئے، ایک اور کمیونسٹ مقدمے میرٹھ سازش مقدمے کا آغاز ہوا۔ برطانوی

سامراجیوں نے طے کر لیا تھا کہ ہندوستان میں کمیونسٹ انقلابیوں کو نہیں ابھرنے دیا جائے گا۔ یہ سازش مقدمہ 1933ء تک چلتا رہا۔ 20 مارچ 1929 کو 31 ممتاز کمیونسٹ رہنماؤں کو گرفتار کر کے میرٹھ سازش مقدمہ قائم ہوا اس مقدمہ کا مقصد ظاہر ہے کمیونسٹوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کو روکنا تھا۔ انگریزی حکومت، قومی تحریکِ آزادی میں پھوٹ بھی ڈالنا چاہتی تھی۔ 1930 ء میں قصہ خوانی بازار فائرنگ کے دوران ہندو سپاہیوں نے مسلمان مظاہرین پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ یہ ہندوستانیوں کی طرف سے انگریزی سازشوں کا جواب تھا۔ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی شدید مظاہرے ہوئے۔ سیف خالد کی پیدائش کے اردگرد کے دن خاصے ہنگامہ خیز تھے جب بھگت سنگھ اور ان کے دو ساتھیوں کو پھانسی ہوئی تو سیف کی عمر اس وقت عمر صرف دو سال تھی۔ ہندوستان میں میرٹھ سازش مقدمہ چل رہا تھا اور لندن میں ہندوستانی قیادت کے ساتھ انگریزی حکمرانوں کے مذاکرات چل رہے تھے۔ یہ مذاکرات گول میز کانفرنس کے نام سے مشہور ہوئے ان مذاکرات میں مسلمانوں کی نمائندگی جناح اور اقبال نے کی۔ 1936ء میں انگریزی حکومت نے ہندوستان میں عام انتخابات کا اعلان کیا۔ ان انتخابات کے نتیجے میں کانگریس کو سات صوبوں میں کامیابی ملی اور انہوں نے ان صوبوں میں کانگریسی حکومتیں بنائیں۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کے دعوے کے ساتھ انتخابات میں حصہ لیا لیکن اسے شکست ہوئی۔ پنجاب سے اس کے صرف دو نمائندے برکت علی اور راجہ غضنفر علی خان کامیاب ہوئے۔ کانگریس کے علاوہ غیر فرقہ وارانہ مگر انگریز حکومت کی حامی جماعت یونینسٹ پارٹی نے پنجاب سے واضح برتری حاصل کی اور پنجاب میں اسی کی حکومت بنی۔ اس وقت سیف خالد نابھہ کے پرائمری سکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ستمبر 1939ء میں دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی جسے کمیونسٹوں اور قوم پرست ہندوستانیوں نے سامراجی قرار دیا۔ سوویت یونین نے خود کو اس جنگ سے الگ تھلگ رکھا، پرائمری سکول کے طالب علم سیف خالد کی عمر اس وقت صرف دس سال تھی۔ برطانیہ اور فرانس کو پسپا کرتے ہوئے جرمنی نے سوویت یونین پر بھی حملہ کر دیا اور دنیا کی پہلی

سوشلسٹ مملکت کا دفاع شروع ہو۔ اسوویت عوام نے جرمن نازیوں کا زبردست مقابلہ کیا۔ اب یہ جنگ قومی جنگ قرار دی جا چکی تھی۔ اس سوویت پالیسی کے ہندوستان پر بھی مثبت اثرات پڑے۔ سوویت تعاون کے جواب میں انگریزی حکومت نے ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی سے پابندی اٹھا لی۔ سجاد ظہیر اور کئی دوسرے کمیونسٹ رہنما جیلوں سے رہا ہو گئے۔ معروف شاعر فیض نے جو لاہور کے ہیلی کالج میں انگریزی ادبیات کے استاد تھے، مجید ملک کے کہنے پر فوج کے شعبہء اطلاعات عامہ میں شمولیت اختیار کر لی۔ بارہ تیرہ سال کے سیف خالد کا جھکاؤ ابھی سے بائیں بازو کی طرف ہو گیا تھا۔ بعض روایات کے مطابق وہ گرفتار بھی ہوئے۔ 1942ء سے 1945ء تک کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے رہنماؤں نے انگریزی حکومت کے ساتھ تعاون کی پالیسی اختیار کئے رکھی۔ انگریزی فوج کی ملازمت اختیار کرنے پر فیض پر حالیہ برسوں تک تنقید کی جاتی ہے۔ فیض نے اس کا ہمیشہ یہ جواب دیا کہ وہ سوویت یونین کے دفاع کی خاطر، جنگ میں جو اب قومی جنگ کہلاتی تھی، شریک ہوئے تھے اور ان کا شعبہ پبلیسٹی اور اطلاع عامہ کا تھا۔ 1945ء میں جنگ کا خاتمہ ہوا تو نوخیز سیف خالد نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہے تھے۔

1946ء میں جب ہڑتال اور بغاوتوں کا طوفان امنڈ پڑا، کمیونسٹ پارٹی کے ایک اہم رہنما ڈاکٹر گنگا دھر ادھیکاری نے 1946ء کے حوالے سے ایک چشم کشا دستاویز شائع کی۔ اسی سال عام انتخابات منعقد ہوئے۔ کمیونسٹ پارٹی نے پنجاب سمیت مختلف صوبوں میں انتخابات میں بھرپور حصہ لیا۔ اس نے صرف پنجاب میں چھبیس نشستوں پر کانگریس، مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کا مقابلہ کیا۔ ان میں اکثریت سکھ اور ہندو امیدواروں کی تھی۔ ایک خاتون کامریڈ رگھبیر کور اور دو مسلمان ساتھیوں مرزا ابراہیم اور فضل الٰہی قربان نے بھی انتخابات میں حصہ لیا، دیگر امیدواروں میں تیجا سنگھ سوتنتر، سوہن سنگھ جوش، ڈاکٹر بھاگ سنگھ، بابا رُوڑ سنگھ، بابا کرم سنگھ چیمہ، بابا سنتا سنگھ گنڈی ونڈ، سردار پرتھوی سنگھ، بابا بدھان سنگھ، اچھر سنگھ چھینا، ماسٹر ہری سنگھ، ساتھی دسوندھا سنگھ، ماسٹر کبن سنگھ، ساتھی ٹہل سنگھ، ساتھی رام سنگھ، ساتھی چنچل سنگھ چتا، گوردیال سنگھ راجوآنہ، چنن سنگھ لائلپوری، اجمیر

سنگھ بھارو، جگت رام دت، ساتھی محبت سنگھ، اور ٹھاکر وریام سنگھ شامل تھے۔ سوتنتر، جوش اور بعض دیگر ساتھیوں نے کامیابی کے بعد 1946 اور 1947ء میں پنجاب اسمبلی میں بھرپور حصہ لیا۔ جب سیف خالد کا خاندان 1946ء میں لائلپور منتقل ہوا تو وہاں مسلمان، ہندو اور سکھ امیدواروں میں کمیونسٹ پارٹی کے امیدوار جگجیت سنگھ لائلپوریا کی انتخابی مہم بھی زوروں پر چل رہی تھی، جن کا مسلم کامریڈوں سے قریبی رابطہ تھا۔ یہ سال جہازیوں کی بغاوت کا سال بھی تھا جس میں بعد ازاں فضائیہ کے کارکن بھی شامل ہو گئے۔ اس بغاوت کی قیادت کمیونسٹ پارٹی کر رہی تھی جس میں ہندو، مسلمان، سکھ اور مسیحی سبھی شامل تھے۔ سترہ سال کی عمر کے نوجوان سیف خالد کے لئے ان تحریکوں میں یقیناً رومانی دلچسپی رہی ہوگی لیکن بدقسمتی سے اس دور کی یادیں بیان کرنے کے لئے سیف خالد خود یا ان کا کوئی ہم عصر ساتھی ہمارے درمیان موجود نہیں ہے۔ لاہور میں عبداللہ ملک پارٹی کے محاذ پر خاصے فعال تھے جبکہ مظہر علی خان اور طاہرہ مظہر علی پارٹی سے بے حد قریب تھیں۔ پارٹی کے ایک اہم رہنما ڈاکٹر گنگا دھر ادھیکاری بھی مغربی پنجاب کی سیاسی صورت حال سے جڑے ہوئے تھے ان کا ایک کتابچہ ''1946ء جنگ آزادی کا ایک سال'' ان ایام پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ جب سیف خالد کے والد اور ان کا خاندان مشرقی پنجاب سے نقل مکانی کر کے مغربی پنجاب آچکا تھا تو کمیونسٹ پارٹی بے حد فعال تھی۔ ''جنگ آزادی کا ایک سال۔1946'' نامی کتابچے میں ڈاکٹر ادھیکاری نے ہندوستان میں عوام کی بڑھتی ہوئی بیداری، ایشیا کی بیداری، آزاد ہند فوج کے افسروں کی رہائی کی مہم، جہازیوں کی بغاوت، فوج اور عوام کے اتحاد، اجرتوں کو گھٹانے کی کوشش، کشمیر کی جدوجہد، ہندوستانی سرمایہ دار، برطانوی حکومت کی نئی چال، معاشی تجاویز، وزنی مشین، عدم تشدد کا راستہ، مسلم لیگ کا راستہ، پاکستان کا مطالبہ، فرقہ وارانہ فسادات، حکومتی مداخلت، فسادات پھیلنے کے اسباب، فسادات کا مقابلہ کرنے، جدوجہد کا نیا دور، کسانوں کے اتحاد، خوش خیالی کے خاتمے اور کمیونسٹوں کی ذمہ داری کے حوالے سے تفصیلی اظہار خیال کیا۔ انہوں نے بتایا کہ 1946ء میں مزدوروں کی ہڑتالوں میں 1942ء کے مقابلے میں دوگنا اضافہ ہو گیا تھا۔

اس سلسلے میں ریلوے ہڑتال خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اسی زمانے میں ہندوستانی اور برطانوی سرمایہ داروں کے درمیان تضاد پیدا ہوا۔ ہندوستانی سرمایہ داروں نے ہندستان کی فوری آزادی کے مطالبے کی حمایت کر دی۔ یہ مطالبہ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کر رہی تھیں۔ 1946ء میں آزاد ہند فوج کے افسروں کی رہائی اور جہازیوں کی ہڑتال کے فوراً بعد جی ایچ کیو نے ہندوستان میں جگہ جگہ فوجی اڈے بنانے کا خاکہ تیار کیا تاکہ صنعتی ہڑتالوں، حکومت کے خلاف گڑبڑ یا فرقہ وارانہ فسادات پر قابو پانے کے لئے ہر وقت متحرک فوجی دستیاب ہوں۔ نابھہ، جیند اور پٹیالہ سمیت تمام دیسی رجواڑوں کو زیادہ طاقتور بنایا گیا تاکہ بوقتِ ضرورت وہ برطانوی حکومت کے ہاتھ مضبوط کر سکیں۔

کانگریس نے ایک طرف آزاد ہند فوج کی رہائی کیلئے زبردست تحریک چلائی تو دوسری طرف جہازیوں کی ہڑتال کی حمایت میں ہونے والی عام ہڑتال کی سخت مذمت کی۔ دوسری جانب مسلم لیگ نے انتخابات اس نعرے کی بنیاد پر لڑے کہ وہ پاکستان سے کم کوئی چیز قبول نہیں کرے گی۔ اسے باور کرا دیا گیا کہ وہ ہندوؤں سے لڑ کر ہی پاکستان حاصل کر سکتی ہے۔ نوجوان سیف خالد کمیونسٹ پارٹی کے اس تجزیئے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ راقم الحروف نے جب ساٹھ کی دہائی کے اواخر میں، ان سے آزادی سے فوراً پہلے کے حالات کے حوالے سے اظہار خیال کیا تو انہوں نے کچھ اسی طرح کے تاثرات ظاہر کئے تھے۔ 70-1969ء کے دنوں میں وہ اس دور کے اپنے احساسات کو بچگانہ قرار دیتے تھے۔ شمیم اشرف ملک بھی جو ان سے قدرے سینیئر تھے، بھی اسی طرح کے احساسات کا اظہار کرتے تھے۔ راقم کو یاد ہے کہ 1970ء کے دوران جڑانوالہ میں سیف خالد صاحب سے اس کی ایک تفصیلی نشست ہوئی تھی جس میں راقم نے نوجوان پنجابی شاعر کے طور پر اپنا کلام بھی سنایا تھا۔ سیف خالد فرقہ وارانہ فسادات کے حوالے سے بھی 47-1946ء کے دوران، کمیونسٹ پارٹی کے تجزیئے سے کافی متاثر تھے۔ انہوں نے بڑے جوش سے بتایا تھا کہ ان فسادات کے پیچھے برطانوی حکومت کا ہاتھ تھا۔ مسلم لیگ پر ان کی تنقید پارٹی کے زیر اثر ہی تھی۔ میں 1970ء میں جڑانوالہ میں ان سے ان

کر حیران ہوا تھا کہ یہ صرف غنڈوں کے برپا کئے ہوئے فسادات نہیں تھے بلکہ اس کے پیچھے برطانوی حکومت کی حکمت عملی کارفرما تھی۔ کلکتہ، بمبئی، نواکھلی، بہار، میرٹھ، لاہور اور راولپنڈی کا کشت وخون محض غنڈہ گردی کا نتیجہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر ادھیکاری کے کتابچے سے ان ساری باتوں کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ معصوم انسانوں کے خون کے پیاسے یہ غنڈے جب سڑکوں پر نکلتے تو ان کے ہاتھوں میں کانگرس یا لیگ کے جھنڈے ہوتے اور وہ آزاد ہندوستان اور پاکستان کے نعرے لگا رہے ہوتے۔ ڈاکٹر ادھیکار ی کے بقول کمیونسٹ پارٹی نے ان فسادات کے سدِ باب کے لئے زبردست جدو جہد کی۔

پارٹی نے نعرہ بلند کیا کہ 16 اگست کو دفن کردو، 29 جولائی کے لئے راستہ ہموار کرو۔ 16 اگست ہندو مسلم فسادات کا دن تھا جبکہ 29 جولائی ہندو مسلم اتحاد کا دن تھا۔

اس سے قبل کمیونسٹ پارٹی نے کانگریس میں شامل مختلف عہدیداروں کو جن کا تعلق کمیونسٹ پارٹی سے تھا، مسلم لیگ میں شامل ہونے کی ہدایت کی۔ یہی نہیں اس نے پارٹی کے بعض ارکان (مثلاً دانیال لطیفی، عبداللہ ملک وغیرہ) کو بھی مسلم لیگ جوائن کرنے کی ہدایات دی تھیں،۔ 1945ء میں میاں افتخار الدین جو انڈین نیشنل کانگرس پنجاب کے صدر تھے مستعفی ہو کر مسلم لیگ کے ٹکٹ پر پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔

قیام پاکستان تک آتے آتے پارٹی نے سامراجیت کی تخلیق کردہ ہندو مسلم فرقہ واریت کو مزید ہوا دینے کی سازشوں کی انتھک مخالفت کی۔ آزادی کی تحریک میں پارٹی کے فعال کردار کے باعث اس کی مقبولیت اور قوت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ تقسیم سے فوراً پہلے کے مزدوروں، کسانوں اور محب وطن آزادی پسند قوتوں کی جدو جہد کے نتیجے میں برطانوی سامراج کو ہندوستان سے جانا پڑا۔ لیکن صورت حال اس قدر واضح بھی نہیں تھی سیف خالد ساٹھ اور ستر کی دہائی میں فیض کی مشہور نظم، ''یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر'' کا ذکر کرتے ہوئے اکثر یہ بات دہراتے تھے کہ 1947ء کی آزادی حقیقی آزادی ثابت نہیں ہوئی تھی۔ اور اسے ابتدائی برسوں میں ہی یرغمال بنا لیا گیا تھا۔ اٹھارہ سالہ سیف خالد بیک وقت پر جوش بھی تھے اور مایوس بھی جس کے نتیجے میں ان کی شاعری

وجود میں آئی لیکن کالج کے دنوں تک جاتے جاتے یہ جذبہ ماند پڑ گیا تھا اور سیاسی سر گرمیاں بڑھ گئی تھیں۔ البتہ ان کی جذباتیت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔

14 اور 15 اگست کی درمیانی شب کو آزادی کا اعلان ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ہندو سکھ۔مسلم فسادات، جو مارچ 1947 میں ہی پھوٹ پڑے تھے، میں شدت آگئی۔ دو نئی آزاد مملکتوں کی بنیادوں میں 10 لاکھ انسانوں کا خون ڈالا گیا۔ سیف خالد 1946ء سے لائل پور میں تھے۔ جب فسادات میں شدت آئی تو نوخیز سیف یہ سب کچھ سمجھنے سے قاصر تھے۔ انہوں نے انسانی لاشوں کے جلو میں آزادی کا جلوس دیکھا۔ زمین پر لاکھوں بے زمین مہاجرین اُگ آئے۔ ان کی آبادکاری سمیت نئی مملکت کو درجنوں مسائل درپیش تھے اس اثناء میں کمیونسٹ پارٹی بھی دم بخود تھی۔ فیض احمد فیض فوج کی نوکری پر لات مار کر واپس تدریس کے شعبے میں جانے کے لئے پر تول رہے تھے کہ میاں افتخار نے انہیں صحافت کے میدان میں کھینچ لیا۔ فروری 1947ء میں لاہور سے انگریزی روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' کا اجراء ہوا۔ یہ دراصل پروگریسو پیپرز لمیٹڈ (PPL) کا اجرا تھا جس نے ایک سال بعد، 1948ء میں اردو روزنامہ امروز جاری کیا۔ یہ اخبارات ابتداء ہی میں عوامی امنگوں کے ترجمان بن گئے۔ ہمیں یہ بتانے کے لئے شاید ہی کوئی دستیاب ہو کہ لائل پور میں مقیم سیف خالد ان اخبارات میں کتنی دلچسپی لیتے ہوں گے۔ جلد ہی انہوں نے بولنا شروع کر دیا ہوگا۔ 70-1969ء کے دوران انہوں نے راقم الحروف کو ایک سینئیر کامریڈ کے طور پر بتایا تھا کہ اخبار پڑھنا اور دھیمے انداز میں اپنا ردِعمل بیان کرنا انہیں شروع سے ہی پسند تھا۔ راقم الحروف کو یہ بھی یاد ہے۔ کہ 1967ء میں جب وہ کراچی میں لاہور کے لئے رخت سفر باندھ رہا تھا تو کمیونسٹ پارٹی کے ایک پر جوش رہنما نواز بٹ نے پنجاب میں جن لوگوں سے پارٹی کے حوالے سے رابطہ کرنے کی ہدایت کی تھی، ان میں پہلے نمبر پر شمیم اشرف ملک تھے۔ دوسرا نام انہوں نے سیف خالد کا لیا تھا۔ جو لائل پور اور لاہور دونوں مقامات سے متعلق تھے۔

اگر ہم پاکستان کی جمہوری تاریخ کا سرسری جائزہ لیں تو ہم دیکھیں گے کہ پاکستان

کے باضابطہ قیام سے چار روز قبل 10 اگست 1947ء کو کراچی میں دستور ساز اسمبلی کا افتتاحی اجلاس ہوا۔ جس کی صدارت ایک اقلیتی رکن جوگندر ناتھ منڈل نے کی۔ 11 اگست کو محمد علی جناح دستور ساز اسمبلی کے صدر منتخب ہوئے۔اسی روز انہوں نے اپنا تاریخی خطاب کیا جس کی گونج آج تک سنائی دے رہی ہے۔ انہوں نے کہا تھا:

''آپ آزاد ہیں: آپ پاکستان کی ریاست میں اپنے مندروں میں جانے کے لئے، اپنی مسجدوں میں یا کسی بھی دوسری عبادت گاہوں میں جانے کے لئے آزاد ہیں۔ آپ خواہ کسی بھی مذہب، نسل یا ذات سے وابستہ ہوں،اس کا کوئی تعلق اس بنیادی اصول سے نہیں ہے کہ ہم سب ایک ریاست کے شہری اور مساوی حیثیت رکھنے والے شہری ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں اپنا آدرش اپنے سامنے رکھنا چاہئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آپ دیکھیں گے کہ ہندو ہندو نہیں رہیں گے، مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے، مذہبی اعتبار سے نہیں کیوں کہ وہ فرد کے ذاتی ایمان کا معاملہ ہے، بلکہ سیاسی اعتبار سے ایک ریاست کے شہریوں کی حیثیت سے''۔

اس بات کے شواہد موجود نہیں ہیں کہ قائد کے خطاب پر سیف خالد نے کوئی ردِعمل ظاہر کیا تھا یا نہیں۔ وہ عمر کے حوالے سے ابھی خاصے کمسن تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعد کے برسوں میں 1960ء کی دہائی کے اواخر میں انہیں کئی بار اس تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے سنا گیا بلکہ وہ اس بات سے بھی آگاہ تھے کہ اپنی تقریر کے بعد جناح جب ایوان سے چلے گئے تو کیسے بعض ''خفیہ ہاتھ حرکت میں آگئے تھے اور کیسے اس تقریر کے بعض حصوں کی اشاعت کو رکوانے کی کوشش کی گئی تھی۔

سیف خالد جو کہ تقسیم کے وقت 18 سال کے تھے عملی سیاست میں حصہ لینے لگے تھے۔ 1948ء یا 1949ء کے لگ بھگ جب پورا خاندان گجرات میں مقیم تھا سیف کے ایک سیاسی دوست ان کے گھر پر ٹھہرے۔ پولیس اس دوست کا پیچھا کر رہی تھی اور انہوں نے سیف خالد کے گھر پر چھاپہ مارا۔ سیف خالد تو دوست کے ہمراہ روپوش ہو گئے لیکن ان کی والدہ اور بہنوں نے ڈر کے مارے ان کی کتابیں جلادیں۔ سیف بہت دیر تک

ناراض رہے۔ وہ سکول کے زمانے ہی سے کتابوں کے دلدادہ تھے اور ان کی لائبریری وقت کے ساتھ بڑی ہوتی گئی۔

چوہدری نیاز محمد 52ء میں دوبارہ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے اور اس مرتبہ ملتان میں واقعہ کالونی ٹیکسٹائل ملز میں ملازمت کرنے لگے۔ سیف کے بڑے بھائی اقبال نے بھی پڑھائی کے ختم ہونے پر اسی ملز میں ملازمت اختیار کر لی۔ 1953ء میں سیف خالد کے کچھ روپوش دوست جن میں لال خان، سی آر اسلم بھی شامل تھے نے اقبال کے گھر پر پناہ لی۔ پولیس کو خبر ہوئی تو انہوں نے گھر پر چھاپہ مارا۔ یہ دوست تو چھاپے سے پہلے ہی گھر چھوڑ چکے تھے لیکن اپنے پیچھے کچھ لٹریچر چھوڑ گئے تھے۔ سیف کے بھائی کے خلاف تفتیش ہوئی اور انہیں اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ کچھ عرصے بعد انہیں کراچی میں زیب تن ملز میں ملازمت ملی اور وہ کراچی آگئے۔

سیف خالد کے والد چوہدری نیاز محمد نے وکالت کا امتحان سیف کے ساتھ 1956ء میں لاہور لاء کالج سے پاس کیا۔ وہ بعد ازاں سول اینڈ ملٹری گزٹ میں پرنٹر اور پبلشر کے طور پر کام کرتے رہے۔ جہاں انہوں نے 1963ء میں اپنے انتقال تک خدمات سرانجام دیں۔

لاہور میں قیام کے ابتدائی دنوں میں خاندان کا قیام موہنی روڈ پر تھا لیکن اپنی سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لئے انہوں نے مال روڈ پر بھی ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ ان سے پہلے یہ کمرہ سبط حسن سمیت بہت سے دیگر کمیونسٹوں کی رہائش گاہ بھی رہا۔ تقریباً بیس سال بعد بھٹو دور میں نیپ اور پی پی پی کے درمیان محاذ آرائی کے دنوں میں نیپ پر واپڈا ہاؤس بم کیس بنایا گیا۔ جس میں الزام لگایا گیا کہ اس کاروائی کا منصوبہ اسی کمرے میں بنایا گیا تھا۔ اس مقدمے میں سیف خالد کو بدنام زمانہ شاہی قلعہ میں بھی قید رکھا گیا۔

تقسیم سے قبل ہی خاندانی رواج کے مطابق 18 سال کی عمر میں ان کا نکاح اپنے چچا کی بیٹی کے ساتھ طے پایا لیکن سیف خالد کی سیاست میں بڑھتی ہوئی مصروفیات کی وجہ سے یہ نکاح برقرار نہ رہ پایا۔

سیف خالد اس وقت صرف اٹھارہ برس کے تھے وہ اپنی افتادِ طبع کے حوالے سے نئے وطن کی تعمیر و ترقی کے لئے یقیناً پر جوش تھے۔ پنجاب میں قتل و غارت گری اپنے عروج پر تھی لگتا تھا کہ یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو گا۔ ان حالات میں پر جوش اور جذباتی سیف خالد کبھی کبھی مایوسی کا شکار بھی ہو جاتے تھے۔ وطن عزیز کے حالات روزِ اوّل سے ہی دگر گوں تھے۔ قائد کی تقریر کو رکوانے کی کوشش کے چند روز بعد ہی 22 اگست کو اس وقت کے صوبہ سرحد (اب خیبر پختونخوا) کی صوبائی حکومت کو گورنر جنرل کے حکم سے معزول کر دیا گیا تھا۔ 1946ء کے انتخابات کے نتیجے میں وہاں ڈاکٹر خان صاحب کی سر براہی میں کانگرسی حکومت قائم ہوئی تھی جسے اب بدلے ہوئے حالات میں برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن دوسری طرف مثبت اقدامات بھی سامنے آ رہے تھے۔ قائدؒ نے 11 اگست کی تقریر کے بعد پاکستان کی پہلی کابینہ تشکیل دی اور دو اقلیتی نمائندوں جوگندر ناتھ منڈل کو وزیر قانون اور سر ظفر اللہ خان کو وزیر خارجہ مقرر کیا۔ انہوں نے مہاجرین کی آباد کاری کی ایک وزارت بھی قائم کی۔ بیماری اور شدید نقاہت کے باوجود اس کی نگرانی اور رہنمائی بھی خود کرتے تھے۔

معاملات بہر حال بہت سیدھے اور سادہ نہیں تھے۔ وفاق کا تمام انتظام قائد نے اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ اسی دوران ریاست قلات کے معاملات کافی الجھ گئے۔ قلات نے 15 اگست کو اپنی آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ پاکستانی ریاست نے اس اعلان کو دل سے قبول نہ کیا۔ ٹال مٹول سے کام لیا اور 1948ء کے اوائل میں فوجی طاقت کے بل پر اسے الحاق پر مجبور کر دیا۔ قیام پاکستان کو صرف ایک ماہ ہوا تھا جب 16 ستمبر کو باچا خان کی خدائی خدمت گار تحریک پر پابندی لگا دی گئی۔ اس کے 10 روز بعد 26 ستمبر کو قائد اعظم نے ولیکا ٹیکسٹائل ملز کا افتتاح کیا تو کہا کہ کوئی صنعت اس وقت تک فروغ نہیں پا سکتی جب تک اس کے مزدور آسودہ اور مطمئن نہ ہوں۔ کچھ عرصہ بعد سندھ کے وزیر اعلیٰ محمد ایوب کھوڑو کو کرپشن کے الزامات لگا کر برطرف کر دیا گیا حالانکہ ان کا جرم یہ تھا کہ وہ سندھ کے دارالحکومت کراچی کو مرکز کے حوالے کرنے پر تیار نہیں

تھے۔ انہیں کہا گیا کہ کراچی چھوڑ دو اور اپنی پانچ ہزار سال پرانی چھکڑا تہذیب کی طرف لوٹ جاؤ، چنانچہ کراچی پر مرکز نے قبضہ کر لیا اور حیدر آباد سندھ کا دار الحکومت ٹھہرا۔ جہاں ایک سکول میں سندھ یونیورسٹی قائم کی گئی اور کراچی میں سندھی سکول بند کر دیئے گئے۔ بر طرفی کے بعد ایوب کھوڑو پر پروڈا قانون کے تحت بدعنوانی کا مقدمہ قائم کیا گیا۔ صوبائی حکومتوں کی توڑ پھوڑ اور دیسی ثقافتوں پر حملے کا سلسلہ مزید دراز ہوا جب صوبہ مشرقی پاکستان کے عوام نے اور اسمبلیوں میں ان کے نمائندوں نے مطالبہ کیا کہ اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی زبان کو بھی قومی زبان کا درجہ دیا جائے۔ مرکزی دستور ساز اسمبلی میں انہیں اپنی مادری زبان میں عوام کے مسائل بیان کرنے سے روک دیا گیا۔

نوجوان سیف خالد کے لئے یہ سب کچھ ایک صدمے سے کم نہ تھا۔ یہ ان کے خوابوں کا پاکستان تو نہ تھا۔ ستمبر 1947ء میں پنجاب میں بھی مہاجرین کی آبادکاری اور بحالی کے لئے ایک وزارت قائم کی گئی۔ میاں افتخار الدین کو مہاجرین کی وزارت دے کر کہا گیا کہ وہ ان کی بحالی اور آبادکاری کا کام کریں۔ مشرقی پنجاب کے مہاجرین مغربی پنجاب میں لاکھوں کی تعداد میں وارد ہو چکے تھے بٹوارے کے تاریخی جبر نے انہیں اپنی جڑوں سے اکھیڑ دیا تھا۔ سیف خالد خود مشرقی پنجاب سے آئے تھے لیکن وہ لٹ کر اور برباد ہو کر نہیں آئے تھے۔ شیخ محمد رشید جنہوں نے دیگر ساتھیوں کے ساتھ 1942ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی تھی اب دیکھ رہے تھے کہ ''عوامی جدو جہد سے بنائے ہوئے پاکستان میں جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور نوابزادوں نے اپنا اثر و رسوخ قائم رکھنے کی کوشش کی''۔ شیخ محمد رشید نے دلبرداشتہ ہو کر مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کر لی اور پنجاب کی کسان کمیٹی میں شامل ہو کر جدو جہد کرنے لگے۔ میاں افتخار الدین وزیر مہاجرین بن کر ان کا بھلا کرنے سے قاصر تھے انہوں نے اپنی وزارت کے عملے کے اوقات کار صبح 9 بجے سے رات 9 بجے تک بڑھا دیے تاکہ لٹے پٹے مہاجرین کی مشکلات کم کر سکیں لیکن انقلابی زرعی اصلاحات کے بغیر یہ ممکن نہ تھا جب انہوں نے سوشلسٹ بنیادوں پر زرعی زمینیں قومی ملکیت میں لینے اور مہاجرین میں تقسیم کرنے کی بات کی تو ان کی شدید

مخالفت ہوئی۔ ان کے اقدامات کو غیر اسلامی کہہ کر رد کر دیا گیا۔ اس کشمکش کو پاکستان ٹائمز میں شائع شدہ ان بیانات اور فیض کے اداریوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

نوجوان سیف خالد نے دلچسپی اور حیرت سے دو نئی سیاسی جماعتوں کے قیام کا مشاہدہ بھی کیا۔ مئی 1948ء میں آل پاکستان پیپلز پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس پارٹی کے قیام کے پیچھے خان عبدالغفار خان، جی ایم سید، شیخ عبدالمجید سندھی، عبدالصمد کان اچکزئی اور منشی احمد دین شامل تھے۔ آل پاکستان پیپلز پارٹی کے بنیادی مقاصد میں:

(1) لسانی بنیادوں پر صوبائی خود مختاری
(2) پاکستان کی سوشلسٹ جمہوریاؤں پر مبنی ایک یونین کے طور پر سلامتی اور استحکام اور
(3) پڑوسی ریاستوں بالخصوص ہندوستانی یونین کے ساتھ ثقافتی تعلقات جیسی شقیں شامل تھیں۔

اس سے قبل دستور ساز اسمبلی میں انڈین نیشنل کانگرس کے اراکین نے پاکستان کو اپنا وطن قرار دیتے ہوئے اپنی پہچان انڈین نیشنل کانگریس سے بدل کر پاکستان نیشنل کانگریس کر لی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کو تو چند ماہ میں کچل دیا اور اس کے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا تاہم پاکستان نیشنل کانگریس اسمبلی میں حزب اختلاف کی پہلی جماعت ثابت ہوئی اور 1958ء کے مارشل لاء تک پوری استقامت سے جدو جہد کرتی رہی۔ اسمبلی میں میاں افتخار الدین کی بھی ایک توانا آواز تھی۔ یوں مسلم لیگ کو آزادی سے کھل کھیلنے کا موقع نہ مل سکا۔ میاں افتخار الدین وزارت سے استعفیٰ کے بعد پنجاب مسلم لیگ کے صدر چلے آرہے تھے لیکن وہ مرکزی اور صوبائی لیگی حکومتوں پر مسلسل تنقید کرتے رہے چنانچہ انہیں پانچ سال کے لئے مسلم لیگ سے نکال دیا گیا۔ انہوں نے سردار شوکت حیات کے ساتھ مل کر آزاد پاکستان پارٹی قائم کر لی۔

لیکن جس نظریاتی جماعت نے بھرپور طریقے سے سیف خالد کو اپنی طرف کھینچا وہ

کمیونسٹ پارٹی تھی جس کے جراثیم وہ مشرقی پنجاب سے ساتھ لائے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی اپنے کئی عوامی محاذوں پر کام شروع کر چکی تھی۔ آزادی کے بعد کمیونسٹ پارٹی کی دوسری کانگریس 28 فروری۔ 6 مارچ 1948ء کو کلکتہ میں منعقد ہوئی جس نے آزادی کو جھوٹی آزادی قرار دیا۔ کانگریس نے سامراج اور جاگیرداری کو عملاً فراموش کرتے ہوئے، بورژوازی کے اقتدار کے خاتمے اور عوامی جمہوری انقلاب کی تکمیل کو فوری مقصد قرار دیا۔ تلنگانہ کسان تحریک پورے ملک میں پھیلانے کی لائن اپنائی گئی۔

8 مارچ کو مشرقی اور مغربی پاکستان سے آنے والے مندوبین کا الگ اجلاس منعقد ہوا۔ یہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی پہلی کانگریس تھی جس نے پارٹی کے لئے سیاسی تھیسس اور دستور تیار کیا۔ سیاسی تھیسس کم و بیش سی پی آئی والا ہی تھا۔ سجاد ظہیر کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے پہلے سیکرٹری جنرل مقرر ہوئے۔

پارٹی کی بنیادی دستاویز میں 47ء کو جھوٹی آزادی قرار دیا گیا تھا۔ سیاسی تھیسس نے ماؤنٹ بیٹن پلان کو ہندوستانی عوام کی ابھرتی ہوئی قوتوں پر حملہ قرار دیا اور کہا کہ ''برطانیہ کا ڈومینین ختم نہیں ہوا بلکہ اس کی شکلیں تبدیل ہوئی ہیں۔ بورژوازی ابھی تک اقتدار سے باہر اور مخالف تھا اور اب اسے ریاستی اقتدار میں حصہ دے دیا گیا تاکہ قومی تحریک آزادی کو ختم کیا جا سکے۔'' سرمایہ دار کے دوہرے کردار کو مسترد کر دیا گیا اور اسے ردِ انقلاب کی بنیادی قوت قرار دیا گیا اور اس طرح سامراج اور جاگیرداری کی بجائے سرمایہ دار کو بنیادی دشمن قرار دیا گیا۔ اس لائن کے نتیجے میں جو حکمت عملی ترتیب دی گئی اس کا بنیادی مقصد بورژوازی کے اقتدار کا تختہ الٹنا تھا جو سامراج، بورژوازی جاگیر دار اتحاد کی رہنما قوت تھی۔ پرولتاریہ کو غریب کسانوں، زرعی مزدوروں کے اتحاد سے عوامی جمہوری انقلاب برپا کرنا ہے تاکہ بورژوازی کو تنہا کر کے بذریعہ قوت کچل دیا جائے''۔ 1948ء کے اس پارٹی تھیسس میں انقلاب کے دونوں مرحلوں کو ملا دیا گیا اور عوامی جمہوری، جمہوری انقلاب کے دونوں مرحلوں کو مدغم کرتے ہوئے فوری مقصد پرولتاری آمریت کا قیام قرار دیا گیا۔ حملہ آور طریق کار کے مطابق انقلاب کو روسی طریقے سے

مشینی طور پر ملادیا گیا۔ اور کہا گیا کہ ہڑتالیں، زرعی تحریکیں، عام ہڑتالیں اور سیاسی ہڑتالیں اس طرح منظم کی جائیں جو جدو جہد کی اعلیٰ شکل میں وسیع تر عوامی ابھار میں تبدیل ہو جائیں۔'' اس طرح سامراج دشمن جمہوری انقلاب کومکمل کرنے کے مرحلے کو چھوڑ کر براہ راست عوامی جمہوری انقلاب یعنی پرولتاری آمریت کی لائن دی گئی۔ تمام پارٹی تنظیموں کو بورژوازی پر ہلہ بول دینے کی کال دی گئی اس کے علاوہ مسلح جدو جہد شروع کرنے کی کال بھی دی گئی۔ یہ دستاویز بنیادی طور پر دسمبر 1947ء کی سی پی آئی مرکزی کمیٹی کی قرار داد کی ابتدائی شکل تھی۔

کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان نے جن حالات میں کام شروع کیا وہ انتہائی کٹھن اور دشوار گزار تھے۔ مذہبی جنون اور تعصب سے فضا زہر آلود تھی۔ برصغیر میں بڑے پیمانے پر فسادات کی وجہ سے قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا اور یہ آگ ابھی تک ٹھنڈی نہ ہوئی تھی۔ برطانوی سامراج نے جب ہندوستان چھوڑا تو پاکستان میں انہوں نے اقتدار سرمایہ داروں اور بڑے جاگیرداروں کی پارٹی مسلم لیگ کو منتقل کیا۔ اس وقت مسلم لیگ پاکستان کی بانی جماعت ہونے کی وجہ سے پاکستان کی سب سے بااثر اور مضبوط پارٹی تھی۔ اس کا اثر نہ صرف جاگیرداروں اور بڑے سرمایہ داروں میں تھا بلکہ قومی سرمایہ داروں کے درمیانے اور نچلے حصوں، دانشوروں اور حتیٰ کہ مزدوروں اور کسانوں کے بعض حصوں میں بھی تھا۔حزب اختلاف کی جماعتوں کا کوئی وجود نہ تھا۔

''یہاں کی کمیونسٹ تحریک اور مزدوروں اور کسانوں کی طبقاتی تنظیموں کی قیادت اور فعال اور باشعور کارکنوں کا ایک بہت بڑا حصہ ہجرت کر کے ہندوستان جانے پر مجبور ہو گیا، خاص طور پر اس وقت کے مغربی حصے (یعنی موجودہ پاکستان) کی تحریکوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ تقسیم سے قبل پنجاب، سندھ اور سرحد کی کسان تحریک خاصی مضبوط اور مؤثر تھی لیکن ہجرت کی وجہ سے بے شمار رہنما اور انقلابی کارکن جو سکھ اور ہندو تھے ہجرت کر گئے۔ یہی صورت حال کمیونسٹ پارٹی کی بھی تھی۔ بے شمار کامریڈ ہندوستان چلے گئے اور تحریک تجربہ کار اور باشعور کارکنوں، رہنماؤں سے محروم ہو گئی۔ صورت حال اس حد تک

سنگین تھی کہ پاکستان کے مغربی حصے میں تقسیم کے نتیجے میں سی پی آئی (متحدہ) پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے کارکن تو دور کی بات ہے شاید ہی کوئی ایسا ساتھی بچا ہو جو صوبائی کمیٹی کا رکن ہو تقسیم نے موجودہ پاکستان کو اس کے بہترین عنصر سے محروم کر دیا تھا۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس تفصیلی پس منظر میں سیف خالد کہاں کھڑے تھے اور کیا سوچ رہے تھے جبکہ بعض ایسے شواہد موجود ہیں کہ سیف 1948ء میں پارٹی کے بعض عوامی محاذوں (انجمن ترقی پسند مصنفین، پنجاب کسان کمیٹی، طلباء محاذ اور ٹریڈ یونین کے محاذ پر سرگرم عمل تھے۔ میاں انور علی جو پنجاب سی آئی ڈی کے ڈی آئی جی تھے نے 1952ء کی اپنی خفیہ رپورٹ میں بتایا ہے کہ سیف خالد ان تمام محاذوں پر کام کر رہے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کو انہوں نے بے حد فعال بنا لیا تھا اور کسان کمیٹی میں وہ کافی سر گرم نظر آنے لگے تھے۔

یہاں اسے قدرے تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ میاں انور علی کے مطابق 1949ء میں پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا۔ فیڈریشن نے فعال قوت کا مظاہرہ کیا۔ متعدد کارخانوں اور تجارتی اداروں میں ٹریڈ یونینیں قائم ہوئیں۔ فیڈریشن نے پیرس، پراگ، ماسکو اور پیکنگ (موجودہ بیجنگ) میں قائم لیبر فیڈریشنوں سے روابط استوار کئے۔ انہی شہروں سے فیڈریشن کو اپنے مندوبین بھیجنے کے لئے دعوت نامے وصول ہوئے اور انہی ملکوں میں فیڈریشن کو اپنی پبلیسٹی کے عمل کو آگے بڑھانے کا موقع ملا۔ زیادہ توجہ ریلوے مزدوروں میں کام پر دی گئی۔ جس کا پاکستان میں حلقہء اثر انتہائی وسیع تھا۔ پارٹی کو اس سمت میں قابل قدر کامیابی نصیب ہوئی جس کے پیچھے مرزا ابراہیم کی محنت اور لگن تھی، معروف شاعر اور صحافی فیض احمد فیض کے علاوہ ایک زمانے میں بی بی سی سے ہندوستانی پروگرام کرنے والے ایک سرگرم اور تعلیم یافتہ نوجوان چوہدری محمد افضل کا بھی اہم کردار تھا۔

اپریل 1950ء میں فیڈریشن نے لاہور میں ایک زبردست کانفرنس منعقد کی جس میں نوجوان سیف خالد بھی پیش پیش تھے۔ کانفرنس میں ورلڈ فیڈریشن کے آسٹریلوی رہنما

مسٹر تھارنٹن نے نمائندگی کی۔ میاں انور علی کے مطابق کانفرنس میں شرکت سے کچھ عرصہ قبل اس نے ماسکو کا دورہ کیا تھا پاکستان مں اس کا قیام فیض کے گھر میں تھا۔ وہ میاں افتخار الدین سے بھی ملا۔ کانفرنس میں سیکڑوں مندوبین نے شرکت کی جن میں نمایاں ترین مندوبین میں میاں افتخار الدین، بیگم افتخار، بیگم زاہد عمر، فیروز الدین منصور، سی آر اسلم، اسلم ریڈیو، طاہرہ مظہر علی، حمید ہاشمی، عبدالروف ملک، محمد علی، غلام نبی بھلر، سندھی خان، لائلپور سے سیف خالد، محمد علی بمب اور لاہور سے فتح محمد، ریاض جاوید، احمد ندیم قاسمی، حمید اختر، احمد راہی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، شمیم اشرف ملک، عارف عبد المتین، رضا کاظم، قربان طاہر، قمر اجنالوی، غیور الاسلام، حسن طاہر، صوفی عبدالغفار، تاراچند اچھوت، حسن اعرافی، فیض احمد فیض، مرزا محمد ابراہیم، شریف متین، حشمت علی وفا، اور متعدد دوسرے شامل تھے۔ پاکستان کے جن شہروں سے مندوبین شریک ہوئے ان میں گوجرانوالہ، شکر گڑھ، لائلپور، جہلم، لاہور، راولپنڈی، کراچی، سیالکوٹ، بنوں، میانوالی، ملتان، مردان، گجر گڑھی اور گجرات، اوکاڑہ اور لاڑکانہ قابل ذکر ہیں۔ کانفرنس میں ٹریڈ یونین فیڈریشن کے عہدیدار بھی منتخب ہوئے۔ جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

صدر : مرزا محمد ابراہیم

سینئر نائب صدر : فیض احمد فیض

جونیئر نائب صدور : کامریڈ سندھی خان، ڈاکٹر باغ علی، کامریڈ عبد السلام (اوکاڑہ)، سوبھو گیان چندانی اور علی حیدر شاہ۔

جنرل سیکرٹری : کامریڈ محمد اشرف

سینئر اسسٹنٹ سیکرٹری : کامریڈ علی امام (معروف مصور)

خزانچی : کامریڈ غلام محمد

25 ارکان پر مشتمل ایگزیکٹو کمیٹی اور چھ ارکان پر مشتمل فریکشن کمیٹی بھی منتخب ہوئی۔ ملک کی 36 ٹریڈ یونینوں نے انتخابی عمل میں حصہ لیا۔ لائلپور میں سیف خالد نے مزدور سرگرمیوں میں شرکت جاری رکھی۔

پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے قیام کی کہانی بیان کرنے میں کئی الجھنیں در پیش ہیں۔ سب سے بڑی مشکل مزدور تحریک کے متعلق آرکائیوز کی عدم دستیابی ہے۔ اکا دُکا کتابچوں کے علاوہ کسی مزدور رہنما نے کوئی قابل ذکر تاریخی مواد نہیں چھوڑا۔ فیڈریشن یا اس سے ملحقہ یونینز کی سرگرمیوں کے ریکارڈز موجود نہیں ہیں۔ بقول سیف خالد اس کی ایک وجہ تو مسلسل گرفتاریاں اور چھاپے تھے جن کے نتیجے میں بہت سا قیمتی ریکارڈ تلف ہو گیا لیکن دوسری اہم وجہ اس ریکارڈ کو باقاعدہ طور پر محفوظ کرنے کے شعور کی یہ کمی خود سیف خالد میں بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ورثے میں سیکڑوں کتابیں تو چھوڑیں لیکن جس جدو جہد میں وہ زندگی بھر شامل رہے، اس جدو جہد کے آرکائیو چھوڑ کر نہیں گئے۔ اگر وہ کاغذات چھوڑ کر جاتے تو آج ان کی سوانح عمری لکھنے میں کام آجاتے۔ وزارت محنت اور دوسرے سرکاری اداروں کے ریکارڈ بھی یا تو موجود نہیں ہیں اور اگر موجود ہیں بھی تو ان تک رسائی نہ ہونے کے برابر ہے۔ پاکستان کی کمیونسٹ تحریک کے ابتدائی دنوں 51-1947 کے حوالے سے سی آئی ڈی کی ایک تفصیلی دستاویز کے علاوہ خفیہ اداروں کا مواد بھی ناپید ہے۔ مزدور تحریک کی تاریخ لکھنے کے حوالے سے سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ اب ہندوستان یا پاکستان میں تحریک کے ہاتھوں میں کوئی ایک شخصیت بھی حیات نہیں ہے۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور بکھری یادوں کو جوڑ کر جو مبہم سی تصویر بنتی ہے۔ اس کے مطابق جنوری 1948ء میں پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا، جس میں مجلس عاملہ کے 16 اراکین میں مرزا محمد ابراہیم، فیض احمد فیض، فضل الٰہی قربان، (انہیں مئی یا جون 1948ء میں پارٹی سے نکال دیا گیا تھا) ڈاکٹر مالک، سردار شوکت علی، سراج الحق گلچین، ممتاز، اٹک آئل کمپنی کے مصطفی دین، اوکاڑہ کے کامریڈ عبد السلام، ٹیکسٹائل ملز یونین لائلپور کے ہول ٹائمر طفیل، سیالکوٹ کے نواب دین عرف نواب علی، سندھی خان، خورشید عالم، ڈاکٹر باغ علی، ریلوے ورکرز ٹریڈ یونین، گڑھی شاہو لاہور کے غلام محمد اور نذیر سیکرٹری پریس ورکرز یونین لاہور شامل تھے۔

ابتداء میں جن دس یونینز نے فیڈریشن کے ساتھ الحاق کیا، ان میں لوئر گریڈ پوسٹ

مین اینڈ ٹیلی گراف یونین پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ (خیبر پختونخوا) پریس ورکرز یونین لاہور، تانگہ ڈرائیور یونین لاہور، نارتھ ویسٹرن ریلوے ورکرز یونین، ایم ای ایس یونین، اوکاڑہ ٹیکسٹائل ملز یونین، لائلپور ٹیکسٹائل یونین، تانگہ ڈرائیور یونین سیالکوٹ، اٹک آئل مورگاہ یونین، اٹک اور ایم ای ایس راولپنڈی شامل تھیں۔

سیف خالد اکثر بتایا کرتے تھے کہ:

''پاکستان میں پہلے یومِ مئی کا انعقاد ترقی پسند ادیبوں اور مزدوروں کے اتحاد کا نتیجہ تھا جس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی لاہور شاخ نے پہل قدمی کی۔ یہ زبردست جوش خروش کے دن تھے۔ کولکتہ کانگریس کے فیصلے سامنے آچکے تھے، جن کے مطابق پاکستان کی جداگانہ کمیونسٹ پارٹی نے اپنے کام کا آغاز کردیا تھا۔ سجاد ظہیر کو پارٹی کا سیکرٹری جنرل مقرر کیا گیا۔ انہوں نے پاکستان آکر ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ انھیں پاکستان میں جلد ہی روپوش ہونا پڑا۔ ہندوستان میں بی ٹی رندیوے، پی سی جوشی کی جگہ نئے سیکرٹری جنرل مقرر ہوچکے تھے۔ ان کی جارحانہ حکمت عملی پارٹی کو کمیونسٹ انتہا پسندی کی طرف لے گئی جس کے نتیجے میں دونوں ملکوں میں پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پاکستان میں پوری پارٹی قیادت انڈر گراونڈ تھی۔ بہت سے کسانوں، مزدوروں، ترقی پسند ادیبوں اور سیاسی محاذ پر پارٹی کارکنوں کی گرفتاریاں ہونے لگیں۔ اس ماحول میں انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور نے مزدوروں کے ساتھ مل کر یوم مئی منانے کا فیصلہ کیا۔ اسی حوالے سے فیض کا کہنا تھا:

''انہی دنوں وائی ایم سی اے ہال میں یوم مئی کے سلسلے میں جلسہ ہوا۔ ہال کے اندر اور باہر سرخ پھریرے لہرارہے تھے۔ ہتھوڑے اور درانتی والے جھنڈے بھی تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ سرخ انقلاب وائی ایم سی اے ہال کو فتح کرکے گڑھی شاہو اور دھرم پورہ کی طرف بڑھ گیا ہے۔ ہم اس جلسے کے صدر تھے۔ اس زمانے میں پاکستان میں پولیس اور انتظامیہ کے آفیسر انگریز ہی تھے۔ چنانچہ انجمن کو امن برقرار رکھنے کی شرط پر جلسے کی اجازت مل گئی تھی۔ دائیں بازو کے اخبارات نے کھل کر مخالفت کی تھی اور لاہور کے ایک اخبار نے اس جلسہ پر الزامات کی بوچھاڑ کردی تھی۔ جلسے میں ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں

کے علاوہ ٹریڈ یونین والے بھی کثیر تعداد میں شریک تھے۔ ان دنوں مرزا ابراہیم جیل میں تھے لہٰذا درحقیقت ہم ہی ٹریڈ یونین کی صدارت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔''

سیف خالد مجھے بتایا کرتے تھے کہ فروری 1949ء میں حکومت پاکستان نے سرکاری سطح پر پہلی پاکستان لیبر کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سہ فریقی کانفرنس میں حکومت، مالکان اور مزدور نمائندوں نے شرکت کی۔ مزدوروں کے خلاف اپنے تمام مظالم کے باوجود حکومت مجبور تھی کہ پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے، اسے کانفرنس میں شرکت کی دعوت دے۔ یہ فیض کی انتھک محنت کا نتیجہ تھا کہ حکومت مزدوروں کی حقیقی نمائندہ تنظیم کو نظرانداز نہ کر سکی۔ جنوری 1949ء میں کمیونسٹ پارٹی کے رہنما سجاد ظہیر نے کراچی کے ڈسٹرکٹ کمیٹی آرگنائزر کو، جو غالباً حسن ناصر تھے، اس کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا:

''یہ بات آپ کی اطلاع کے لیے ہے کہ اگلے مہینے (فروری میں) کراچی میں حکومت مزدوروں اور سرمایہ داروں کی ایک کانفرنس منعقد کر رہی ہے۔ حکومت نے ویسٹ پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ ہم نے فیض احمد فیض، (نائب و ایکٹنگ صدر پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن)، کامریڈ غفور (ریلوے یونین) اور عبدالسلام (اوکاڑہ ٹیکسٹائل لیبر یونین) کو کانفرنس میں شرکت کے لیے منتخب کیا ہے۔ ان کے علاوہ کامریڈ افضل بھی مشاورت کی غرض سے، ان کے ساتھ کراچی جائیں گے۔ غالباً کانفرنس ایک بیکار شو ہوگا لیکن ہمیں اس میں اپنے ساتھیوں کی رہائی کا سوال اٹھانا چاہیے۔ یہ اچھی بات ہے کہ حکومت نے فیڈریشن کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔ آپ ان دوستوں سے ملیں اور ان کی ہر ممکن مدد کریں۔ آپ کو ان سے کراچی میں ٹریڈ یونین تحریک کی صورت حال کے بارے میں بات کرنی چاہیے۔ ہماری اپنی پوزیشن اور پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کی تنظیم کاری کے

بارے میں۔''

خط میں یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ آنے والے تینوں ساتھیوں کے قیام و طعام کا بندوبست کراچی کے ساتھی کریں۔ انہیں پارٹی کے دفتر، کمیون یا کہیں اور ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ اس بات کی تفصیل نہیں ملتی کہ کانفرنس کے دوران یہ ساتھی کہاں ٹھہرے تھے۔

1949ء کی ایک اہم سرگرمی پنجاب مزدور کمیٹی کے جلسے کی صدارت تھی جس میں سیف خالد نے لائلپور سے آکر شرکت کی تھی۔ اسے سجاد ظہیر نے پارٹی کی ایک achievement قرار دیا۔ اس اجلاس میں نارتھ ویسٹرن ریلوے کی یونین، اوکاڑہ ٹیکسٹائل یونین، لائل پور ٹیکسٹائل یونین، اٹک آئل کمپنی یونین اور بعض دوسری یونینوں کے نمائندے، مندوبین کے طور پر شریک ہوئے۔ اجلاس نے پارٹی پر پابندیوں اور سختیوں کے باوجود مزدور تحریک کو بہت بڑھاوا دیا۔ حتیٰ کہ اسی عرصہ میں موچی گیٹ لاہور میں مزدوروں کا ایک کھلا جلسہ ہوا جس میں تین ہزار سے زائد مزدوروں نے شرکت کی۔ سجاد ظہیر کے لفظوں میں

> ''تقسیم ہند کے بعد پہلی بار محنت کش طبقوں کی آبادی سے باہر سرخ پرچم لہرایا گیا۔ جلسے سے صرف مزدور رہنماؤں نے خطاب کیا۔ پانچ انتہائی جوشیلی سیاسی تقریریں کی گئیں۔ 'چین' ایک اہم موضوع تھا اور ساتھی مسلسل اس کا حوالہ دے رہے تھے۔
>
> ''یہاں بھی ہمیں چین بننا ہے''
>
> ''پاکستان کے حکمرانوں کا بھی وہی حشر ہوگا جو چیانگ کائی شیک کا ہوا۔''

اسی سال 16-17 اپریل کو پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے مندوبین کا اجلاس منعقد ہوا جس میں نارتھ ویسٹرن ریلوے یونین، اوکاڑہ ٹیکسٹائل، اٹک آئل، ایم ای ایس منٹ، جنڈابٹن فیکٹری اور دیگر یونینوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ صدارت فیض صاحب کی تھی۔ فیڈریشن کے عہدیداروں کا انتخاب ہوا۔ مرزا ابراہیم دوبارہ فیڈریشن کے صدر اور محمد افضل جنرل سیکرٹری منتخب کیے گئے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کمیونسٹ پارٹی کا ادبی محاذ تھی۔ محنت کشوں کے محاذ میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ سیف خالد انجمن کی لائلپور شاخ کی ادبی سرگرمیوں میں بھی فعال تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انجمن کا بھی بٹوارہ ہوا۔ سیف انجمن کی مجلس عاملہ اور فریکشن کمیٹی کے بھی ممبر تھے۔ لائلپور میں ادبی محاذ پر سیف خالد کے ساتھ سعید احمد ہاشمی، قمر لدھیانوی، امین ارمان، انور ریاض، علی محمد اور شیر محمد بھی پیش پیش تھے۔ یہ تمام حضرات 1949ء کی پہلی کل پاکستان کانفرنس منعقدہ لاہور میں شریک تھے۔ کانفرنس میں انجمن کا جو منشور منظور ہوا وہ اسی انتہا پسندی کا حامل تھا جس کی روایت کمیونسٹ پارٹی ڈال چکی تھی۔ منٹو کے بائیکاٹ کا انتہا پسندانہ فیصلہ بھی ہوا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اپنی افتادِ طبع کے سبب سیف بھی اس کے حامی تھے۔ احمد ندیم قاسمی انجمن کے سیکرٹری جنرل مقرر ہوئے۔

سیف خالد، مزدور سرگرمیوں اور ادبی محاذ کے ساتھ ساتھ پنجاب کسان کمیٹی کی سر گرمیوں میں بھی شامل رہے تھے۔ کسان کمیٹی آزادی سے بھی قبل کمیونسٹ پارٹی کے کسان محاذ کے طور پر وجود میں آچکی تھی اور کافی سرگرم و فعال تھی۔ آزادی کے فوراً بعد ہندو اور سکھ کسان رہنماؤں کے چلے جانے کے بعد بھی اس کی سرگرمیاں جاری رہی تھیں۔ لائلپور میں بھی کسان کمیٹی کا کام زور و شور سے جاری رہا تھا۔ چنانچہ جب پنجاب کی سطح پر 4 اپریل 1949ء کو لاہور میں کسان کانفرنس منعقد ہوئی تو سیف خالد لائلپور سے کانفرنس میں شرکت کے لئے لاہور آئے۔ اس وقت وہ انقلابی امنگوں سے بھر پور بیس سال کے نوجوان تھے۔ کانفرنس میں سو کے لگ بھگ کسان مندوبین شریک ہوئے۔ کانفرنس میں فیض نے پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن اور احمد ندیم قاسمی نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے نمائندے کے طور پر شرکت کی۔ کسانوں کی حالت بہتر کرنے کے لئے تند و تیز مطالبات پیش کئے گئے۔ بدلے ہوئے حالات میں ایک نئے پروگرام اور منشور کی ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لئے دادا فیروز الدین منصور، میر قلم خان اور مظہر علی خان پر مشتمل ایک منشور کمیٹی قائم کی گئی۔ کانفرنس کے اختتام پر عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ لائلپور کے

عبدالعزیز قاصر صدر اور لائلپور ہی کے محمد شریف جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ نائب صدور کے عہدوں پر لاہور سے مظہر علی خان، گوجرانوالہ سے چوہدری اللہ بخش اور میانوالی سے غلام محمد ہاشمی کو منتخب کیا گیا۔ پنجاب کے متعدد اضلاع میں ضلعی کسان کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ ضلع لائلپور سے دس ارکان کی کمیٹی میں مولوی غلام رسول، شاہدی خان، سردار فتح محمد، عبدالستار، محمد طفیل، جڑانوالہ کے چک نمبر ا۔گ۔ب، جڑانوالہ ہی کے سردار محمد ڈسپنسر، ڈاکٹر جلال الدین، ایس جبار حسین اور ڈاکٹر عبداللہ آزاد، شامل تھے۔ سیف خالد، لائلپور شہر کی چار رکنی کمیٹی کا حصہ تھے، دیگر تین ارکان میں محمد طفیل، سلطان احمد میواتی اور عبدالستار کے نام قابل ذکر ہیں۔

پارٹی کے دیگر عوامی محاذوں میں پاکستان سوویت کلچرل ایسوی ایشن، امن کمیٹی، سول لبرٹیز، شامل تھے۔ طلباء کا محاذ ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن (ڈی ایس ایف) بے حد فعال تھا اور اس میں سیف خالد 53-1951ء کے دوران سرگرم رہے۔ 1951ء میں انہوں نے گورنمنٹ کالج لائلپور میں داخلہ لیا جہاں وہ ڈی ایس ایف کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ کمیونسٹ پارٹی کے دیگر محاذوں کی طرح ڈی ایس ایف بھی 49-1948ء سے فعال تھی۔ میاں اکرم نے سیف خالد کی کالج کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے راقم الحروف کو بتایا کہ ان کے بڑے بھائی میاں اسلم (وامق سلیم) سیف خالد کے کلاس فیلو تھے اور وہیں 1951ء میں ان سے پہلی ملاقات بھی ہوئی تھی۔ ان دنوں ڈی ایس ایف کا پورے پاکستان میں طوطی بولتا تھا۔ جلد ہی سیف اس کے مقامی رہنما بن گئے۔ میاں اکرم کی یاداشتوں کے مطابق سیف کا طلبا سرگرمیوں کے علاوہ شعر و ادب سے بھی کافی شغف تھا۔ وہ افسانے لکھنے لگے تھے۔ اس دوران ان کے بعض افسانے کالج میگزین ''بیکن'' میں شائع بھی ہوئے۔ میاں اکرم کے لفظوں میں

> ''میرے بڑے بھائی، جو وامق سلیم کے قلمی نام سے شعر کہتے تھے، ان کی منظومات بھی ''بیکن'' میں شائع ہوتی تھیں، ان سے میری ملاقات بڑے بھائی کے توسط سے ہوئی اور میں بھی ڈی ایس ایف میں

سرگرم عمل ہو گیا۔ انہی دنوں وہ اپنے گھر میں سٹڈی سرکل کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ کارل مارکس کی تعلیمات کے حوالے سے وہ لاہور سے سی آر اسلم، سردار شوکت علی، چوہدری اصغر خادم اور حسن عابدی وغیرہ کو لیکچرز کے لئے بلواتے تھے جن میں مارکسی تعلیمات، جدلی مادیت، تاریخی مادیت اور سوویت کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ کے بارے میں بتایا جاتا۔ بعد میں سوال جواب کی صورت میں مارکسی فلسفے کی مزید تشریح کی جاتی۔ ان لیکچرز کے دوران ابتدائی کورس کے طور پر شیر جنگ کی کتاب ''کارل مارکس کی تعلیمات'' تاریخی مادیت، جدلی مادیت اور تھیوری آف نالج جیسی کتابوں سے استفادہ کی جاتا۔''

وہ مزید بتاتے ہیں کہ سوویت یونین سے شائع ہونے والا ہفت روزہ ''نیو ٹائمز'' اور چین سے نکلنے والا ہفتہ وار جریدہ ''پیکنگ ریویو'' سیف خالد اپنی گرہ سے خرید کر سٹڈی سرکل میں شامل طلبا کو مفت فراہم کرتے۔ اس بات کی تصدیق پیپلز پبلشنگ ہاؤس کے عبدالروف نے یہ کہہ کر کی کہ سیف خالد جب بھی لاہور آتے، روسی کتابوں سے لدے پھندے لائلپور واپس جاتے۔ اہم بات یہ ہے کہ چونکہ انہیں خود مطالعے کا شوق تھا اس لئے ان کی خواہش ہوتی کہ دوسرے بھی یہ تمام کتابیں اور جرائد پڑھ کر اپنے شعور کی پیاس بجھائیں۔

میاں اکرم کے لفظوں میں:

''سیف خالد اجلاس میں شریک طلباء کی خوب خاطر مدارت کرتے۔ شام کو وہ جھنگ بازار میں کمیونسٹ پارٹی کے دفتر کا رخ کرتے۔ میں بھی اکثر ان کے ساتھ ہوتا۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ٹائپ رائٹر ہوتا۔ وہاں مختلف کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور اپنے مسائل اور مشکلات لے کر پہنچے ہوتے۔ محنت کش اپنے مسائل بیان کرتے جنہیں سیف خالد ٹائپ کر کے متعلقہ محکموں اور ملز انتظامیہ کو بھیجتے۔ اس کے

ساتھ ساتھ وہ اخبارات کو خبریں وغیرہ بھی ارسال کرتے۔''

میاں اکرم کے بقول وہ مختلف ملز کی گیٹ میٹنگز میں بھی شریک ہوتے۔ وہاں موجود کئی دوسرے رہنما عبد الستار انصاری، کامریڈ طفیل اور میاں محمود احمد بھی تقاریر کرتے۔ ان جلسوں میں مزدوروں کے مسائل بیان کئے جاتے۔ تقاریر میں ٹریڈ یونین کی اہمیت بیان کی جاتی۔ ملز انتظامیہ سیف خالد کی ان سرگرمیوں کو کیسے برداشت کرسکتی تھی۔ چنانچہ کئی بار ان جلسوں کو تتر بتر کرنے کے لئے وہ اپنے غنڈوں سے مار کٹائی کرواتی۔

اپنی گفتگو میں میاں اکرم نے کالج کی ادبی سرگرمیوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان دنوں کالج میں نامور ادیب اور شاعر درس و تدریس سے منسلک تھے۔ ان میں پروفیسر منظور حسین شور، راجہ عبدالقادر کیانی، پروفیسر رضی واسطی کے نام ملک بھر میں جانے پہچانے تھے۔ ان کی موجودگی میں ''بزم ادب'' کے اجلاس باقاعدگی سے منعقد ہوتے۔ سال میں ایک بار ملک گیر مشاعرے کا اہتمام بھی کیا جاتا۔ تقریری مقابلوں میں پنجاب بھر سے کالجوں کے طلبا شریک ہوتے۔ مشاعروں میں لاہور سے ترقی پسند شاعروں، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، عارف عبدالمتین، قتیل شفائی، احمد راہی اور حسن عابدی وغیرہ کو مدعو کیا جاتا۔ مقامی شعراء میں احمد ریاض، حزیں لدھیانوی، تنویر جیلانی، رفعت ہاشمی اور واثق سلیم اپنا کلام سناتے۔ ''حقیقت تو یہ ہے کہ ان ساری سرگرمیوں اور کامیابیوں کے پیچھے بائیس سالہ سیف خالد کی محنت کارفرما تھی۔''

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ سیف خالد نے لائلپور میں ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کو بھی خوب منظم کیا۔ اس کے باقاعدہ اجلاس کارونیشن لائبریری میں منعقد ہوتے۔ لاہور سے نامور ادیبوں اور شاعروں کو بلایا جاتا جب 1954ء میں کمیونسٹ پارٹی اور اس کے تمام عوامی محاذوں پر پابندی لگ گئی جس میں انجمن ترقی پسند مصنفین بھی شامل تھی تو بھی سیف خالد نے ان ثقافتی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ انہوں نے لائلپور کلچرل ایسوسی ایشن کے نام سے ایک نئی تنظیم بنا لی۔ اس کے صدر نامور قانون دان میر عبدالقیوم اور سیکرٹری میاں اکرم تھے۔ یہ نئی تنظیم وہی کام کر رہی تھی جو انجمن ترقی پسند مصنفین سر

انجام دیتی تھی۔

میاں اکرم نے گورنمنٹ کالج لائلپور میں سیف خالد کی ڈی ایس ایف کے حوالے سے سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ سیف خالد نے 8 جنوری 1953ء کے خونی واقعات کے فوراً بعد لائلپور میں تنظیم کو بھرپور انداز میں منظم کیا۔ 8 جنوری کے واقعات کے بعد ڈی ایس ایف کے مرکزی رہنماؤں ڈاکٹر محمد سرور، رحمان ہاشمی اور ڈاکٹر ایوب مرزا وغیرہ نے کل پاکستان سطح پر کراچی میں طلباء کنونشن کا اہتمام کیا جس میں لائلپور، جھنگ اور سرگودھا سے ساٹھ کے قریب طلبا نے شرکت کی۔ کٹرک ہال کراچی میں جب طلباء کنونشن جاری تھا تو کراچی کی انتظامیہ کے بھیجے گئے غنڈوں نے اجلاس پر دھاوا بول دیا۔ متعدد طلباء زخمی ہوئے جن میں میاں اکرم بھی شامل تھے۔ حملے کے باوجود اجلاس جاری رہا۔ کنونشن کے اختتام پر کل پاکستان طلباء تنظیم آل پاکستان سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (APSO) کا قیام عمل میں آیا۔ اپسو کی مجلس عاملہ میں سیف خالد اور میاں اکرم بھی شامل تھے۔ نئی تنظیم نے انگریزی زبان میں ''سٹوڈنٹس ہیرالڈ'' کے نام ایک بلیٹن بھی شروع کیا جس میں اپسو اور دیگر طلباء سرگرمیوں کا تفصیل سے ذکر ہوتا تھا۔ کنونشن پر حملے کے بعد زخمی طلبا نے قریبی طبی مراکز اور مختلف کلینکس میں ابتدائی طبی امداد حاصل کی۔ جب بعض طلباء نے ڈاکٹروں سے فیس کا پوچھا تو ڈاکٹر کہنے لگے

''آپ لوگ ہمارے مہمان ہیں ہم آپ سے فیس کیسے لے سکتے ہیں؟''

دیکھا جائے تو لائلپور میں اپنی تعلیمی سرگرمیوں تک، جو 1953ء میں اختتام پذیر ہوئیں، سیف خالد، کمیونسٹ پارٹی کے مختلف محاذوں۔ مزدور، کسان، طلباء اور ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے سرگرم عمل رہے۔ کمیونسٹ سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ لائلپور میں ویسے بھی ثقافتی ہلچل بپا رہتی تھی۔ لائلپور کاٹن ملز کی انتظامیہ مزدوروں اور ملازمین میں ہر سال بونس تقسیم کرتی۔ اس موقعہ پر ملز میں ایک ثقافتی میلہ لگتا جس میں خواتین کے لئے مینا بازار، بچوں کے لئے، بھول بھلیاں، ڈراموں اور فلم شوز کے علاوہ تین روزہ مشاعرے کا بھی اہتمام کیا جاتا۔ ملز کے مالک لالہ مُرلی دھر شاد، خود بھی اچھے شاعر تھے، پاک و ہند

کے درجنوں شعراء کو مدعو کرتے۔ مشاعرہ تین روز تک جاری رہتا۔ پہلا روز عام مزدوروں کے لئے مخصوص ہوتا۔ دوسرے روز دعوت ناموں کے ذریعے لوگوں کو مدعو کیا جاتا۔ تیسرے روز لالہ مُرلی خصوصی نشست کا اہتمام کرتے۔ اس روز مشاعرے میں شرکت کے لئے خصوصی دعوت نامہ لازمی تھا۔ ان دنوں حبیب جالب لائلپور میں مقیم تھے وہ بھی مدعو کئے جاتے۔ ایک بار سیف خالد اور میاں اکرم بھی مشاعرے میں شرکت کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے پاس تیسرے روز کا دعوت نامہ نہیں تھا۔ جب وہ بغیر کارڈ کے ہال میں داخل ہونے لگے تو انتظامیہ کے اہل کاروں نے انہیں اندر جانے سے روک دیا۔ اس وقت حبیب جالب بھی ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ سیف خالد یہ کہتے ہوئے کہ ہم تو حبیب جالب کے ساتھ ہیں، ہال میں داخل ہو گئے۔

اپنی یادوں کا سلسلہ دراز کرتے ہوئے میاں اکرم بتاتے ہیں کہ گورنمنٹ کالج لائلپور سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد پنجاب یونیورسٹی لا کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ ان کے والد، جو پہلے ہی لاہور آچکے تھے بھی وکالت پڑھنے کے لئے کالج میں داخل ہو گئے چنانچہ باپ بیٹے نے ایک ساتھ وکالت پاس کی۔ سیف خالد کے دیگر ہم جماعتوں میں میجر اسحاق محمد، ظفراللہ پوشنی۔ ندرت الطاف، رانا سخاوت علی اور گوجرانوالہ کے معروف شاعر ارشد میر بھی شامل تھے۔

سیف جوانی کے ان ایام میں نہایت جذباتی واقع ہوئے تھے۔ تقسیم کے چند سال بعد وہ ہندوستان گئے تو اپنے بھائی اقبال کو دِلّی سے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"تمہیں میرے خط کا انتظار ہو گا۔ تمہیں یہ امید بھی ہو گی کہ میں نے یہاں بہت سیر کی ہو گی۔ شاید یہ سمجھتے ہو گے کہ میں نے اپنے لئے اور تمہارے لئے کپڑے خرید لیئے ہوں گے۔ یہ سب باتیں صحیح بھی ہیں اور غلط بھی۔ میں نے سیر بھی کی ہے اور نہیں بھی کی۔ یہ دن اداس ترین دن تھے۔ یہ راتیں جاگتی راتیں تھیں۔ اور میں ایک بار پھر وہی سیف تھا جو دس سال پہلے نابھہ میں تھا۔ اس وقت تم مجھے گالیاں دیتے تھے۔ اس وقت سب مجھے برا کہتے تھے تم سمجھتے تھے کہ میں کسی کی خاطر سب کچھ کر رہا ہوں لیکن اس وقت بھی

اور اس وقت بھی میں کسی کی خاطر ایسا نہیں کرتا ہوں۔ میں نہیں جانتا میں اتنا فضول آدمی کیوں ہوں۔

ایک بہت لمبی کہانی لکھ سکتا ہوں لیکن میں خط میں نہیں لکھ سکتا۔ میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں اور میں سخت ترین اعصابی کھنچاؤ کا شکار ہوں۔

گزشتہ راتیں چاندنی راتیں تھیں اور وہ میری سب سے بڑی کمزوری ہیں۔ میں ان راتوں کو صرف کل رات ہی بستر پر گزار سکا ہوں۔ میرا کوئی گھر نہ تھا۔ سر شام سے ہی میں بے گھر ہو جاتا تھا۔

اب میں مظہر کے گھر آ گیا ہوں۔ تین چار دنوں میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ پھر برنالہ سریندر کے پاس ٹھہروں گا۔ تم مجھ سے کچھ سننا چاہتے ہو گے لیکن نہ تو خطوں میں وہ باتیں لکھی جا سکتی ہیں اور نہ ہی میں انہیں تمہیں لکھ کر ان کا حسن کھونا چاہتا ہوں۔ تم غیر جذباتی آدمی ہو۔ تمہیں کسی چیز کے جذباتی پہلو کا خیال نہیں آتا لیکن میں ضرورت سے زیادہ جذباتی ہوں۔ اور یہی میری زندگی ہے۔

میں نے تاج کو دیکھا۔ وہ واقعی خواب ہے اس کے حسن کی تعریف میں صحیح معنوں میں کر ہی نہیں سکتا۔ دنیا میں اس سے زیادہ حسن کسی فرد یا شے میں نہیں ہے۔ رات کے بارہ بجے تک میں چاند کو دیکھتا رہا۔ چاندنی اپنے جوبن پر تھی اور میں ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔ مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ ایسے وقت میں میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اقبال تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ کتنا حسین ہے۔ جو سب سے پہلا خیال اسے دیکھ کر میرے دل میں پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ اگر کہیں سے کوئی ایٹم بم اس پر آن گرے تو کیا ہو؟ میں جس درد سے گزر رہا ہوں اس کے بعد مجھ جیسے کی کوئی آرزو نہیں رہتی۔ میں اس سے زیادہ جینا نہیں چاہتا۔ پھر بھی شاید میں خودکشی نہ کر سکوں۔ تم ڈر نہ جانا۔

ایک بات کہوں اگر میں واپسی پر کوئی چیز بھی خرید کر نہ لاؤں تو تم ناامید تو نہیں ہو گے۔ سچ سچ لکھنا۔ جس رفتار سے میں جا رہا ہوں اس سے تو امید نہیں کہ اپنے لئے تو خیر کوئی بات نہیں تمہارے اور بھابی کے لئے بھی کچھ نہ لا سکوں گا۔

بھابی نے بہت سی امیدیں باندھی ہیں وہ یقیناً محسوس کرے گی لیکن مجبوری۔ میں اس جہاز کی مانند ہوں جو تباہی کی طرف جاتے ہوئے بھی اپنا رخ نہ بدل سکے۔

مجھے روپے کی ضرورت نہیں لیکن پھر بھی میں کچھ نہیں لاؤں گا۔ بھابی کو کسی نہ کسی طرح بہانہ لگا ہی لیں گے۔ اگر میں لانا چاہوں تو بھی نہیں لاسکتا۔

اگر تم چاہو تو یہ خط سب کو دکھا سکتے ہو۔ میں اپنی کمزوریوں سے نہیں ڈرتا لیکن کسی کمینے آدمی کو نہیں دکھانا جو اسے سمجھ نہ سکے۔

میں نہیں کہہ سکتا کتنے دن یہاں ٹھہروں گا اور پاکستان کب روانہ ہوں گا میرے اپنے بس میں کچھ نہیں ہے۔

میں ان دنوں کے متعلق پریشان نہیں جو میں گزار رہا ہوں۔ میرا زندگی کا ایک خاص فلسفہ ہے جسے میں سب سے چھپا کر رکھتا ہوں لیکن خود اپنے اندر میں اس فلسفے سے پوری طرح متاثر ہو کر بہت سی ایسی باتیں کرتا ہوں جو دوسروں کو عجیب دکھائی دیتا ہوں۔

خط لکھنا چاہو تو اس پتے پر لکھنا:

معرفت سریندر سنگھ

پراسیکیوٹنگ سب انسپکٹر

برنالہ (پیپسو)

اس خط کو ختم کرتا ہوں۔ اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اسے میری اپنی الجھن سمجھ کر فراموش کر دینا۔

محمود کا کیا حال ہے جمیل ہمیشہ ہمیشہ پچھتائے گا۔

اس نے اپنا بہترین موقع کھو دیا۔ مجھے بھی اس کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ جب میں پریشان ہوتا ہوں تو اس کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔

جمیل کو چاہیے کہ وہ محمد حسین کو ساتھ لے کر پٹواری سے مل لے۔ پٹواری نے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔

خط کا جواب ضرور دینا۔

فقط

تمہارا

سیف

اس خط کے بعد وہ کب اور کیسے پاکستان واپس آئے، اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ کمیونسٹوں کے لئے یہ بہت سنگین دن تھے۔ کمیونسٹوں پر بہت سختیاں کی جا رہی تھیں۔ پنڈی سازش مقدمہ آگے بڑھ رہا تھا اور بیشتر کارکن زیر زمین کام کرنے پر مجبور تھے۔

دوسرا باب

عملی سیاسی زندگی 1950-58ء

جب 1951-53ء کے دوان سیف خالد لائلپور میں زیر تعلیم تھے تو نوجوانی کے دنوں سے ہی وہ عملی طور پر سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ پہلے باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ طلباء سیاست کے ساتھ ساتھ مزدور، کسان اور ادبی محاذ پر بھی سرگرم عمل تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کے ان عوامی محاذوں کی سرگرمیوں کے دوران ہی وہ عملی سیاست کی طرف بڑھے۔ 1950ء کے اواخر میں میاں افتخار الدین نے مسلم لیگ سے مستعفی ہو کر آزاد پاکستان پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ یہ پاکستان کی پہلی ترقی پسند سیاسی جماعت تھی جس نے سماجی تبدیلی کے لئے جمہوری جدو جہد کا آغاز کیا۔ سیف خالد پہلے پہل طلبہ سیاست کی طرف مائل ہوئے۔ 1949-50ء کے دوران جب وہ محض بیس سال کے نوجوان تھے وہ مزدوروں کسانوں اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاسوں میں شریک ہونے لگے۔ انہوں نے لاہور میں پاکستان سوویت کلچر ایسوسی ایشن کی شاخ جس کے سیکرٹری عوامی دارلاشاعت کے عبدالروف ملک تھے کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ پاکستان سوویت کلچرل ایسوسی ایشن کا مرکزی دفتر کراچی میں تھا اور اس کے کرتا دھرتا غیور الاسلام تھے، جلد ہی وہ کراچی چھوڑ کر لاہور آ گئے اور پاکستان ٹائمز سے وابستہ ہو گئے۔ پارٹی کی ہدایت پر انہوں نے پاکستان سوویت کلچر ایسوسی ایشن کی لاہور شاخ قائم کی اور اس کے کنوینر بن گئے۔ اس کے بانی اراکین میں بیگم خدیجہ زاہد عمر، طاہرہ مظہر

علی، بیگم الماس، رفعت حیات، رضا کاظم، شمیم اشرف ملک اور ریلوے ٹریڈ یونین کے لال خان شامل تھے۔ ڈپٹی آئی جی، سی آئی ڈی پنجاب میاں انور علی کے بیان کے مطابق اکتوبر 1950ء میں رضا کاظم ایسوسی ایشن کے آرگنائزر بن گئے۔ جلد ہی ملک شوکت علی میئر لاہور کی صدارت میں کارپوریشن ہال میں ایسوسی ایشن کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں خدیجہ عمر نے سوویت یونین سے روسی فلمیں درآمد کیں۔ پہلی فلم ''سائبیریا کی کہانی'' لاہور کے ریگل سینما میں دکھائی گئی۔ ریگل سینما نوابزادہ امتیاز علی خان کی ملکیت تھا جو سجاد ظہیر کے دوست اور ڈبلیو زیڈ احمد کے کزن تھے۔ ڈبلیو زیڈ احمد پاکستان میں روسی فلموں کی ایجنسی حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ وہ روسی فلموں پر سرمایہ کاری کیلئے صرف اس صورت میں تیار تھے کہ حکومت پاکستان روسی فلموں پر پابندی نہیں لگادے گی۔

میاں انور علی ہی کے بیان کے مطابق کراچی میں پاکستان کے روسی سفیر سٹیٹ وِکس فلم کی نمایش کے لئے 21دسمبر 1950 کو بذریعہ ٹرین لاہور پہنچے۔ ریلوے سٹیشن پر رضا کاظم نے ان کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے فلیٹیز ہوٹل میں قیام کیا اور وہ اس ہوٹل میں 27دسمبر تک ٹھہرے۔ اس اثنا میں جو لوگ ان سے ملے، ان میں عبدالروؤف ملک، محمود علی قصوری، طاہرہ مظہر علی اور ظہیر کاشمیری کے نام شامل تھے۔ 25دسمبر کو سفیر موصوف کے اعزاز میں پاکستان سوویت کلچرل ایسوسی ایشن نے فلیٹیز ہوٹل میں عصرانہ دیا جس میں 40افراد شریک ہوئے۔ شرکا میں فیض احمد فیض، محمود علی قصوری، مظہر علی خان، غلام محمد لونڈ خور، فیروز الدین منصور، ظہیر کاشمیری، رضا کاظم، عبدالروؤف ملک، ظہیر باجو، احمد ندیم قاسمی، حمید اختر، نوابزادہ امتیاز علی خان، چوہدری افضل، غیور الاسلام، بیگم میاں افتخار الدین، خدیجہ عمر، ایلس فیض، حمید ہاشمی، شیخ محمد رفیق، بشیر ظفر، طاہری مظہر علی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، احمد راہی اور متعدد دیگر افراد شامل تھے۔ اس موقع پر روسی سفیر نے ایسوسی ایشن کو 500روپوں کا عطیہ دیا۔ انہوں نے رضا کاظم کو کیمرے کا تحفہ دیا۔ سفیر موصوف کے اعزاز میں میاں افتخار الدین نے اپنے گھر پر ظہرانہ دیا۔ اس میں فیض احمد فیض، ایلس فیض، خود میاں افتخار الدین، رضا کاظم، طاہرہ مظہر علی، مظہر علی خان اور محمود علی قصوری

سمیت متعدد افراد نے شرکت کی۔ عبدالروؤف ملک کو یاد ہے کہ ان تقریبات میں شرکت کے لئے لائلپور سے سیف خالد نے بھی شرکت کی۔ یہی موقع تھا جب سیف پاکستان سوویت کلچرل ایسوسی ایشن سے نہ صرف متعارف ہوئے بلکہ آگے چل کر انہوں نے لائلپور میں ایسوسی ایشن کی شاخ قائم کی اور 60ء کی دہائی میں ایسوسی ایشن لائلپور کی فعال ترین تنظیم بن گئی۔

آزاد پاکستان پارٹی کا قیام

نومبر 1950ء میں میاں افتخار الدین اور سردار شوکت حیات نے لاہور میں آزاد پاکستان پارٹی کی بنیاد رکھی۔ شیخ محمد رشید پارٹی کے جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے۔ میاں افتخار الدین نے 1940ء کی دہائی میں پنجاب کانگریس کی صدارت سے مستعفی ہو کر آل انڈیا مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی تھی۔ 46-1945ء کے عام انتخابات میں وہ مسلم لیگ کے پلیٹ،فارم سے دوبارہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد میاں صاحب نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے مہاجرین کی آبادکاری اور زرعی اصلاحات کے لئے کوششیں شروع کر دیں لیکن وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کی جاگیردارانہ قیادت نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ انہوں نے لیگی وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور کچھ عرصہ بعد نومبر 1950ء میں آزاد پاکستان پارٹی کی داغ بیل ڈالی۔ لیاقت علی خان اپنے سیاسی مخالفین کو ''کتے، غدار، دروغ گو اور فریب کار'' کہہ کر پکارتے تھے۔ جنوری 1950ء میں وزیر اعظم نے جب پاکستان سیفٹی آرڈی ننس کا نفاذ کیا تو میاں افتخار الدین اور پنجاب اسمبلی کے آٹھ دیگر ارکان نے اس اقدام کی سخت مذمت کی۔نومبر 1950ء میں آزاد پاکستان پارٹی کا قیام عمل میں آیا ہی تھا کہ وزیر اعظم نے پنجاب میں عام انتخابات منعقد کرانے کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے عوام سے وعدہ کیا کہ وہ دستور ساز اسمبلی کی مدد سے پاکستان کو دولت مشترکہ سے الگ کر لیں گے۔ یہ پاکستان میں پنجاب کی تاریخ کا پہلا انتخاب تھا جس میں مزدور اور کسان نمائندوں نے بھی آزاد

پاکستان پارٹی کے پلیٹ فارم سے انتخابی سیاست میں حصہ لیا۔ مسلم لیگی حکومت نے دھونس اور دھاندلی کی انتہا کر دی۔ لاہور کے مزدور حلقے سے مرزا ابراہیم انتخاب جیت چکے تھے کہ عین وقت پر جھرلو پھیر کر انہیں شکست سے دو چار کر دیا گیا۔ احمد سعید کرمانی، جنہیں ان کے مقابلے پر کامیاب قرار دیا گیا نے ایک سے زائد بار اعتراف کیا کہ اصل میں وہ ہار چکے تھے لیکن حکومت نے مرزا ابراہیم کی جیت کو ہار میں بدل کر انہیں فاتح قرار دے دیا۔ سیف خالد پہلی بار عملی سیاست کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ پارٹی کے پچاس نمائندوں میں سے صرف دو امیدوار (میاں افتخار الدین اور سید امیر حسین شاہ) کامیاب ہوئے۔

آزاد پاکستان پارٹی میں جلد ہی ٹوٹ پھوٹ ہوئی۔ سردار شوکت حیات کچھ ہی عرصہ بعد مسلم لیگ میں واپس چلے گئے۔ محمود علی قصوری اور شیخ محمد رشید میں ان بن شروع ہو گئی۔ چنانچہ شیخ رشید بھی آزاد پاکستان پارٹی چھوڑ گئے۔ پنجاب کے عام انتخابات میں دولت مشترکہ سے پاکستان کو نکالنے کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن انتخاب میں کامیابی اور پنجاب میں نئی وزارت بنانے کے باوجود پاکستان بدستور دولت مشترکہ میں شامل رہا۔ 1952ء میں کمیونسٹ پارٹی نے قومی دار لاشاعت، لاہور سے سردار شوکت کا تحریر کردہ ایک کتابچہ ”دولت مشترکہ اور پاکستان“ کے زیرِ عنوان شائع کیا جس کی پیشانی پر جلی حروف میں تحریر تھا

”------یہ وہ دولت ہے جو مشترکہ نہیں بلکہ برطانیہ کی اجارہ داری ہے۔ دولت مشترکہ موجودہ دور میں برطانوی استحصال اور اقتدار کی نئی شکل ہے۔“

پاکستان آج دولت مشترکہ سے کہیں بڑے سامراجی معاہدوں میں جکڑا ہوا ہے۔ چین پاکستان اقتصادی راہداری (CPEC) اس نوع کی تازہ ترین زنجیر ہے لیکن 1950ء کی دہائی میں پاکستان دولت مشترکہ کے چنگل میں بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ پاکستان کے عوام سوال کر رہے تھے کہ پاکستان دولت مشترکہ میں کیوں ہے؟ ہمارا کون سا قومی مفاد ہمیں برطانیہ کے ساتھ وابستہ کئے ہوئے ہے؟ حکمران بھی برطانوی دولت مشترکہ کے ساتھ بندھے رہنے کی حمایت نہیں کر سکتے تھے البتہ وہ مختلف تاویلیں پیش کر کے اس

کے ساتھ جڑے رہنا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ تجارت کے فروغ، صنعتی ترقی، مسئلہ کشمیر کے حل اور عالمی امن کی خاطر دولت مشترکہ میں رہنا ضروری ہے۔ وہ دبے لفظوں میں یہ بھی کہتے تھے کہ دولت مشترکہ نو آزاد اور خود مختار ملکوں کی تنظیم ہے، جو ان ملکوں کے اندرونی معاملات میں دخل نہیں دیتی۔ اس لئے اس سے پاکستان کی وابستگی کسی نقصان کا باعث نہیں بلکہ پاکستان کے مفاد کے مطابق ہے۔ اس نقطہء نظر کو کمیونسٹ پارٹی اور آزاد پاکستان پارٹی رد کرتی تھیں۔ یقینا سیف خالد بھی اسی نقطہ نظر کے حامل تھے بلکہ انہوں نے اس کتابچے کو بھی پڑھ رکھا تھا۔ 1970ء میں جب پاکستان امریکی سامراج کا مکمل آلہ کار اور دولت مشترکہ کا حصہ تھا وہ پارٹی (خصوصاً آزاد پاکستان پارٹی) کے سامراج دشمن مؤقف کی بھرپور تائید کرتے تھے۔ ان کے پاس ان دنوں بھی یہ کتابچہ موجود تھا، جو انہوں نے مجھے مطالعہ کے لئے دیا تھا۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے 1956ء تک پاکستان کا آئین تشکیل نہیں دیا گیا تھا۔ 1953ء میں جب گورنر جنرل غلام محمد نے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر دیا تو متعدد سچی جھوٹی روایات کے مطابق وہ ملکہ الزبتھ سے فریاد کے لئے برطانوی سفارت خانے پہنچ گئے کہ وہ دولت مشترکہ کے باعث پاکستان کی ملکہ بھی ہیں۔ کہتے ہیں، برطانوی ہائی کمشنر خواجہ ناظم الدین کے ساتھ بہت اخلاق سے پیش آئے۔ ان کی معروضات کو توجہ اور ہمدردی سے سنا لیکن کہنے لگے کہ ملکہ الزبتھ برطانیہ کی ملکہ بھی ہیں اور پاکستان کی ملکہ بھی ہیں۔ لیکن ان کی دونوں حیثیتوں میں امتیاز ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ آپ اگر چاہیں تو اپنا معاملہ بیشک ملکہء پاکستان کے سامنے لے جائیں لیکن میں صرف ملکہء برطانیہ کا نمائندہ ہوں اور اسی حیثیت سے آپ کے ملک میں مقیم ہوں۔ ملکہء پاکستان کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں لہذا میں آپ کے اور ملکہ پاکستان کے درمیان گفت وشنید کا ذریعہ کیسے بن سکتا ہوں۔'' ان دنوں وزارتی سطح پر اس طرح کے تماشے عام تھے۔ سیف خالد ان خرافات کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے تھے کہ اس کے فوراً بعد پاکستان کے امریکہ کے ساتھ فوجی معاہدے ہو گئے جن سے ہم آج تک مکمل طور پر نجات نہیں پا سکے۔

1950ء کی دہائی کے آغاز سے ہی یہ خطہ بحرانوں کی زد میں تھا۔ ہند چینی پر فرانسیسی یلغار کو امریکی فوجوں کی تائید حاصل تھی۔ جون 1950ء سے کوریا کا بحران مسلسل بڑھ رہا تھا۔ 1950ء کی دہائی کے اوائل تک پاکستان سامراجی قوتوں کے مکمل گھیرے میں آ چکا تھا۔ پاکستان کے خلاف سامراجی گھیرا مزید تنگ کرنے کے لئے مارچ 1951ء مین راولپنڈی سازش کا نام نہاد ڈرامہ رچایا گیا۔ اس وقت سیف خالد گورنمنٹ کالج لائلپور میں داخلہ لے چکے تھے اور لائلپور سمیت پورے پاکستان سے بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ اس کے نتیجے میں لائلپور میں انجمن ترقی پسند مصنفین، کسان کمیٹی اور لیبر فیڈریشن کی سرگرمیاں متاثر ہوئی تھیں۔1953ء میں سیف نے گورنمنٹ کالج لائلپور سے گریجویشن کا امتحان پاس کرلیا۔ ریاستی سختیوں کے باوجود وہ ممکن حد تک سیاسی اور ادبی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ ان کی لاہور آمد و رفت جاری تھی۔ وہ آزاد پاکستان پارٹی کے پلیٹ فارم پر نیز مزدور فیڈریشن اور کسان کمیٹی میں بدستور فعال تھے۔

1954ء میں دستور ساز اسمبلی کے رکن سعداللہ خان اور ملک معراج خالد آزاد پاکستان پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔ پی پی ایل کے اخبارات انگریزی روزنامہ پاکستان ٹائمز اور اردو روزنامہ امروز کی ادارتی پالیسی آزاد پاکستان پارٹی کی پالیسی کے مطابق تھی۔ آزاد پاکستان پارٹی کی پالیسی دراصل کمیونسٹ پارٹی کے تابع تھی جس کے گرد ریاستی گھیرا تنگ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس اثناء میں حسن ناصر کراچی جیل اور فیض و سجاد ظہیر سمیت راولپنڈی سازش مقدمہ کے ملزمان سندھ، پنجاب اور بلوچستان کی مختلف جیلوں میں قید و بند کی سختیوں سے نبرد آزما تھے، حکومت نے حسن ناصر کو کمیونسٹ پارٹی سے لاتعلقی کی صورت میں رہائی کی مشروط پیش کش کی جسے کامریڈ حسن ناصر نے ٹھکرا دیا اور حکومت کو کمیونسٹ پارٹی کے متعلق جمہوری رویہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔ انہوں نے اپنے طویل خط میں حکومت کو لکھا:

- ”پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی پاکستان کی وفادار ہے۔ وہ اس کی علاقائی سالمیت اور اس کی سرحدوں کے تحفظ کو اہمیت دیتی ہے۔ وہ نہیں

چاہتی کہ ریاست کے وجود کو کوئی خطرہ لاحق ہو۔ بلکہ نیک نیتی اور خلوص سے اس کے موقف کو مستحکم اور ملک کو طاقتور بنانا چاہتی ہے اور اس کا ایقان ہے کہ یہ مقصد مزدوروں اور کسانوں کے اتحاد اور جمہوری حکومت کے راستے پر گامزن ہونے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کا یہ بھی ایقان ہے کہ پاکستان میں عوامی جمہوری حکومت کے قیام کی جدو جہد محنت کش طبقات کی قیادت میں ہی چلائی جا سکتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ پارٹی کے اس نقطہ ءنظر سے کچھ لوگوں یا جماعتوں کو اختلاف ہو لیکن یہ کہنا بالکل غلط اور ناقابل قیاس ہے کہ کمیونسٹ پارٹی اپنے مقاصد کے حصول کے لئے پر تشدد طریقے اختیار کرنا چاہتی ہے۔ اس کے برعکس کمیونسٹ پارٹی نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ ایک دستوری جماعت کی حیثیت سے سرگرم عمل رہے گی۔ بشیرطیکہ حکومت اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کرے۔ کمیونسٹ پارٹی کی نیک نیتی اور وطن دوستی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو گا کہ پورے مغربی پاکستان میں فی الوقت کوئی کمیونسٹ روپوش نہیں۔ ان میں سے بیشتر باہر ہیں البتہ کچھ لوگوں کو سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا اور ان میں میں بھی شامل ہوں۔

”میں نے حکومت کو تحریری طور پر اس بات کا یقین دلایا ہے کہ اگر میں رہا کر دیا جاؤں تو میں روپوش نہیں رہوں گا۔ بلکہ کھلے عام قانونی اور دستوری طور پر پارٹی کا کام جاری رکھوں گا۔

میں اس بات کا یقین بھی دلانا چاہتا ہوں کہ تخریبی سرگرمیوں سے میرا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میرے یہ سارے تیقنات بے کار ہیں، حکومت پنجاب نے کم و بیش سبھی کمیونسٹوں کو جن میں بعض بہت پرانے پارٹی کارکن بھی شامل ہیں، رہا کر دیا ہے لیکن مرکزی حکومت مجھے چھوڑنا نہیں چاہتی اور پتہ نہیں وہ کتنے دنوں تک

مجھے جیل میں بند رکھے گی۔ اس لئے تو میں یہ کہتا ہوں کہ کمیونسٹوں کے متعلق اس کا رویہ غیر معقولیت کی حد تک سخت گیرانہ ہے جبکہ اسے اس سلسلے میں ہوش مندی اور عقلمندی سے کام لینا چاہئے۔ حکومت میری رہائی کے لئے اس بات کی خواہشمند ہے کہ میں پارٹی چھوڑ دوں اور سیاسی کاموں سے بے تعلقی اختیار کر لوں۔ لیکن اس نے یہ نہیں بتایا ہے کہ میں کس لئے اور کس بنیاد پر اس کی یہ شرطیں قبول کر لوں۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس کی تجاویز کو یکسر مسترد کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس کے بجائے میں سمجھوتے کی پیش کش کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میرے وکلاء میری اس پیش کش کی اچھائیوں کو عدالت میں پیش کریں گے۔"

جولائی 1954ء میں حکومت نے کمیونسٹ پارٹی اور اس کے تمام عوامی فرنٹوں کو خلافِ قانون قرار دے کر ان کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی۔

اس سے قبل 1953ء میں جب کراچی کے طلباء اپنے مطالبات کے حصول کے لئے جدو جہد کر رہے تھے اور انہوں نے اس مقصد کے لئے 8 جنوری کو ایک بہت بڑا جلوس نکالا تو کراچی کی انتظامیہ نے جلوس کو تتر بتر کرنے کے لئے پہلے لاٹھی چارج اور آنسو گیس کے شیل برسائے اور بعد میں گولی چلادی جس کے نتیجے میں متعدد طلباء شہید ہوئے۔ اس خونی تشدد کے بعد کراچی کے طالب علم رہنماؤں۔۔ڈاکٹر محمد سرور، ڈاکٹر ایوب مرزا اور رحمان ہاشمی نے کل پاکستان طلباء کنونشن کا اہتمام کیا جس میں سیف خالد بھی شریک ہوئے۔ میاں اکرم ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اس کنونشن میں لائلپور، جھنگ اور سرگودھا سے ساٹھ کے قریب طلباء نے شرکت کی۔ کراچی کے کٹرک ہال میں جب کنونشن جاری تھا تو کراچی کی انتظامیہ نے اجلاس کو درہم برہم کرنے کے لئے اپنے غنڈوں کے ذریعے اس پر دھاوا بول دیا جس میں متعدد طلباء شدید زخمی ہوئے۔ زخمی طلباء نے قریبی طبی مراکز اور پرائیویٹ کلینکس میں ابتدائی طبی امداد حاصل کی۔ جب طلباء نے ڈاکٹر صاحبان سے فیس کا پوچھا تو انہوں نے کہا کہ آپ تو ہمارے مہمان ہیں۔ آپ

سے فیس کیسی؟ کنوینشن کے اختتام پر ’’آل پاکستان سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (APSO) کا قیام عمل میں آیا۔ APSO کی مجلس عاملہ میں سیف خالد اور میاں اکرم بھی شامل تھے۔ نئی تنظیم نے ’’سٹوڈنٹس ہیرلڈ‘‘ کے نام سے انگریزی زبان میں ایک بلیٹن بھی نکالا۔ جس میں پاکستان بھر سے طلباء سرگرمیوں کو جگہ دی جاتی۔

سفرنامہ سوویت یونین

جولائی 1954ء میں کیمونسٹ پارٹی پر پابندی عاید کر دی گئی۔ اس عمل کا آغاز ابتدائی برسوں سے ہی ہو گیا تھا۔

اپنے قیام کے بعد سے پاکستان خارجہ پالیسی میں امریکہ کی طرف جھکاؤ رکھتا تھا اور اس سے فوجی اور اقتصادی امداد کا شدید خواہاں تھا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان، وزیر خزانہ غلام محمد اور وزیر اعظم لیاقت علی خان پاکستان کو امریکہ سے وابستہ کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ بے چینی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مسلم لیگ کی حکومت رجعت پسند تو تھی ہی لیکن اس کے رویئے غیر جمہوری بھی تھے ایسا لگتا تھا کہ ملک کو امریکہ کے ہاتھ گروی رکھنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ابتداء میں ان کوششوں کے جواب میں امریکہ نے کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہ کیا حتیٰ کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے امریکی دورے کا دعوت نامہ حاصل کرنے کے لئے ایران میں اپنے سفیر راجہ غضنفر علی خان کی وساطت سے روسی دورے کا زبانی دعوت نامہ حاصل کیا اور اسے اس انداز میں پبلسٹی دی کہ امریکہ لیاقت علی خان کو اپنے ملک کا دورہ کرنے کی دعوت دینے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن اس دورے نے بھی امریکی حکومت کے دل جیتنے میں زیادہ کام نہیں دکھایا تا ہم کوریا کی جنگ نے پاکستان کو امریکہ کے لئے ضروری بنا دیا تھا امریکہ اور امریکی بلاک کے ملکوں کے ساتھ فوجی سلامتی کے معاہدوں کی طرف بڑھتے ہوئے پاکستان کے اعلیٰ فوجی اور سول حکام نے خود اپنے ملک کے مفادات کو نظر انداز کر دیا تھا۔

25 فروری 1954ء کو آئزن ہاور نے اعلان کیا کہ باہمی دفاعی امداد کے پروگرام

کے تحت امریکہ، پاکستان کی فوجی امداد کے لئے درخواست کا مثبت جواب دینا چاہتا ہے۔ 6 ستمبر 1954ء کو جب منیلا کانفرنس شروع ہوئی تو پاکستان کے سیاسی حلقوں کو شاید ہی اس بات کا احساس تھا کہ ان کا ملک برطانیہ، فرانس، امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، تھائی لینڈ اور فلپائن کے ساتھ ایک فوجی اتحادی نظام کا مکمل رکن بننے والا ہے لیکن کانفرنس کے تیسرے ہی روز ظفر اللہ خان نے سیٹو کے معاہدے پر دستخط کر کے اپنے ملک کو اس ''مہم ''میں شامل کر دیا۔ اس سے قبل پاکستان 19 مئی 1954ء کو امریکہ کے ساتھ باہمی دفاعی امداد کے معاہدے پر دستخط کر چکا تھا اور بقول ایم ایس وینکٹ رامانی یہ ''معاہدہ دراصل اس بات کے طویل اور محتاط مطالعے کا نقطہ عروج تھا کہ اپنے طے شدہ حریف سوویت یونین کے خلاف اپنے سٹریٹیجک مقاصد پورے کرنے کے لئے امریکہ پاکستان کو کیونکر استعمال کر سکتا ہے۔''۔۔۔اس معاہدے پر دستخط کر کے پاکستان نے اپنے آپ کو امریکہ کے فوجی بلاک سے وابستہ کر لیا۔۔۔سوال یہ ہے کہ آیا پاکستان کی سلامتی کو کوئی ایسا شدید خطرہ لاحق تھا کہ وہ آخری علاج تلاش کرنے پر مجبور ہو جاتا؟ کیا یہ معاہدہ ایسے وقت پر کیا گیا تھا جب کہ وہ پاکستان کے مفادات کو آگے بڑھاتا؟ ان سوالات پر معقولیت سے غور کیا جائے تو جواب نفی ہی میں آتا ہے۔۔۔لیکن زوال کے عروج کا یہ تو محض نقطہ آغاز تھا۔

اس اثنا میں مشرقی پاکستان میں پہلے عام انتخابات ہوئے اور حکمران جماعت مسلم لیگ کا دھڑن تختہ ہو گیا۔ 309 میں سے وہ صرف 9 نشستیں حاصل کر سکی۔ بھاشانی نے عوام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان پر زور دیا کہ وہ قوم کو کراچی میں متعین حکمرانوں کی سازشوں سے بچائیں۔ پورے صوبے میں امریکہ کے ساتھ پاکستان کے فوجی معاہدے کے خلاف یوم احتجاج منایا گیا۔ عین اس موقع پر جب اس نے امریکہ کے ساتھ ایک فوجی معاہدے پر دستخط کئے تھے کراچی کا حکمران ٹولہ مشرقی پاکستان میں عوام کے ہاتھوں مسلم لیگ کی شرمناک شکست اور فوجی معاہدے کے خلاف عوامی احتجاج کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ صوبوں پر مرکزی حکومت کا کمزور کنٹرول واشنگٹن میں برا تاثر پیدا کر رہا تھا جب

مشرقی پاکستان ہنگاموں کی لپیٹ میں آ گیا تو کراچی میں ایک بڑے ڈرامے کے لئے سٹیج تیار کی جارہی تھی 19 مئی 1954ء کو وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے اور امریکی ناظم الامور جان۔ کے ایمرسن نے امریکہ کی طرف سے اس سمجھوتے پر دستخط کئے۔۔ دستخط کرنے کی تقریب کے گیارہ روز بعد کراچی سے ایک غیر معمولی گزٹ شائع کیا گیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ گورنر جنرل غلام محمد کو یقین ہے کہ مشرقی بنگال میں سنگین صورتحال پیدا ہو گئی ہے جس نے فضل الحق کابینہ کی برطرفی اور گورنر راج کے نفاذ کے لئے جواز پیدا کر دیا ہے۔ مشرقی پاکستان کو قابو میں رکھنے کے لیے جو کام کرنے کی ضرورت تھی اس کی انجام دہی کے لئے فوراً ہی ایک گورنر بھیج دیا گیا۔ یہ خود اسکندر مرزا تھے۔ جن کے بارے میں وزیر اعظم بوگرا نے کہا وہ ''ہمارے قابل ترین منتظمین میں سے ایک ہیں۔ وزیر اعظم نے فضل الحق اور ان جیسے دیگر افراد کے بارے میں کہا کہ وہ مشرقی پاکستان کو پاکستان سے توڑنے کے لئے سازشیں کر رہے ہیں۔

اپنے اسی خطاب میں بوگرہ نے عوام کو امریکہ سے فوجی معاہدہ کرنے کی خوشخبری بھی سنائی اور کہا کہ وہ سمجھوتہ امریکہ سے فوجی امداد حاصل کرنے کے لئے لازمی اولین قدم ہے۔ ان کے نزدیک اس سمجھوتے کا مطلب امریکی۔ پاکستانی فوجی اتحاد نہ تھا وزیر اعظم کے دعوے کے مطابق پاکستان نے امریکہ کو فوجی اڈے دینے کی ذمہ داری قبول نہیں کی تھی۔ انہوں نے کہا ''مجھے یقین ہے کہ اس وضاحت کے ساتھ وہ تمام شبہات ختم ہو جائیں گے جو اس مسئلے پر آپ کے ذہنوں میں شاید ان لوگوں کے زہریلے پراپیگنڈے سے پیدا ہوئے ہیں جو پاکستان کو فوجی اعتبار سے مضبوط نہیں دیکھنا چاہتے۔''

وزیر اعظم کا اشارہ واضح طور پر مشرقی پاکستان کے جگتو فرنٹ میں شامل پارٹیوں اور کمیونسٹ پارٹی کی طرف تھا بہر حال پاکستان کے واقعات پر امریکی حکومت نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ البتہ ''نیو یارک ٹائمز'' نے اپنے قارئین کو بتایا کہ مشرقی بنگال میں منتخب صوبائی حکومت کی برطرفی اور اس صوبے کی طرف فوجی اور بحری دستوں کی روانگی بظاہر جمہوری عمل کے الٹ دکھائی دیتی ہے لیکن فضل الحق اور حسین شہید سہروردی نے

''کمیونسٹوں کے ساتھ تعاون کے آتشیں کھیل میں شرکت'' پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ نئے گورنر اسکندر مرزا نے اپنی حکومت کا آغاز وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کے حکم سے کیا۔ گرفتار ہونے والوں میں شیخ مجیب الرحمان بھی تھے۔ اسکندر مرزا نے کمیونزم کے خطرے کا واویلا مچاتے ہوئے ان کا صفایا کرنے کے اقدامات شروع کر دیے۔ 5 جولائی 1954ء کو مشرقی پاکستان میں اور 24 جولائی کو مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگا دی گئی۔

جگتو فرنٹ کی حکومت کی برطرفی اور کمیونسٹ پارٹی کو خلافِ قانون قرار دینے کے فیصلے کے درمیان کئی اہم واقعات پیش آئے۔ 30 مئی کو فضل الحق وزارت برطرف کر کے صوبے میں گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔ گورنر اسکندر مرزا نے ڈھاکہ میں اپنی پریس کانفرنس میں گڑ بڑ کی ساری ذمہ داری کمیونسٹوں پر عائد کی اس کے بقول پاکستان کو دو خطروں کا سامنا تھا۔ مشرقی پاکستان میں کمیونسٹوں کا اور پاکستان کو بحیثیت مجموعی ''مذہبی کٹھ ملائیت'' کا۔ اس نے کمیونسٹ پارٹی پر مستقل پابندی عائد کرنے کا عندیہ دیا صنعتی اداروں سے کمیونسٹوں کو صاف کرنے کے لئے ''چھانٹی کمیٹیاں'' تشکیل دی گئیں۔

کراچی کے ایک روزنامہ نے ''کمیونسٹ'' کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ ''۔۔آج پاکستان دو متضاد رجحانات سے دو چار ہے ایک طرف وہ نظریہ ہے جس کی نمائندگی مسلم لیگ کرتی رہی ہے اور دوسری طرف وہ رجحان ہے جسے پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی پیش کر رہی ہے۔ بالفاظ دیگر یا تو (1) پاکستان ُایک قوم ٔایک ثقافت اور ایک زبان کے اصول پر ترقی کرے گا۔ یا (2) چند قوموں، چند ثقافتوں اور چند زبانوں کے اصول پر۔۔۔ تعمیر و تخریب کے ان دونوں رجحانات میں سے کسی بھی ایک کو ہمیں شعوری طور پر اپنا لینا چاہئے اور اس کے ماتحت اپنی سرگرمیاں شروع کر دینی چاہئیں۔ بے شعوری میں نظریاتی طور پر اس تحریک کا حامی ہونا جس کے نتیجے میں پاکستان بنا تھا اور عمداً اس رجحان کی نمائندگی کرنا جس کی نقیب کمیونسٹ پارٹی ہے طفلانہ اور نادانشمندانہ حرکت ہے۔۔ جنرل مرزا جانتے ہیں کہ ان کا مقابلہ نہ متحدہ محاذ سے ہے نہ فضل الحق سے بلکہ یہ

جنگ کمیونسٹ نظریہ سے ہے فضل الحق اور متحدہ محاذ والے تو صرف کمیونسٹ پارٹی کے ہراول دستے ہیں۔۔ جب وہ (فضل الحق) پہلی بار کراچی آئے تھے تو انہوں نے خود بتایا تھا کہ وہ صوبہ میں کمیونسٹوں کے بڑھتے ہوئے اثر سے پریشان ہیں اور یہ لوگ انتخاب کی وجہ سے آگے آگے ہیں لیکن جب دوسری دفعہ وہ کراچی آئے تو انہوں نے کہا کہ صوبہ میں نہ کمیونسٹ ہیں نہ کمیونزم۔''

5 جولائی کو حکومت نے انتہائی اقدام کرتے ہوئے مشرقی پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگا دی۔ وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے اعلان کیا کہ مشرقی پاکستان میں نظم ونسق بحال کر دیا گیا ہے اور یہ کہ ''مشرقی بنگال کے عوام کا دل اچھا ہے'' انہوں نے دعویٰ کیا کہ حالات کے معمول پر آتے ہی مشرقی بنگال میں پارلیمانی حکومت بحال کر دی جائے گی۔ 26 جولائی کو مغربی پاکستان میں بھی کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی اور یہاں سے بھی کمیونسٹوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مغربی پاکستان میں ''بڑے پیمانے پر'' کمیونسٹوں کی گرفتاریاں پچاس سے زیادہ نہیں تھیں۔ کراچی سے 17، پنجاب سے 13، سرحد (خیبر پختونخوا) سے 7 اور سندھ سے 6 کمیونسٹ گرفتار کئے گئے۔ کراچی سے گرفتار ہونے والوں میں جمال نقوی (یونیورسٹی طالب علم) محمد غالب (ڈاؤ میڈیکل کالج)، مسٹر نسیم (سٹوڈنٹس ہیرالڈ) بابو محمد اسماعیل (مستری ناگر یا ملز) عبدالوہاب (لیبر ویلفیئر آفیسر) ملک نورانی (بک سیلر)۔۔۔ مجتبیٰ فاروقی، طفیل احمد خان (ایڈیٹر کراچی کامرس) شوکت علی خان (اوورسیئر معطل شدہ پاکستان پی ڈبلیو ڈی) وصی احمد حئی (طالب علم ڈی جے سائنس)۔۔۔۔۔۔۔۔۔ محمد یامین (کلرک) سرلا مکرجی (اہلیہ محمد یامین) امان اللہ (نامہ نگار ''اتفاق'' ڈھاکہ) ذاکر حسین زیدی (کلرک۔ کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن) کامل القادری قائم مقام ایڈیٹر (مسلمان) عنائت اللہ (ہوٹل مالک) ادیب حسین رضوی اور محمد ایوب (طالب علم) شامل تھے۔ سندھ سے الطاف احمد انسان (رپورٹر۔ امروز) بدر جلالوی (رپورٹر العصر) سعید مرزا (ایڈیٹر العصر) اور سوبھو گیانی چندانی شامل تھے۔

لاہور سے دادا فیروز الدین منصور (سیکرٹری جنرل پاکستان کمیونسٹ پارٹی) مرزا محمد ابراہیم (صدر پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن) حمید اختر (سب ایڈیٹر روزنامہ ''امروز'' لاہور) عبدالرؤف ملک (مالک پیپلز پبلشنگ ہاؤس) سبط حسن، حسن عابدی، چوہدری رحمت اللہ اسلم (سی آر اسلم) لال خان، غلام محمد اور عبدالغنی قریشی۔

صوبہ سرحد (خیبر پختونخوا) میں خوشحال خان خٹک (کوہاٹ) عمر فاروق (مصنف ''عبدالرحیم پوپلزئی ایک اشتراکی عالم دین'' ہزارہ) محمد افضل ایڈووکیٹ (پشاور) صنوبر حسین (پشاور) شیر علی عرف شیرا (ایبٹ آباد) عبدالرحمان (ضلع ہزارہ) اور فارغ بخاری (پشاور۔ نامہ نگار روزنامہ امروز) گرفتار ہونے والوں میں شامل تھے۔ سابق ریاست بہاولپور سے باقر شاہ نقوی احمد پوری، ادیب واثقی اور شہباز خان۔ بلوچستان سے ظفر علی انجم (نامہ نگار امروز) راولپنڈی سے دادا امیر حیدر اور اوکاڑہ سے عبدالسلام گرفتار کئے گئے۔۔۔ کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ ساتھ اس سے وابستہ ذیلی تنظیمیں پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن، ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن (ڈی ایس ایف) انجمن جمہوریت پسند خواتین اور انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ان پابندیوں سے پارٹی کی سطح پر سیف خالد کی تمام تر سرگرمیاں معطل ہو گئیں لیکن انہوں نے کام جاری رکھنے کے لئے متبادل راستے تلاش کر لئے۔

26 جولائی کو ان تنظیموں کے دفاتر پر پولیس نے چھاپے مارے اور انہیں سر بمہر کر دیا۔ اسی روز کراچی میں متعین روسی سفارتی عملہ پر پابندی لگا دی گئی کہ وہ جنرل آفس کراچی سے 35 میل کے دائرہ کے باہر نقل و حرکت نہیں کر سکے گا۔ اس سے ایک روز قبل کراچی میں ''آزاد پاکستان پارٹی'' کے دفتر پر بھی چھاپہ مارا گیا اسے سر بمہر کر دیا گیا اور اس کے سیکرٹری صابر حسین انصاری گرفتار کر لئے گئے۔ کمیونسٹوں سمیت تیرہ سو کے لگ بھگ جمہوریت پسند گرفتار شدگان میں صوبہ سرحد عوامی لیگ کے نائب صدر ارباب سکندر خان خلیل بھی تھے۔ جولائی 1954ء میں ہی کراچی میں حکمرانوں کی مدد اور سرپرستی میں دائیں بازو کے ایک سیاست دان مظفر حسن نے ایک رجعت پسند کمیونسٹ دشمن محاذ تشکیل

دیا۔ محاذ اس دعوے کے ساتھ تشکیل دیا گیا تھا کہ امنِ عامہ کو تباہ کرنے والے تخریبی عناصر، بھارتی ایجنٹوں اور پاکستان میں ففتھ کالم کمیونسٹوں کے خلاف جہاد کرے گا۔ جلد ہی محاذ کی شاخیں ملک کے بڑے بڑے شہروں میں پھیل گئیں لیکن اس کی سرگرمیاں رائے عامہ کی تائید وحمایت حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ اپنے آقاؤں کی امیدوں کو پورا نہ کر پانے کے باعث یہ محاذ جلد ہی سیاسی منظر سے غائب ہو گیا۔ حکمران جماعت تیزی سے اپنے زوال اور منطقی انجام کی طرف بڑھ رہی تھی۔

کمیونسٹ پارٹی کے خلاف قانون قرار دیئے جانے کے بعد اس کی سرگرمیاں زیر زمین چلی گئیں اور ان حالات میں پارٹی کے کسی بھی عوامی فرنٹ کے پلیٹ فارم سے کام کرنا ممکن نہ رہا، چنانچہ سیف خالد نے متبادل سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ 1955 میں لاہور سے تعلیم کو آگے بڑھانے کا سوچا اور پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں داخل ہو گئے۔ ان کے والد پہلے سے لاہور میں تھے۔ انہوں نے بھی اپنے بیٹے کے ساتھ لاء کالج میں داخلہ لے لیا۔ ان کے ایک اور کلاس فیلو ظفر اللہ پوشنی تھے، جو انہی دنوں راولپنڈی سازش مقدمے کے خاتمے پر رہا ہوئے تھے، ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے ظفر اللہ پوشنی نے بتایا کہ سیف خالد ان کے کلاس فیلو تھے۔

''میں راولپنڈی سازش سے تازہ تازہ رہا ہو کر آیا تھا۔ فیض صاحب اور سجاد ظہیر کا ساتھ رہا تھا۔ مجھ پر ترقی پسند سیاست کا گہرا اثر تھا۔ سیف خالد بھی ترقی پسند تھے اس حوالے سے ان سے اچھا تعلق رہا لیکن کبھی گہری دوستی نہیں ہوئی۔'' کم وبیش اسی عرصے میں میجر اسحاق نے اپنی قانون کی تعلیم مکمل کی۔

اس دوران 1955ء میں ملک کے مغربی حصے میں اہم آئینی تبدیلی ہو چکی تھی۔ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں اور ریاستوں کے آزادانہ وجود کو ختم کر کے انہیں ایک واحد صوبہ میں ضم کر دیا گیا۔ بنیادی طور پر اس کا مقصد مشرقی پاکستان کے اکثریتی صوبے کو مغربی پاکستان کے ساتھ برابری کی سطح پر لانا اور تین چھوٹے صوبوں کے وسائل کو پنجاب کے تصرف میں لانا تھا جس کی مشرقی پاکستان، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد (موجودہ خیبر

پختونخوا) نے بھرپور مخالفت کی۔ پنجاب سے صرف آزاد پاکستان پارٹی کے کارکنوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ قانون کے طالبعلم سیف خالد بھی اس میں پیش پیش تھے اس کا اظہار انہوں نے زندگی میں آگے چل کر کئی بار کیا۔

جولائی 1969ء میں انہوں نے ایک ایسے اعلامیہ پر دستخط کئے جس میں مغربی پاکستان میں ون یونٹ کو ختم کر کے لسانی اور ثقافتی بنیادوں پر صوبائی خودمختاری کے ساتھ پرانے صوبوں کی دوبارہ تشکیل کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ یکم جولائی 1970ء کو جب یحییٰ خان نے ون یونٹ کے خاتمے کا اعلان کیا تو سیف خالد نے راقم سے گفتگو کرتے ہوئے اس اعلامیہ کا بطور خاص ذکر کیا تھا۔ جس میں ان کے علاوہ نیپ کی طرف سے محمود الحق عثمانی، مشرقی پاکستان نیپ کے پروفیسر مظفر احمد، سرحد نیپ کے اجمل خٹک، پنجاب نیپ کے چوہدری ممتاز علی، بلوچستان نیپ کے گل خان نصیر، سندھ نیپ کے غلام محمد لغاری اور کراچی نیپ کے سید علی نقوی کے ساتھ ساتھ کسان، مزدور، طلباء، خواتین اور دانشور نمائندوں نے بھی دستخط کئے تھے۔ دستخط کنندگان میں بلوچستان کے دو قومی رہنما سردار عطاءاللہ خان مینگل اور سردار اکبر خان بگٹی بھی شامل تھے۔ اس دستاویز کا تفصیلی ذکر اگلے باب میں کیا جائے گا۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ ون یونٹ کی مخالفت کرنے والوں میں سیف خالد بھی شامل تھے۔

ابھی سیف خالد قانون کی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ مغربی پاکستان میں ایک اور بڑی سیاسی پیش رفت ہوئی۔ پنجاب سے آزاد پاکستان پارٹی، سرحد (خیبر پختونخوا) سے خدائی خدمت گار تحریک، سندھ سے سندھ متحدہ محاذ، سندھ ہاری کمیٹی اور سندھ عوامی محاذ اور بلوچستان سے استمان گل اور درور پشتون نامی پارٹیوں نے اتحاد کر کے پاکستان نیشنل پارٹی تشکیل دی جس میں مغربی پاکستان کی تمام چھوٹی بڑی ترقی پسند سیاسی جماعتیں شامل تھیں۔

یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کہ پاکستان نیشنل پارٹی کی تشکیل کے محرک میاں افتخار الدین اور ان کی آزاد پاکستان پارٹی تھی۔ پہلا کنونشن لاہور میں منعقد ہوا جہاں سیف خالد پہلے سے رہائش پذیر تھے۔ حافظ تقی الدین کے مطابق اس زمانے میں آزاد پاکستان

پارٹی کا دفتر میکلوڈ روڈ پر لاہور ہوٹل کے سامنے ہوتا تھا۔ بیرون صوبہ جات سے آنے والوں کی رہائش اور خوراک کا انتظام لاہور ہوٹل میں ہی کیا گیا تھا۔ پنجاب کے ورکروں کی رہائش کا انتظام پارٹی دفتر میں ہی تھا۔

کنونشن اجلاس کا انعقاد مارچ 1957ء میں برکت علی محمڈن ہال لاہور میں ہوا۔ حافظ تقی الدین کی یادوں کے مطابق سٹیج پر سندھ عوامی محاذ کی طرف سے شیخ عبدالمجید سندھی تشریف فرما تھے۔ سندھ ہاری کمیٹی کی طرف سے حیدر بخش جتوئی، استمان گل کی طرف سے شہزادہ عبدالکریم، آزاد پاکستان پارٹی کی طرف سے محمود علی قصوری اور خدائی خدمتگار تحریک کی طرف سے خان عبدالولی خان سٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ درورپشتون کے رہنما عبدالصمد اچکزئی، آزاد پاکستان پارٹی کے میاں افتخار الدین، سندھ متحدہ محاذ کے جی ایم سید، بیگم نسیم ولی خان کے والد ملک امیر محمد خان آف مردان اور حسین بخش کوثر جیسی شخصیتیں بھی موجود تھیں۔ خدائی خدمتگار تحریک کے رہنما باچا خان جیل میں ہونے کے باعث اجلاس میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ اجلاس کے دوسرے روز پارٹی کے نام پر اختلاف ہو گیا۔ میاں افتخار الدین کا اصرار تھا کہ اس کا نام آزاد پاکستان نیشنل پارٹی ہو۔ تاہم جلد ہی پاکستان نیشنل پارٹی کے نام پر اتفاق ہو گیا۔ سیف خالد بتایا کرتے تھے کہ لاہور میں ہونے اور اپنی زبردست دلچسپی کے باعث وہ اس اجلاس کے عینی شاہد تھے اور دن میں کئی بار برکت علی ہال اور لاہور ہوٹل آیا کرتے تھے۔ ان رہنماؤں میں سے اکثر قومی اسمبلی اور مغربی پاکستان اسمبلی کے اراکین تھے جن میں میاں افتخار الدین قومی اسمبلی کے رکن تھے جبکہ سید امیر حسین شاہ (گجرات) مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن تھے۔ مغربی پاکستان اسمبلی کے دیگر اراکین میں شیخ عبدالمجید سندھی سمیت سندھ عوامی محاذ کے نو ارکان شامل تھے۔ ان کے علاوہ جی ایم سید، پیر الٰہی بخش، غلام مصطفیٰ بھرگڑی اور رسول بخش تالپور بھی سرگرم تھے۔ تنظیمی اعتبار سے مرکز میں چھ رہنماؤں پر مشتمل ایک تنظیمی کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے سربراہ شیخ عبدالمجید سندھی تھے۔ پاکستان نیشنل پارٹی کے منشور میں ون یونٹ کا خاتمہ، آزاد و غیر جانبدار خارجہ پالیسی اور دور رس زرعی اصلاحات کا نفاذ

بنیادی نکات تھے۔

نئی پارٹی ابھی اپنے تنظیمی مراحل سے گزر رہی تھی کہ عالمی سطح پر ایک بڑا واقع پیش آیا جس میں حکومت پاکستان بھی ملوث ہوگئی۔ یہ واقعہ نہر سویز کی جنگ سے متعلق تھا۔ مصر کے سربراہ جمال عبدالناصر نے نہر سویز کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے مل کر مصر پر حملہ کر دیا اور صحرائے سینا اور نہر سویز پر قبضہ کر لیا۔ اس قبضے پر پاکستانی عوام سراپا احتجاج بن گئے۔ اس کے برعکس حکومت پاکستان نے برطانیہ، فرانس اور ان کے اتحادیوں کا ساتھ دیا۔ اس وقت پاکستان میں عوامی لیگ کی حکومت تھی جس کے سر براہ حسین شہید سہروردی وزیر اعظم تھے۔ عوامی لیگ کے ایک اہم رہنما مولانا عبدالحمید بھاشانی نے ہم خیال ساتھیوں کے ساتھ مل کر پارٹی کے خلاف بغاوت کر دی۔ پاکستان نیشنل پارٹی کے رہنماؤں بالخصوص میاں افتخار الدین نے اس موقع کو غنیمت جانا اور مولانا بھاشانی سے ملاقاتوں کا آغاز کر دیا تاکہ نیشنل پارٹی کو کل پاکستان سطح پر بڑھایا جا سکے۔ ان ملاقاتوں میں مشرقی پاکستان کی گن تنتری دل (عوامی مجلس) کے رہنما حاجی محمد دانش بھی شریک تھے ان ملاقاتوں کے نتیجے میں طے ہوگیا کہ ڈھاکہ میں ایک کنونشن منعقد کیا جائے تاکہ دونوں حصوں پر مشتمل کل پاکستان بنیاد پر پارٹی تشکیل دی جا سکے۔

اسی اثنا میں سیف خالد نے ایل ایل بی کا امتحان پاس کر لیا۔ وہ پاکستان نیشنل پارٹی کے قیام میں پیش پیش رہے تھے۔ تاہم اس بات کی تصدیق نہیں ہو سکی کہ ڈھاکہ جانے والے سو سے زائد مندوبین میں وہ بھی شامل تھے ''یا نہیں۔ حافظ تقی الدین کے مطابق تقریباً دو صد مندوبین نے بذریعہ ریل گاڑی براستہ بھارت ڈھاکہ کنونشن میں جانا تھا۔ ویزے بھی ارجنٹ لگ گئے۔ ڈھاکہ کنونشن براستہ بھارت ریل گاڑی جانے والوں کا پروگرام کچھ اس قسم کا تھا کہ انہوں نے دلی اور کلکتہ سے ہوتے ہوئے جانا تھا اور حکومت نے خفیہ طور پر سرکاری لوگ بھی ساتھ کر دیئے تھے۔ نئی جماعت کے کچھ ورکر بھی حکومت نے کار خاص کے لئے خرید لئے تھے۔

ڈھاکہ کنونشن میں جانے کے لئے لیڈر حضرات تو بذریعہ ہوائی جہاز ڈھاکہ گئے

تھے مگر ورکر اور چھوٹے درجے کے لیڈر براستہ بھارت بذریعہ ریل گاڑی دلی اور کلکتہ سے گھومتے اور پرانے دوستوں کو ملتے ہوئے ڈھاکہ پہنچے تھے۔

4 اگست کے ہفت روزہ ''لیل و نہار'' میں بہت دلچسپ انداز میں ڈھاکہ کے جمہوری کنونشن کا آنکھوں دیکھا حال چھپا تھا جس کے چند اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

''یوں تو جمہوری کنونشن کی رسمی کاروائی کا آغاز 26 جولائی کی صبح کو ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے سیاسی کارکنوں نے 24 اور 25 جولائی کو اپنی غیر رسمی نشستوں میں جو وقفہ وقفہ سے تمام دن اور تمام رات ہوتی رہیں، نئی پارٹی کے نام، اس کے اغراض و مقاصد، اس کا آئین، اس کی تنظیم اور اس کے عہدہ داروں کے بارے میں ضروری فیصلے لئے گئے۔

جمہوری کنونشن میں مشرقی پاکستان سے سابق عوامی لیگی کارکن مولانا بھاشانی کی قیادت میں اور گن تنتری دل کے نمائندے مسٹر محمود علی کی قیادت میں شریک ہوئے۔ مغربی پاکستان سے عوامی لیگ کے لیڈر مسٹر محمود الحق عثمانی سابق جنرل سیکرٹری عوامی لیگ، ارباب عبدالغفور خان اور محمد افضل بنگش وغیرہ شریک تھے جبکہ پاکستان نیشنل پارٹی کی طرف سے میاں افتخار الدین، خان عبدالغفار خان، مسٹر جی ایم سید، عبدالصمد اچکزئی اور عبدالمجید سندھی وغیرہ شریک تھے۔

عجیب بات ہے کہ ادھر جمہوری کنونشن کا اعلان ہوا ادھر مرکز اور صوبے کی پوری سرکاری مشینری اس کے خلاف حرکت میں آگئی۔ بالخصوص ڈھاکہ کے وزارتی حلقوں کا خوف دہراس تو دیکھنے کے قابل تھا۔ مجیب الرحمان صاحب جو وزارت کے عقل کل اور عوامی لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے ان دنوں چین کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ انہیں تاردے کر بلوایا گیا اور وہ اپنا دورہ منسوخ کر کے بھاگم بھاگ ڈھاکہ پہنچے۔ جناب ابوالمنصور احمد ایکٹنگ وزیر اعظم نے بہ نفس نفیس ڈھاکہ میں پڑاؤ ڈال دیا۔ مسٹر سہروردی سے بھی درخواست کی گئی کہ جلد از جلد واپس آئیں لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ امریکہ میں تھے

چین میں نہ تھے کہ دورہ منسوخ کرنے کی جرأت کرتے۔ البتہ ڈھاکہ اور کراچی سے ا
نہیں پل پل کی اطلاع بذریعہ فون ملتی رہی۔

''25 جولائی کی رات کو ایک اخبار نویس نے خبر دی کہ کل صبح کنونشن کے افتتاحی اجلاس میں ''گول مال'' ہوگی۔ یعنی عوامی لیگ کے ''محبان وطن'' کنونشن کے ڈیلی گیٹوں کا خیر مقدم لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے کریں گے۔ بنگال میں بانس بہ کثرت ہوتا ہے۔ البتہ بانس چلانے والے فقط کرائے پر ملتے ہیں۔ کیوں کہ کھیتوں کارخانوں، دکانوں، دفتروں اور کالجوں کے لوگ اتنے مہذب ہیں کہ وہ اختلاف رائے کا احترام کرنا جانتے ہیں اور رواداری ان کے قومی کردار کا جز بن گئی ہے۔ کنونشن کے کارکنوں سے تصدیق چاہی گئی تو انہوں نے سنی ان سُنی کر دی۔ ایک ایم ایل اے کہنے لگے اگر ہم ڈیڑھ ہزار ڈیلی گیٹ جمع کر سکتے ہیں تو کیا دو چار سو والنٹیر ان بدمعاشوں کی خاطر کے لئے نہیں بلا سکتے۔ لیکن ہم مجیب الرحمان کی چال سمجھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہمارے والنٹیر وں اور ان کے غنڈوں میں جھڑپ ہو جائے تاکہ وہ دفعہ 144 لگا کر کنونشن کو روک دیں۔ ہم مار کھالیں گے لیکن کنونشن ضرور ہوگا۔

اور یہی ہوا۔

26 جولائی کی صبح کو بارش رک چکی تھی اور مطلع بالکل صاف تھا اور روپ محل سینما کے آس پاس سناٹا تھا بالکل ویسا ہی جیسا صبح کے وقت سینما گھروں کے آس پاس ہوتا ہے۔ مگر ابھی سورج بلند نہیں ہوا تھا کہ کنونشن کے کارکن رنگ برنگ کے پوسٹر لئے روپ محل میں داخل ہونے لگے اور دیکھتے دیکھتے ہال میں زندگی کی ایک نئی چہل پہل شروع ہو گئی۔ بڑے خوبصورت تھے یہ پوسٹر ان پر فقط نعرے نہ تھے بلکہ رنگین تصویریں بھی بنی تھیں۔ کہیں کسان دھان کی بالیوں کے سامنے بانس کی چھتری نما ٹوپی اوڑھے کھڑا تھا کہیں ملاح ناؤ چلا رہا تھا کہیں سیلاب کی تباہ کاریاں دکھائی گئی تھیں۔ ایک پوسٹر پر فقط 21 کا ہندسہ لکھا تھا جو اشارہ تھا 21 نکاتی پروگرام کی طرف۔ ایک پوسٹر پر زمینداری کو ختم کرنے کا نعرہ تھا۔ ایک صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کر رہا تھا۔ ایک پر صنعتی ترقی پر زور

دیا گیا تھا۔ ایک شہری آزادی سے متعلق تھا ایک جنگ بازوں سے نفرت کا اظہار کر رہا تھا۔ ایک میں تمام ملکوں سے آزاد تجارت کی تلقین تھی ایک پانچ سالہ سرکاری منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنانے پر مصر تھا۔ ایک بے روزگاری کو دور کرنے کا خواہشمند تھا۔

''ابھی پوسٹر لگ رہے تھے کہ مولانا بھاشانی چند دوسرے کارکنوں کے ہمراہ ہال میں داخل ہوئے۔ آٹھ بجتے بجتے ہال بھر چکا تھا اور کہیں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ واضح رہے کہ ڈھاکہ کے تماشائیوں کا کھلا جلسہ نہ تھا بلکہ پندرہ سو ڈیلی گیٹوں کا اجلاس تھا جو اپنے اپنے علاقے سے باقاعدہ منتخب ہو کر بھیجے گئے تھے۔

جلسے کا آغاز ہوا ہی تھا کہ باہر سے شور وغل کی آوازیں آنے لگیں۔ پہلے مظاہرین آئے۔ ان کے عقب میں پولیس آئی۔ خار دار تار لگائے گئے۔ لکڑیوں کے تختے نصب ہوئے لیکن غنڈوں کی روک تھام نہ ہو سکی۔ پھر تو جو آیا اس پر حملہ کیا گیا۔ خواہ وہ پریس کا نمائندہ تھا یا پارلیمنٹ کا ممبر۔ دوپہر تک یہی تماشہ رہا لیکن روپ محل ہال کے اندر قیامت کی سنجیدگی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈیلی گیٹوں کے لئے یہ ہنگامے خلاف توقع نہ تھے۔''

کنونشن کا زیادہ وقت نئی پارٹی کے نام اور پارٹی کے آئین کی دفعہ وار بحث پر صرف ہوا۔ یوں کہنے کو تو ہر شخص کہتا تھا کہ نام میں کیا دھرا ہے جو نام چاہو رکھ لو لیکن حقیقت یہ ہے کہ نام کے پس پشت بہت سے جذبات اور محرکات ہوتے ہیں۔ عوامی لیگ کے حلقے (مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان دونوں جگہوں کے) لفظ ''عوامی'' پر مصر تھے اور گن تنتری دل اور نیشنل پارٹی کے لیڈروں کا رجحان ''نیشنل'' کی طرف تھا۔ بالآخر طے پایا کہ پارٹی کا نام نیشنل عوامی پارٹی ہوگا۔

جمہوری کنونشن کے دوسرے دن کے اجلاس میں مختلف تنظیمی اور جماعتی فیصلے بھی کئے گئے۔ اس دن روپ محل کے باہر کوئی شور وغل نہ تھا لیکن یہ سکون آنے والے طوفان کی تمہید تھا۔

ساڑھے چار بجے کے قریب نیشنل عوامی پارٹی کا جلسہ مولانا بھاشانی کی صدارت میں پلٹن میدان میں شروع ہوا۔ پلٹن میدان ڈھاکہ کا تاریخی میدان ہے۔

''جلسے کو شروع ہوئے مشکل سے بیس پچیس منٹ گذرے ہوں گے کہ دفعتاً شور اٹھا اور میدان کے ایک گوشے سے لاٹھیاں نمودار ہوئیں اور پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ پولیس کے جوان جو سیکڑوں کی تعداد میں پورے میدان کا محاصرہ کئے ہوئے تھے کائی کی طرح چھٹ گئے۔ حاضرین جلسہ حیران تھے کہ بلوائی پولیس کا محاصرہ توڑنے میں کیونکر کامیاب ہو گئے۔ دس منٹ تک بڑی افراتفری کا عالم رہا۔ تب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب، آئی جی پولیس کے ہمراہ آئے اور انہوں نے دفعہ 144 لگا دینے کا اعلان کیا۔ اعلان نامہ پر چار بجے سہ پہر کا وقت درج تھا لیکن اس کا نفاذ پانچ بجے کے بعد ہوا۔

پولیس کی لاریاں لاؤڈ سپیکر سے دفعہ 144 کا اعلان کر رہی تھیں اور لوگوں سے منتشر ہو جانے کی اپیل کر رہی تھیں لیکن لوگ نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈروں کی تقریریں سننے کے لئے بے چین تھے۔ اس درمیان میں مولانا بھاشانی نے کھڑے ہو کر مظاہرین کے حق میں دعائے خیر کی اور بیٹھ گئے۔ جب مجمع منتشر نہ ہوا تو آئی جی پولیس نے مولانا بھاشانی کی خدمت میں درخواست کی کہ جب تک آپ لوگ چلے نہ جائیں گے مجمع منتشر نہ ہو گا۔ مولانا بھاشانی نے میاں افتخار الدین خان عبدالغفار خان اور دوسرے رفیقوں سے مشورہ کیا اور جلوس کی شکل میں دفتر کی جانب روانہ ہوئے۔ ان کے کئی ہزار پیروکار جلوس میں ان کے ہمراہ تھے۔ جونہی یہ جلوس رمنہ کی شاہراہ پر آیا، گلستان سینما کی چھت اور کھڑکیوں سے دوبارہ پتھر برسنے لگے۔ اس بار کئی آدمی پتھروں سے زخمی بھی ہوئے۔ پولیس نے اشک آور گیس پھینکی اور لاٹھیاں ہوا میں گھمائیں۔ تب مظاہرین جن کی تعداد سو سوا سو سے زیادہ نہ تھی منتشر ہو گئے۔ نواب پور روڈ پر پولیس کے چند جوانوں نے ایک غنڈے کو پتھر پھینکتے ہوئے پکڑا مگر دس قدم کے بعد رہا کر دیا۔ غنڈا ہنستا ہوا دوسری سمت چلا گیا۔ اور اب جو عطا الرحمان صاحب اور مجیب الرحمان صاحب فرماتے ہیں کہ حکومت بالکل غیر جانبدار تھی تو مجھے ہنسی آتی ہے وہ کسے بہلانا چاہتے ہیں۔

''ڈھاکہ کنونشن اگر ایک طرف جمہوریت پسندوں کو ایک ملک گیر پلیٹ فارم پر مجتمع کرنے میں کامیاب ہوا تو دوسری طرف اس کا یہ کارنامہ بھی یادگار رہے گا کہ اس کی

بدولت ہماری ملکی سیاست جو گذشتہ کئی برس سے چند صاحب ثروت افراد کی محلاتی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے گرد گھومتی تھی اب کھلی ہوا میں ملک کے عام باشندوں کے روبرو آنے پر مجبور ہو گئی۔ ابھی تو خیر جذبات مشتعل ہیں اور مخالفین کو ہندوستان اور روس کا ایجنٹ کہہ کر دل کی بھڑاس نکالی جا رہی ہے لیکن یہ حربے بہت پرانے ہو چکے ہیں۔ اور ان میں اب دم خم نہیں رہا۔ عنقریب پروگرام کا جواب پروگرام سے دینا پڑے گا اور عمل کا جواب عمل سے کیونکہ پاکستان کے عام باشندے نیشنل عوامی پارٹی اور اس کے مخالفین دونوں کو عمل کے معیار پر پرکھیں گے۔ اور عمل بھی وہ جسکا ڈانڈا ابنائے وطن کی خدمت اور بہبودی سے ملتا ہو نہ کہ درباری اور وزارتی سازشوں سے۔

''جہاں تک کنونشن کے کارکنوں کا تعلق ہے وہ اپنے مقاصد میں کامیاب رہے ہیں۔ وہ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اس وقت نیشنل عوامی پارٹی ہی وہ واحد جماعت ہے جسے ملک گیر اہمیت حاصل ہے۔ ملک میں دوسری کوئی سیاسی جماعت اس لحاظ سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پھر نیشنل عوامی پارٹی کے علاوہ ملک میں کوئی ایسی جماعت نہیں جس کے مشرقی اور مغربی پاکستان میں یک جہتی دوستی اور خلوص کے جذبات اتنے گہرے ہوں۔''

اجلاس میں مغربی و مشرقی پاکستان سے چالیس اراکین پر مشتمل ایک مجلس عاملہ کا انتخاب بھی عمل میں لایا گیا تھا۔ مہدی حسن کے لفظوں میں پارٹی کے اغراض و مقاصد مغربی پاکستان میں ون یونٹ کی تنسیخ اور اس کی جگہ ذیلی فیڈریشن کا قیام، زرعی اصلاحات کا نفاذ، مغربی و مشرقی پاکستان دونوں کے لئے علاقائی خود مختاری، فوجی معاہدوں کی تنسیخ اور آزاد غیر جانبدار خارجہ پالیسی کی پیروی قرار پائے تھے۔ یہ جماعت اپنے قیام کے فوراً بعد عوام میں بڑی تیزی سے مقبول ہونا شروع ہوئی تھی۔ مولانا بھاشانی نے 1957ء کے مجوزہ انتخابات کے پیش نظر (جو منعقد نہیں ہوئے تھے) مشرقی و مغربی پاکستان کے تفصیلی دورے کئے، جنہوں نے جماعت کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ خاص طور پر مزدوروں، کسانوں اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے دانشوروں میں یہ جماعت تیزی سے مقبول ہو رہی تھی۔ ملک میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی نے اس جماعت کو کامیاب

بنانے میں راہ ہموار کی تھی۔“

چونکہ نیشنل عوامی پارٹی سیف خالد کی زندگی بھر کی سیاست کا مرکز رہی، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی کے منشور کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا جائے، تاکہ واضح ہو سکے کہ وہ کیا نصب العین تھا جس کے باعث پارٹی اس قدر اہمیت اختیار کر گئی۔ اغراض و مقاصد کے افتتاحیہ میں کہا گیا تھا:

”پارٹی کا مقصد آزادی اور سالمیت کی حفاظت ایک مقدس امانت کی طرح کرتا ہے۔ آئینی، قانونی اور پر امن طریقے سے پاکستان میں ایک جمہوری طرزِ حکومت اور ایک ایسا سماجی نظام قائم کرنا، جو کہ بیرونی دباؤ اور اثرات سے آزاد ہو تاکہ لوگوں کے درمیان فرقہ وارانہ اختلافات دور ہو جائیں اور ہر قسم کی آمریت، جبر اور استحصال کا خاتمہ ہو جائے۔ اس جمہوری ریاست اور اس کے سماجی نظام میں ہر شہری قانون کی نگاہ میں برابر ہوگا اور تمام افراد بغیر کسی علاقائی، مذہبی عقاید، ذات قبیلہ اور جنس کے فرق کے، نوکریوں کے برابر کے حقدار ہوں گے اور ان کی رہائش، تعلیم، شہری آزادی اور مذہبی عقائد و رسومات کی آزادی کی ضمانت ہوگی۔ تاکہ ہر فرد کو ترقی کرنے کے تمام مواقع حاصل ہوں۔ یہ جمہوری نظام پاکستانیوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرے گا اور دونوں علاقوں کے عوام کو ایک متحدہ اور طاقتور قوم بنائے گا۔

اغراض و مقاصد کے تحت ”پاکستان کو ایک آزاد اور خوشحال وفاقی ملک بنایا جائے گا جس کے دونوں حصے مشرقی اور مغربی پاکستان اپنے اپنے علاقائی معاملات میں خود مختار ہو ں گے۔ ملک کی خود مختاری کے اختیارات عوام کو حاصل ہوں گے جن پر عمل درآمد اسمبلیوں کے ذریعے ہوگا۔ یہ اسمبلیاں عوامی نمائندوں پر مشتمل ہوں گی جن کا انتخاب مخلوط بالغ رائے دہی سے ہوگا۔ اسی طرح وفاقی طرزِ حکومت کے تحت مشرقی اور مغربی پاکستان کے حقِ خود مختاری کے لئے مختلف اقدامات تجویز کئے گئے۔ جن میں صرف دفاع، خارجہ تعلقات اور کرنسی کے معاملات مرکز کے پاس ہوں گے۔ باقی تمام امور میں صوبے آزاد اور خود مختار ہوں گے۔ ثقافتی اور لسانی یگانگت اور جغرافیائی وحدت کی بنیاد پر ون یونٹ توڑ

کر مغربی پاکستان کے چاروں صوبے بحال کر دیئے جائیں گے۔ تمام ریاستوں، قبائلی علاقوں، پٹے پر دیئے ہوئے حصوں ایجنسیوں اور اس طرح کے دوسرے علاقوں کو ملحقہ صوبوں میں پوری طرح ضم کر دیا جائے گا۔ تمام خانہ بدوش، نیم خانہ بدوش اور قبائلی لوگوں کو بڑے علاقوں میں جمع کر کے بڑے علاقوں میں آباد کیا جائے گا۔ تاکہ ان تک ضروریاتِ زندگی کی آسانیاں بہتر صورت میں پہنچ سکیں۔ انتظامیہ کو عدلیہ سے علیحدہ کرنے کا بھی اعلان کیا گیا۔ عوام کے بنیادی حقوق کے تحفظ کی بات کی گئی۔ جن میں خوراک، ملازمت، گھر، تعلیم، صحت، آزادی ء اظہار، جابرنہ قوانین کی تنسیخ، جدو جہد آزادی کی یادگاروں کا قیام، مادری زبانوں کے حقوق، زرعی اصلاحات اور استصواب رائے کے ذریعے مسئلہ کشمیر کا حل شامل ہیں۔ مہاجروں کی آبادکاری، صنعتی ترقی، مزدوروں کے حقوق، ثقافتی و سماجی اصلاحات، آزاد خارجہ پالیسی حتیٰ کہ دفاع جیسے مسائل منشور کا حصہ تھے۔ منشور کا تیسرا حصہ آئین اور اس کی شقوں پر مشتمل تھا۔

پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کے آئین میں اغراض و مقاصد اور پروگرام کے حوالے سے کہا گیا کہ:

> ”پارٹی پاکستان کی آزادی، علاقائی سالمیت اور خود مختاری کی حفاظت کو اپنا مقدس ترین فرض تصور کرتی ہے۔ پارٹی پاکستان میں پر امن اور آئینی جدو جہد کے ذریعے ایسے جمہوری، معاشرتی سماج کے قیام کی داعی ہے جو بیرونی اثر ورسوخ اور جکڑ بندی سے بالکل آزاد ہو جس کے تحت عوام کے درمیان مذہبی بنیاد پر تمام تفرقات بالکل ختم ہو جائیں۔ عوام کی لوٹ کھسوٹ اور ان پر ظلم وستم کا مکمل طور پر اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔ پاکستان میں ایسا جمہوری اور معاشرتی نظام قائم ہو جس کے تحت قانون کی نظر میں عوام کے حقوق بالکل مساوی ہوں اور بلا لحاظ تفریق جغرافیائی حالات، مذہبی عقائد، ذات پات، رنگ ونسل، برادری اور صنف پاکستان میں بسنے والے ہر فرد، مرد وزن کو روز

گار، رہائش، تعلیم کے حصول کے مساوی مواقع حاصل ہوں۔ نیز انہیں تمام تر شہری آزادیاں اور بنیادی حقوق حاصل ہوں، ہر فرد کو اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق عبادت کی پوری آزادی حاصل ہو۔ نیز یہ کہ ہر مرد وزن کو بلاتفریق ترقی کے پورے اور مساوی مواقع میسر ہوں۔ تاکہ وہ اپنی خواہش کے مطابق آزادی سے اپنی زندگی گزار سکیں۔ پارٹی کو یقین ہے کہ اس قسم کے جمہوری اور معاشرتی نظام کے قیام سے پاکستان کے عوام میں جذبۂ حب الوطنی فروغ پائے گا اور یہ جذبہ پاکستان کے دونوں حصوں کے عوام کو ایک عظیم پاکستانی قوم میں متحد کر دے گا۔ پاکستان میں سوشلسٹ سماج کا قیام پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کا مقصد قرار پایا ہے۔"

یہ آئین آج سے 61 برس پہلے مشرقی اور مغربی پاکستان کے ترقی پسند قائدین نے ڈھاکہ میں منظور کیا تھا۔ اس آئین پر آج بھی رو بہ عمل نہ ہو سکا جبکہ مشرقی پاکستان 1971ء میں الگ ہو کر بنگلہ دیش بن چکا ہے، جہاں اس آئین کا بڑا حصہ رو بہ عمل آچکا ہے۔ سیف خالد اس آئین کا فخریہ انداز میں ذکر کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ 1971ء کے بعد بھی۔

مولانا بھاشانی پارٹی کے صدر اور محمود الحق عثمانی مرکزی جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے جب کہ مغربی پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کی صدارت کے لئے بزرگ پختون رہنما عبدالغفار خان کا انتخاب کیا گیا۔ صدر منتخب ہونے کے بعد عبدالغفار خان مغربی پاکستان کے تفصیلی دورے پر نکل کھڑے ہوئے۔ پنجاب میں اوکاڑہ کے سوا تقریباً ہر شہر میں ان کے جلسوں میں گڑ بڑ کی گئی۔ راولپنڈی، لائلپور، ساہیوال، ملتان ہر جگہ ان کے جلسے ہلڑ بازی کا شکار ہوئے۔

اپنے زمانہ طالب علمی میں انھیں طلبہ کے ایک وفد کے ساتھ ہندوستان جانے کا موقع بھی ملا جس میں اُن کی ملاقات اندرا گاندھی اور جواہر لال نہرو سے بھی ہوئی۔

سیف خالد وکالت پاس کر کے لائلپور میں پریکٹس کرنے لگے تھے۔ لائلپور میں جلسے کے اہتمام میں انہوں نے یقیناً اہم کردار ادا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ریاستی غنڈہ گردی کے باعث یہ جلسے ناکام ہوئے۔ اس کے برعکس حیدر آباد، کراچی اور کوئٹہ کے جلسے کامیاب رہے۔ امروز اور پاکستان ٹائمز کے علاوہ پنجاب کے بیشتر اخبارات کا رویہ بھی معاندانہ تھا۔

1956ء کے آئین کے تحت مارچ 1958ء میں انتخابات کا اعلان کر دیا گیا۔ مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی میں نیپ کے پارلیمانی لیڈر جی ایم سید نے ون یونٹ کے خاتمے کے لئے ایک قرارداد پیش کی۔ 300 ارکان کے ایوان میں صرف چار ووٹ قرارداد کی مخالفت میں آئے اور 296 ارکان کی بھاری اکثریت سے قرارداد منظور کر لی گئی۔ اس صورت حال نے سول اور ملٹری بیوروکریسی کو چوکنا کر دیا۔ انہیں خدشہ محسوس ہونے لگا کہ اگر انتخابات منعقد ہوئے تو نیپ بھاری اکثریت سے کامیاب ہو جائے گی۔ چنانچہ انتخابات کو ملتوی کر کے نئی تاریخ نومبر 1958ء مقرر کی گئی۔ جلد ہی اس تاریخ کو بھی تبدیل کر کے فروری 1959ء کی نئی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ فوجی جرنیل صدر اسکندر مرزا کے ساتھ مل کر جمہوری نظام کی بساط کو لپیٹ دینے کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے۔ سیف خالد کا خیال تھا کہ نیپ کو برسراقتدار آنے سے روکنے کے لئے صدر اسکندر مرزا اور مسلح افواج کے سربراہ جنرل ایوب خان نے 7 اکتوبر 1958ء کو مارشل لاء مسلط کر دیا۔ تمام سیاسی جماعتوں اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو معزول کر کے قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دی گئیں۔

مارشل لاء سے قبل کے حالات پر بھی ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے جس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ مارشل لاء لگایا ہی اس لئے گیا تھا کہ نیشنل عوامی پارٹی کو اقتدار میں آنے سے روکا جا سکے۔ مارشل لاء لگانے کا سیاسی کردار 1958ء کے مارشل لاء کے لئے ایک اہم عنصر ثابت ہوا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس سول حکومت کا تختہ الٹا گیا، وزیراعظم سمیت اس کے ایک رکن کو بھی گرفتار نہ کیا گیا لیکن نیپ کے ارکان اور ان کے

ہمدرد بڑے پیمانے پر گرفتار ہوئے۔ وزیر اعظم فیروز خان نون اور ان کی تمام کابینہ معزول ہونے کے بعد خاموشی سے گھر چلی گئی۔ لیکن کمیونسٹ پارٹی نیپ کے ارکان، طلبہ، ترقی پسند دانشوروں اور مزدوروں، کسانوں کو ان کے گھروں سے باہر نکال کر دھڑا دھڑ گرفتار کیا گیا۔ گرفتار ہونے والے سیاسی رہنماؤں میں مولانا بھاشانی، خان عبدالغفار خان، جی ایم سید اور عبدالصمد اچکزئی شامل تھے۔ گرفتار ہونے والے ادیبوں اور صحافیوں میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، سید سبط حسن، حمید ہاشمی اور متعدد دیگر شاعر اور صحافی شامل تھے۔ یونیورسٹی اساتذہ میں پروفیسر ظہور الٰہی اور جناب ظہور احمد کو گرفتار کیا گیا۔ گرفتار ہونے والے ٹریڈ یونین رہنماؤں کی فہرست بہت طویل تھی۔ ان میں سرِ فہرست مرزا ابراہیم اور فضل الٰہی قربان کے نام شامل تھے۔ گرفتار ہونے والے سیاستدانوں، دانشوروں، ادیبوں، شاعرں، صحافیوں، طلباء تنظیموں کے رہنماؤں اور ٹریڈ یونین کے کارکنوں کی تعداد 300 سے زائد تھی۔

جلد ہی لندن میں مقیم ترقی پسند سیاسی کارکنوں نے جو نیپ سے وابستہ تھے، نیشنل عوامی پارٹی کی انٹرنیشنل ریلیشنز کمیٹی تشکیل دی۔ 27 جنوری 1959ء کو کمیٹی کے سیکرٹری کیو۔ ایس۔ انیس الزماں نے اقتدار پر فوج کے غاصبانہ قبضے کی مذمت کرتے ہوئے عالمی برادری کی پاکستان میں انسانی حقوق کی پامالیوں کی طرف توجہ دلائی۔ سیف خالد ان دنوں قانون کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد لائلپور واپس آکر وکالت کے پیشے سے وابستہ ہو چکے تھے۔ یہی دور پاکستان کی سیاسی تاریخ کا انتہائی اہم دور بھی ہے۔ پاکستان کے ساتھ ساتھ خود سیف خالد کا بھی یہ انتہائی اہم دور ہے۔ اس اثناء میں انہوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا لائلپور میں وکالت کا آغاز ہوا۔ انہوں نے زندگی بھر ساتھ نبھانے والی بے مثال خاتون شمیم سے شادی کی۔ گھریلو زندگی میں بندھ جانے کے باوجود ان کی غیر نصابی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شادی کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا جائے۔

گذشتہ باب میں سیف خالد کے اولین نکاح کا ذکر کیا جا چکا ہے 54-1953ء

میں ان کا اپنی تایازاد بہن سے نکاح ہوا تھا لیکن سیف کے دماغ میں کچھ اور ہی سمایا ہوا تھا، وہ سیاست اور کتابوں میں دلچسپی کے باعث شادی کر کے گھر بسانے پر آمادہ نہ تھے۔ انہوں نے شادی کے خلاف بغاوت کر دی اور نکاح ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد سیاسی سر گرمیوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایل ایل بی میں داخلہ لیا اور 1957ء میں وکالت کا امتحان پاس کر کے لائلپور منتقل ہو گئے۔

سیف کے بھائی اقبال کوہ نور ٹیکسٹائل ملز میں کام کرتے تھے جہاں اُن کے ایک دوست سعید احمد شیخ کی بہن شمیم سے سیف کا رشتہ طے پایا اور دسمبر 1957ء میں ان کی شادی ہوگئی۔

ندیم خالد اپنی والدہ کے خاندان کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اُن کی والدہ شیخ برادری سے تعلق رکھتی تھیں جبکہ ہمارے والد ارائیں تھے۔ اُن دنوں برادری سے باہر بیاہ کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا، لیکن میرے والد ذات پات سے مبرّا تھے۔ میرے نانا سول انجینئر تھے اور اُنھوں نے اٹک کا پل تعمیر کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ لیکن وہ جواں عمری ہی میں انتقال کر گئے اور ہماری نانی نے تن تنہا سات بیٹیوں اور تین بیٹوں کو پال پوس کر بڑا کیا۔ وہ امرتسر میں رہتی تھیں اور گھر میں مختلف چیزیں بنا کر بازار میں بھیجا کرتی تھیں۔ تقسیم کے بعد وہ سیالکوٹ چلی آئیں اور اپنا کام جاری رکھا۔ ہمارے ایک ماموں ضیا اللہ شیخ اور ہماری خالہ اپنے خاندان کے ساتھ مشرقی پاکستان کام کرتے تھے۔ 1971ء کے فسادات کے دوران میری خالہ، خالو اور ان کے تین بچے مارے گئے۔ دو بچوں کو ہمارے ماموں اپنے ساتھ واپس مغربی پاکستان لے آئے۔ یہ دونوں بچے بعد میں فوج میں بھرتی ہوئے۔ انھی فسادات کے دوران ایک بھائی کھو گیا جس کا پھر کبھی پتہ نہ چلا۔

سیاسی اعتبار سے سیف خالد مشرقی پاکستان کے عوام کی جدو جہد کے حامی تھے۔ یہ بات اہم ہے کہ خاندانی معاملات ان کے سیاسی وقف پر حاوی نہ ہو پائے۔ بہر حال شادی کے بعد سیف خالد کی وکالت خوب چلنے لگی اور انہوں نے کئی مقدمے جیتے۔ ایک قابل ذکر کامیابی کا تعلق جہانگیر مرغ پلاؤ، بھائی فتح کے ایک مقدمے سے تھا۔ جہانگیر مرغ پلاؤ

گھنٹہ گھر کے قریب کچہری بازار میں خوراک کا ایک مقبول ڈھابہ تھا جو آج بھی اتنا ہی مقبول ہے۔ ڈھابے کے مالک ایک ترقی پسند کاروباری تھے۔ جب بھی فیض، جالب اور دوسرے ترقی پسند لائلپور آتے، بھائی فتح ان کے اجلاسوں میں موجود ہوتے۔ ان کا دکان کے تنازعہ کا مقدمہ تھا جو سیف خالد نے جہانگیر مرغ پلاؤ کے حق میں جیت لیا۔ اس کے بعد جب بھی مہمان آتے ان کی بلا معاوضہ آؤ بھگت کی جاتی سیف خالد کے گھر بھی پلاؤ کے تھیلے اکثر آتے۔

1957ء میں سیف خالد کی شادی ہوگئی۔

1958ء میں ان کی پلوٹھی کی اولاد ندیم خالد کی ولادت ہوئی۔ لیکن ہم ان کے اور ان کے بہن بھائیوں کے بارے میں آگے چل کر بات کریں گے۔

تین چار سال تک سیف خالد کی وکالت بہت اچھی چلی لیکن 1962ء میں وہ اسے لپیٹ کر لاہور چلے گئے۔ یہ ایوب خان کے مارشل لاء کا دور تھا۔ اس سے دو سال قبل 1960 میں حسن ناصر لاہور قلعہ میں شہید ہو چکے تھے۔ جس کا سیف خالد سمیت تمام سیاسی کارکنوں پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ طلباء میں بے چینی پھیل رہی تھی لیکن ان واقعات کی تفصیل ہم اگلے باب میں بیان کریں گے۔

تیسرا باب

مارشل لاء 1958ء اور نیشنل عوامی پارٹی

سیف خالد شادی کے بعد آسودہ زندگی گزار رہے تھے۔ وکالت میں کامیابیاں نصیب ہو رہی تھیں۔ ضلع کچہری میں سیاسی رابطے جاری تھے۔ نیشنل عوامی پارٹی کا سفر خوشگوار تھا۔ نئی نویلی سیاسی پارٹی، گھر میں نئی نویلی دلہن، بھائی فتح کا جہانگیر مرغ پلاؤ اچھے دوستوں کی محفلیں، اب وہ تڑپن کی جذباتی کیفیت سے چھٹکارہ پا چکے تھے۔ 1958ء گزرا جا رہا تھا۔ وہ اپنی گھریلو زندگی سے بھی خوش تھے اور سیاسی زندگی سے بھی لیکن سیاسی طور پر فضا میں ایک تناؤ کا احساس ہوتا۔ قیوم خان کا جہلم سے گجرات تک 32 میل لمبا جلوس نکلا تو وزیر اعظم فیروز خان نون چونک پڑے۔ بہر حال ان کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ وہ ملک میں پارلیمانی جمہوریت کے آخری وزیر اعظم ثابت ہوں گے۔ کچھ عرصہ قبل سیاسی حکومت کی کاوشوں سے پاکستان کو طویل عرصے بعد گوادر کی بندر گاہ واپس مل چکی تھی۔ ستمبر کے آخر میں مشرقی پاکستان اسمبلی میں ہونے والی دھینگا مشتی کے نتیجے میں اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر ہلاک ہو گئے تھے پھر بھی کسی نے نہیں سوچا تھا کہ جلد ہی جمہوریت کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔ ایک حساس سیاسی کارکن کے طور پر وہ ان واقعات کو تشویش کی نظروں سے دیکھ رہے تھے کیا ملک فوجی تبدیلی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ سوال کسی کے ذہن میں نہیں تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ میجر جنرل اسکندر مرزا جمہوری نظام کو تہ و بالا کر کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

فروری 1948ء سے بلوچستان میں بارود کی بو پھیل رہی تھی۔ پاکستانی مسلح افواج نے 7 اکتوبر کی صبح فجر کی نماز کے دوران قلات کی جامع مسجد پر ہلہ بول دیا۔ متعدد سپاہی شہید ہو گئے۔ بتایا گیا کہ خان قلات پاکستان سے بغاوت کر کے علیحدگی کا اعلان کرنے والے تھے۔

7 اکتوبر کو پاکستان میں مارشل لاء کا اعلان کر دیا گیا۔۔۔ سول حکومتیں معزول کر دی گئیں۔ آئین منسوخ کر دیا گیا۔ اسکندر مرزا نے ایک کابینہ تشکیل دی جس میں ذوالفقار علی بھٹو سب سے کم عمر وفاقی وزیر بنے۔ اسکندر مرزا نے ایوب خان کو وزیر اعظم تعینات کر دیا لیکن ایوب خان کچھ اور ہی سوچ بیٹھا تھا۔ سیف خالد، جو گھر میں پہلی اولاد کی خوشی کے منتظر تھے اس صورت حال کو تشویش سے دیکھ رہے تھے۔ وزیر اعظم فیروز خان نون کو آرام سے گھر جانے دیا گیا لیکن ملک بھر میں نیپ کی قیادت سمیت بائیں بازو کے تمام کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ کہا گیا کہ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر ملک میں تبدیلی لائی گئی ہے۔ اسے اکتوبر انقلاب کا نام دیا گیا۔

7 اکتوبر سے 27 اکتوبر تک اسکندر مرزا اور ایوب خان کے درمیان ایک خاموش رسہ کشی جاری رہی۔ 27 اکتوبر کو ایوب خان کے تین جرنیلوں نے اسکندر مرزا سے بندوق کی نوک پر استعفیٰ لے لیا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ مرزا رضا کارانہ طور پر مستعفی ہو رہے ہیں تاکہ انقلابی حکومت اپنے ایجنڈے کے مطابق کام کر سکے۔ لائلپور میں سیف خالد، میاں محمود احمد اور نیپ کے متعدد کارکنوں کے گھروں کے باہر سی آئی ڈی تعینات کر دی گئی۔ تناؤ سے بھری اس فضا میں یکم نومبر کو سیف خالد کے گھر ان کی پہلوٹھی کی اولاد ندیم خالد پیدا ہوئے۔ اگلے آٹھ برسوں میں ندیم کے تین بہن بھائی اس دنیا میں آئے لیکن اس بارے میں ہم آگے چل کر بات کریں گے۔

بدلے ہوئے اور تناؤ بھرے ماحول میں سیف خالد نے محتاط انداز میں وکالت جاری رکھی جو نامساعد حالات کے باوجود اچھی چلی۔ 1962ء میں وہ اسے لپیٹ کر لاہور چلے گئے۔ لیکن یہاں رُک کر یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اولین دو تین برسوں میں مارشل لاء کی حکومت نے اس ملک کے ساتھ کیا کیا؟

1959 میں تمام ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اسی سال فیض احمد فیض بھی گرفتار ہو کر لاہور کے شاہی قلعے میں پہنچ گئے۔

متعدد کمیونسٹ کارکن زیرِ زمین کام کر رہے تھے۔ جن کی گرفتاری کے لئے ملک بھر میں چھاپے مارے جا رہے تھے۔ پولیس کو خصوصیت سے حسن ناصر کی تلاش تھی۔ مارشل لاء کی سختیوں کے باوجود وہ اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھے۔ فیض اور میجر اسحاق لاہور کے قلعے میں بند تھے۔ مارشل لاء سے قبل فیض افریقی ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کے لئے تاشقند پہنچے تھے۔ ابھی وہ وہیں تھے جب پاکستان میں فوج نے ملک پر قبضہ کر لیا۔ ایک روسی ادیب الیگزنڈر سرکوف نے انہی دنوں فیض سے ملاقات کی اور ان کی اداس کیفیت بیان کی۔ اس عالم میں بھی فیض کس قدر حوصلہ مند تھے، اس کا اندازہ سرکوف کے بیان سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

''ماسکو میں، ادیبوں کی انجمن کے ایک کمرے میں ہم بیٹھے ہوئے تھے۔۔۔ ہماری گفتگو کا رخ نظموں سے ہٹ کر اس وقت کی سیاست کی طرف ہو گیا۔

'تو پھر مستقبل قریب میں آپ کا کیا ارادہ ہے؟'

فیض نے اپنی سیاہ آنکھوں سے، جن کی گہرائی میں قدرے اداسی تھی، میری طرف دیکھا لیکن ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ موجود تھی۔

'بس پہلے تو میں لندن جاؤں گا، وہاں اپنے بعض دوستوں سے ملوں گا، جو ابھی پاکستان سے آئے ہیں۔ اس کے بعد ظاہر ہے میں کراچی، لاہور، اپنے وطن واپس چلا جاؤں گا۔

'لیکن آپ جانتے ہیں کہ اب وہاں۔۔۔۔'

ان کے ہونٹوں پر وہی ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

'ظاہر ہے کہ اس صورت میں مجھے وطن ہی واپس جانا چاہئے۔'

'تو پھر جیل یقینی ہے۔۔۔۔۔'

'شاید۔۔۔ اور اگر کسی بڑے مقصد کی خاطر جیل بھی جانا پڑے تو ضرور جانا چاہئے۔'

'لیکن اگر جیل سے بھی بدتر کچھ ہوا تو۔۔۔؟

شاعر نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا جہاں باغ کے وسط میں ٹالسٹائی کا مجسمہ نصب تھا، سرد اور خزاں زدہ آسمان پر نظر ڈالی، مسکراہٹ بدستور موجود تھی، چند لمحے کے توقف کے بعد انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں آہستہ سے کہا۔

'اگر جیل سے بھی بدتر کوئی چیز ہوئی تو پھر یقیناً بُرا ہوگا لیکن تم جانتے ہو، جدو جہد بہر حال جدو جہد ہے۔'

فیض لندن سے ہوتے ہوئے وطن واپس پہنچے اور لاہور پہنچتے ہی گرفتار کر لئے گئے۔ فیض کے اپنے الفاظ میں

''ایک بار پھر جیل خانے گئے، مارشل لاء کا دور آیا اور ذہنی اور گردوپیش کی فضا میں پھر سے کچھ انسدادِ راہ اور کچھ نئی راہوں کی طلب کا احساس پیدا ہوا۔''

حسن ناصر کی شہادت

انہی راہوں کی طلب میں حسن ناصر زیر زمین بھٹک رہے تھے۔ فیض اور میجر اسحاق کی قلعے سے رہائی کے چند ماہ بعد حسن ناصر کو گرفتار کر لیا گیا۔

''وہ بھیس بدل کر شہروں شہروں پھرتے تھے اور اپنی پارٹی کی تنظیم کا کام نہایت تن دہی سے کر رہے تھے۔ راتوں کو قریبی عزیزوں اور مخلص دوستوں کے گھر میں پناہ لیتے تھے اور بعض

اوقات جنگل ویرانہ، کھنڈر اور قبرستان میں زمین کے فرش پر آسمان
کے نیچے بغیر تکیے اور دری کے راتیں گزارتے آخر ایک دن وہ
پکڑے گئے۔"

ان کی گرفتاری کے حوالے سے کئی کہانیاں مشہور ہیں جن کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہی وہ دن تھے، جب سیف خالد لائلپور میں کامیاب وکالت کے نتیجے میں نسبتاً آسودہ زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن شادی کے بعد کا یہ زمانہ کسی بھی طرح ان کی سیاسی زندگی میں رکاوٹ نہیں بن رہا تھا۔ اس کے برعکس ان کی بیوی، جو ایک بالکل مختلف ماحول سے نکل کر آئی تھیں۔ جلد ہی سیف خالد کے سیاسی مزاج میں ڈھل گئیں۔ یہی نہیں، کچھ ہی عرصہ بعد وہ ایک کامیاب سیاسی میزبان ثابت ہوئیں۔ خصوصاً 1961ء میں جب یونیورسٹی آرڈیننس کے خلاف بارہ طلباء کو کراچی بدر کیا گیا تو نواز بٹ اور ان کے بعض ساتھیوں کی بھرپور آؤ بھگت کے پیچھے انہی کی میزبانی کا فراخدل جذبہ تھا اور جب مزید چند سال سیف خالد وکالت سے کُلی طور پر کنارہ کش ہو گئے تو بیگم شمیم سیف خالد نے گھر کے معاشی معاملات کو سنبھالا دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

بات ہو رہی تھی حسن ناصر کی گرفتاری اور شہادت کی۔ اکتوبر 1958 میں مارشل لاء لگا تو حسن ناصر اپنی زیرِ زمین سرگرمیوں میں قدرے محتاط ہو گئے لیکن انہوں نے اپنی سرگرمیوں میں کمی نہ آنے دی۔ مارشل لاء نے متوقع انتخابات کا امکان ختم کر دیا۔ حسن ناصر نے اس حوالے سے ایک مضمون لکھا جس کا حوالہ مرزا اشفاق بیگ نے اپنی ایک تحریر "حسن ناصر کے ساتھ چند دن" میں دیا ہے۔

حسن ناصر نے لکھا:

"اس وقت پاکستان میں جیسے حالات تھے، ان میں سامراجی
اس بات کی توقع نہیں کر سکتے تھے کہ انتخابات کے نتیجے میں کوئی مضبوط
اور پائیدار مغرب نواز مخلوط حکومت بن سکے گی۔

"دوسری طرف اس بات کا امکان تھا کہ نیشنل عوامی پارٹی، جس

میں ایک مضبوط بایاں بازو تھا، انتخابات کے بعد قانون ساز اسمبلی میں
پہلے سے کہیں زیادہ بھرپور نمائندگی حاصل کر لیتی اور ملک کی پارلیمانی
زندگی میں توازن قائم رکھنے کی حیثیت برقرار رکھتی اور نتیجے میں پاکستان
کے معاشی اور سیاسی امور میں پہلے سے کہیں زیادہ دخیل ہوتی۔ سامراجی
اس بات سے خوش نہیں ہو سکتے تھے کہ انتخابات کے بعد نیشنل عوامی
پارٹی اس حیثیت سے ابھرے۔ اس لئے نیپ ایک جمہوری پروگرام پر
عمل درآمد کی پابند تھی۔"

"انتخابات کے انعقاد کے معنی یہ ہوتے کہ پاکستان میں جمہوری
اداروں اور پارلیمانی جمہوریت کی جڑیں اور مضبوط ہوتیں اور سامراجیوں
کے لئے مستقبل میں، ان کے اندر دخل اندازی کرنا، ان کی جگہ کسی
آمرانہ ڈھانچے کو رائج کرنا بہت زیادہ مشکل ہو جاتا۔ شہری آزادیوں کا
استحکام انتخابات کے نتیجے میں ایک سلسلہ عمل کی حیثیت سے سامنے آتا،
اس کے معنی یہ ہوتے کہ پاکستان میں عوامی جمہوریت اور سوشلزم کے قیا
م کی جدو جہد کے لئے زیادہ سازگار حالات پیدا ہوتے۔"

اس نقطہ نظر کو آگے بڑھانے کی یقیناً ایک قیمت تھی جو حسن ناصر نے اپنی زندگی کی صورت میں ادا کی۔ ان کی گرفتاری کے لئے ملک بھر میں جال بچھا دیا گیا۔ گرفتاری کے بعد ان پر تشدد کی انتہا کر دی گئی۔ ہندوستان میں ان کے چچا نور الحسن کے مطابق "ان کو قید میں سخت اذیتیں دی گئیں۔ ان کو جھکا کر باندھ دیا جاتا تھا۔ اوپر بیٹھ کر بھاری پتھر رکھ کر آنکھوں پر سرچ لائٹ ڈالی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ ان کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ کر پارہ پارہ ہو گئی اور وہ شہید ہو گئے۔"

یہ تماشہ یہیں ختم نہیں ہوا، ہلاکت کو خودکشی قرار دیا گیا۔ ان کی والدہ علمدار زہرہ لاہور آئیں اور پولیس نے انہیں کسی دوسرے شخص کی لاش دکھادی۔ اس باوقار خاتون نے اسے اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ جو کوئی بھی حسن ناصر کو جانتا تھا وہ یہ تسلیم کرنے

کے لئے تیار نہیں تھا کہ وہ خود کشی بھی کر سکتے ہیں۔

جب حسن ناصر کی شہادت کی خبر پھیلی تو انجمن جمہوریت پسند خواتین کی رہنماء ممتاز نورانی لاہور میں تھیں۔ انہیں کراچی سے ملک نورانی نے فون کیا۔

''ممتاز ایک بری خبر ہے'' خبر سننے کے بعد ممتاز آپا کا قدرتی ردعمل تھا:

''لیکن یہ سراسر جھوٹ ہے۔ بابو (ناصر کا گھریلو نام) کبھی خود کشی نہیں کر سکتا۔۔۔ ملک! اُسے ضرور کم بختوں نے مار ڈالا ہے، ہائے ہم کیا کریں۔''

لائلپور میں بھی یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ افضل احسن رندھاوا نے مجھے بتایا کہ ''اس خبر کے بعد سیف خالد ضلع کچہری میں مزاحمت کی قرار داد لے کر بھاگے پھرتے تھے لیکن اکثر وکیلوں نے دستخط کرنے سے معذوری ظاہر کی، جو سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ چاروں طرف ایوب خان کی دہشت پھیلی ہوئی تھی لیکن سیف خالد اس سے بے نیاز اپنی جدو جہد میں لگے رہے۔ جب وہ کچھ دستخط حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے، تو کوئی اخبار اسے چھاپنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ امروز اور پاکستان ٹائمز پہلے ہی فوجی سرکار کے قبضے میں چلے گئے تھے۔

حسن ناصر کی شہادت نے بائیں بازو کے ہر کارکن کو ہلا کر رکھ دیا، سیف خالد بھی اس سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ لائلپور میں انہوں نے ادیبوں، شاعروں، طلباء، مزدوروں اور وکیلوں میں اپنے رابطے تیز کئے۔ جلد ہی انہوں نے لاہور کا رخ کیا اور حسن ناصر کی شہادت کی تحقیقات کے مقدمے میں میجر اسحاق کی مدد کرنے لگے۔ حالات کی سنگینی کے باوجود ترقی پسند وکلاء اس جدو جہد میں میجر اسحاق کا بھر پور ساتھ دے رہے تھے۔ میجر اسحاق نے اپنی کتاب ''حسن ناصر کی شہادت'' میں کھل کر بتایا ہے کہ ''ایوب شاہی عروج پر تھی، ملک میں کوئی دم نہیں مار رہا تھا۔ پھر بھی لاہور ایسے لوگوں سے بھرا پڑا تھا جنہوں نے حسن ناصر کا نام تک نہیں سنا تھا لیکن جب مقدمہ شروع ہوا تو ان کے ٹھٹ کے ٹھٹ عدالت کا کمرہ بھر دیتے تھے۔ بلکہ بھیڑ برآمدوں تک پھیل جاتی تھی۔ خفیہ پولیس اپنے لاؤ لشکر سمیت موجود ہوتی تھی لیکن مرحبا ہے لاہوریوں کو کہ سینہ تان کر ان کو کوستے

رہے۔ میرے دفتر میں طالب علموں اور سیاسی کارکنوں کا ہر شام جمگھٹا ہوتا تھا۔ وکلاء میں سے میاں محمود علی قصوری، میاں منظر بشیر، چوہدری فضل حسین، عابد حسن منٹو، مس ندرت الطاف، سیف خالد اور دوسرے کئی وکلاء نے امداد کی۔

مقدمے کا تمام عرصہ تقریباً ایک ماہ تک سیف خالد لاہور میں ہی رہے اور جب میجر اسحاق کو مقدمے سے لاتعلقی پر مجبور کر دیا گیا تو سیف لائلپور واپس آ گئے۔ یہاں آ کر بھی وہ چین سے نہیں بیٹھے اور حسن ناصر کے بارے میں سرگرم عمل رہے۔

شہیدانِ بلوچستان

مارشل لاء سے دو روز قبل خان قلات میر احمد یار خان کی گرفتاری اور لاہور جلاوطنی کے اقدامات نے بلوچ قبائل کو مشتعل کر دیا تھا۔ اسی دور میں رسوائے زمانہ قلی کیمپ میں تشدد کی کہانیاں سامنے آئیں۔ غوث بخش بزنجو کے الفاظ میں

''نواب نوروز خان کی قیادت میں زہری قبیلہ بغاوت میں اٹھ کھڑا ہوا۔ حکومت نے اس کے ردِعمل میں جھالاوان میں فوجی ایکشن کا آغاز کر دیا۔ نیپ نے اسے سیاسی طور پر غیر دانش مندانہ اقدام تصور کیا کہ وہ نوروز خان کو مارشل لاء حکومت کا سامنا کرنے کے لئے تنہا چھوڑ دے۔ آغا صاحب کی گرفتاری کے بعد مجھے بلوچستان نیپ کا صدر منتخب کیا گیا۔ اگرچہ مارشل لاء کے تحت سیاسی سرگرمیوں پر پابندی تھی، نیپ بلوچستان میں مارشل لاء اور ون یونٹ کے خلاف احتجاج میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ نیپ کی مارشل لاء مخالف تحریک نے جھالاوان میں قبائل کی بغاوت کو ایک وسیع تر سیاسی جہت دی اور اس کے ساتھ عوامی حمایت بھی حاصل کی۔ جب بعض علاقوں میں احتجاج پھیلا اور زیادہ پُرتشدد صورت اختیار کرنے لگا تو حکومت نے جواباً نیپ کے تمام سرگرم اراکین کو گرفتار کر لیا اور فوج کی تحویل میں بدنامِ زمانہ قلی کیمپ کوئٹہ چھاؤنی میں پھینک دیا۔ میں بھی گرفتار ہونے والوں میں شامل تھا۔

جب نیپ کے رہنما اور کارکن قید میں ڈال دیئے گئے تو حکومت نے قرآن پاک

پر حلف دیتے ہوئے نوروز خان سے وعدہ کیا کہ مسائل مذاکرات کے ذریعے حل کئے جائیں گے۔ انہیں پہاڑوں سے نیچے اترنے پر قائل کیا گیا۔ مئی 1959ء میں ان کی واپسی پر انہیں اور ان کے ساتھیوں کو حراست میں لے کر قلی کیمپ میں ڈال دیا گیا۔ جہاں وہ ڈیڑھ سال تک قید رہے۔ یہ مارشل لاء حکومت کی جانب سے کھلی دھوکہ دہی تھی۔ قلی کیمپ کے قیدیوں کو ہر قسم کے خوف ناک تشدد اور ذلت کا شکار بنایا گیا۔ مثال کے طور پر:

- تشدد بشمول کئی کئی روز تک دونوں اطراف میں بازو پھیلا کر کھڑے رکھنا
- لباس کے بغیر کھلی فضا میں تیز ہواؤں کا سامنا کرتے ہوئے کھڑے رکھنا
- چھت سے الٹا لٹکا کر بید مارنا
- پیٹ کے بل لٹانا جب کہ سپاہی اپنے بوٹوں سمیت قیدیوں پر اچھل کود کرتے
- قیدیوں کو طویل دورانیے تک بھوکا رکھنا بھی تشدد کی ایک قسم تھی

ایک سال بعد بزنجو رہا ہوئے تو انہیں پتہ چلا کہ نواب نوروز خان اور ان کے ساتھیوں کے لئے کسی وکیل کا انتظام نہیں تھا۔ انہوں نے قاضی محمد عیسیٰ کو ان کے دفاع پر رضا مند کر لیا۔ جب فوجی حکومت کو اندازہ ہوا کہ بزنجو، نواب نوروز خان اور ان کے ساتھیوں کی رہائی کے لئے کوشاں ہیں تو انہیں دوبارہ گرفتار کر کے قلی کیمپ میں بھیج دیا۔ اس بار انہیں قید تنہائی میں رکھا گیا اور ان پر تشدد کے تمام حربے آزمائے گئے۔ بزنجو اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

"نامناسب اوقات میں طویل تفتیش اور قیدیوں کو کئی کئی راتوں تک جگائے رکھنا ہماری حراست کا معمول کا حصہ تھا۔ چھ مہینے کے لئے ایک کوارٹر گارڈ سے دوسری پر منتقلی کے بعد مجھے چھ مہینے اور پانچ کوڑوں یا ان کے بدلے 10 ہزار روپے جرمانے کی سزا سے نوازا گیا اور مچھ جیل بھیج دیا گیا۔

نوروز خان کو عمر قید اور ان کے چھ ساتھیوں کو سزائے موت سنا کر مچھ جیل بھیجا گیا۔ کئی دوسروں کو 5 سے 14 برس قید کی سزائیں سنائی گئیں اور ملک کی مختلف جیلوں

میں بھیج دیا گیا۔ وہ جنہیں سزائے موت دی گئی، ان کے نام درج ذیل ہیں:

1۔ نواب کے بیٹے، میر بٹے خان

2۔ میر ولی محمد خان زرک زئی

3۔ میر بہاول خان موسیانی

4۔ میر مستی خان موسیانی

5۔ میر سبز خان زہری

6۔ میر غلام رسول جتک

ان چھ کو بعد ازاں حیدر آباد جیل میں پھانسی دی گئی۔ نواب نوروز خان نے اپنی عمر قید کے دوران ہی 1964ء میں حیدر آباد جیل میں وفات پائی۔'' ان کی یاد میں 15 جولائی کو ہر سال یومِ شہدائے بلوچستان منایا جاتا ہے۔

سیف خالد سمیت پنجاب کے سیاسی کارکنوں کو خبر تک نہ ہو سکی کہ ان کے بلوچ ہم وطنوں پر کیا گزری ہے۔ ان میں سے بیشتر خود قید و بند سے گزر رہے تھے۔ بزنجو رہائی کے بعد تیسری بار گرفتار ہو کر قلی کیمپ میں بند ہو گئے۔ چھ ماہ قلی کیمپ میں فوج کی تحویل میں بند رہنے کے بعد کوئٹہ اور مستونگ کی جیلوں میں مزید تین ماہ تک قید رہے۔ وقفے وقفے سے ان کی قید و بند کا سلسلہ 1964ء تک جاری رہا۔

کراچی بدر طلباء کی لائلپور آمد

ایوبی مارشل لاء کے خلاف طلباء کی سب سے پہلی آواز کراچی سے بلند ہوئی۔ اوائل 1961ء میں کراچی کے طلباء نے جلوس نکالنے کا اعلان کیا۔ حکومت نے طلباء کو آگاہ کیا کہ انہیں جلوس نکالنے کی اجازت نہیں ہے اور اگر انہوں نے جلوس نکالا تو انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ دوسرے دن طلباء کو کالج میں جمع ہونے دیا گیا۔ چنانچہ انٹر کالجیئیٹ باڈی کے عہدیداروں نے اعلان کیا کہ حکومتی پابندی کے سبب جلوس کا پروگرام منسوخ کر دیا گیا ہے۔ جب طلباء کالج سے باہر آ رہے تھے تو پولیس نے منتشر ہوتے طلباء پر لاٹھی چارج

کر دیا۔ لاٹھی چارج کے نتیجے میں پولیس اور طلباء کے درمیان پتھراؤ شروع ہو گیا۔ جلد ہی یہ تصادم پورے شہر میں پھیل گیا۔ جس میں عوام بھی طلباء کی حمایت میں نکل آئے۔ تین روز تک دست بدست لڑائی ہوتی رہی۔ چار سو افراد گرفتار کر لئے گئے، جن میں نصف گرفتار شدگان کو رہا کر دیا گیا۔ دو ہفتے بعد 30 مارچ کو فوجی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا تو آٹھ طلباء معراج محمد خان، علی مختار رضوی، فتح یاب علی خان، امیر حیدر کاظمی، انور احسن صدیقی، اقبال احمد میمن، شیر افضل ملک اور جوہر حسین کو 6 ماہ سے ایک سال تک قید با مشقت کی سزائیں دی گئیں۔ دو طلباء بری کر دیئے گئے۔ دوران تفتیش طلباء کو تھانوں میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا، سزاؤں کے بعد حکومت کے خلاف دوبارہ مظاہرے شروع ہو گئے۔ مظاہروں میں اس وقت مزید شدت آگئی جب سزا یافتہ طلباء کو کراچی سنٹرل جیل سے نا معلوم مقامات پر منتقل کر دیا گیا۔ افواہ پھیل گئی کہ طلباء کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔ اس افواہ کے شدت پکڑنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چند ماہ پیشتر لاہور کے قلعے میں حسن ناصر کو شہید کر دیا گیا تھا۔ 7 اپریل 1961ء کو مزار قائد اعظم پر گھوڑ سوار پولیس نے طالبات کے ایک جلوس کو روند ڈالا۔ وہ طلباء کی رہائی کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ پچاس سے زائد طالبات زخمی ہوئیں۔ تین ماہ تک قید تنہائی میں رکھنے کے بعد انہیں رہا کر دیا گیا۔ شامتِ اعمال، انہی دنوں کنونشن مسلم لیگ بن رہی تھی، طلباء پولو گراؤنڈ میں اس کا جلسہ دیکھنے چلے گئے۔ سید سعید حسن نے لڑکوں کو مختلف جگہوں پر بٹھا دیا۔ بھٹو صاحب آچکے تھے۔ ابھی ایوب خان نہیں آیا تھا۔ سعید حسن نے اچانک نعرہ بلند کیا، پکڑو بدمعاشوں کو۔ نواز بٹ کے بیان کے مطابق ''ہمارے ہاتھوں میں بینر تھے۔ انہیں ہاتھ میں پکڑے ہم نے سٹیج پر ہلہ بول دیا اور بھٹو کو پکڑ لیا۔ سعید حسن نے بھٹو کو زور دار تھپڑ مار کر نیچے گرا دیا۔ معراج محمد خان اور علی مختار رضوی تقریریں کرنے لگے۔ جلسہ اکھڑ گیا۔ ہم نے سوچا معاملہ ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے، ہم سب وہاں سے بھاگے۔ میں نے بینر ایک دوست کے کمرے میں چھپا دیئے اور رات کو گھر آگیا۔ صبح میرے سمیت بارہ لڑکوں کے شہر بدری کے احکامات آگئے۔ بارہ لڑکوں میں سب سے چھوٹا میں تھا۔ ہمیں کراچی، حیدرآباد، سکھر اور لاڑکانہ سے

نکالا گیا تھا۔ گویا، ہم سندھ میں نہیں رہ سکتے تھے۔ ہم نے لاہور کے لئے ٹرین پکڑی لیکن منٹگمری (اب ساہیوال) سٹیشن پر ہمیں اتار لیا گیا۔ اور بتایا گیا کہ ہم لاہور اور راولپنڈی ڈویژنوں میں داخل نہیں ہو سکتے۔ فتحیاب اور میں پشاور چلے گئے، معراج محمد کے بڑے بھائی کوئٹہ میں تھے۔ جوہر حسین کے والد پروفیسر کرار حسین بھی کوئٹہ میں تھے۔ جوہر حسین، معراج محمد خان اور دو تین لڑکے کوئٹہ نکل گئے۔ میں اور فتحیاب پشاور کے ایک ہوٹل میں چلے گئے۔ جب ہمارے پاس اتنے پیسے بھی نہ رہے کہ دس روپے ہوٹل کا کرایہ دے سکیں تو فتحیاب نے اعلان کیا کہ وہ معراج کے پاس کوئٹہ جا رہا ہے۔

نواز بٹ کے سیف خالد تک پہنچنے کے لئے ذرا صبر سے کام لینا ہوگا۔ فتحیاب کے چلے جانے کے بعد نواز بٹ نے مجبوری میں دو روپے روز کے منجی بستر والے ہوٹل میں ٹھکانہ کیا۔ باہر ہر وقت سی آئی ڈی کا پہرہ رہتا۔ ان کے والد سخت ناراض، پیسے بھیجنے کی بجائے کہتے معافی مانگ لو۔ ودود، جو بعد میں معروف بیرسٹر بنے نے معافی مانگ لی۔ والد نے انہیں لندن نکال دیا۔

ایک دن شیر افضل ملک کے والد دوست محمد ملک نواز بٹ کو ڈھونڈتے ہوئے اس ہوٹل پہنچے اور انہیں زبردستی اپنے بیٹے کے ہاں لے گئے۔ نواز بٹ نے چند روز شیر افضل کے ہاں قیام کیا۔ اس اثنا میں داخلے کھل گئے تو وہ پشاور یونیورسٹی جا پہنچے۔ وہاں ان کا پسندیدہ مضمون نہیں تھا۔ مجبوراً لاء میں داخلہ لے لیا۔

نواز بٹ کے والد غلام حیدر پرانے کانگرسی اور لاہور کانگریس کے صدر رہے تھے۔ تقسیم کے دنوں میں مسلمانوں نے انارکلی میں ان کی دکان کو آگ لگا دی تھی۔ ستمبر میں چھٹیاں ہو گئیں۔ لائلپور سے آغا جعفر نے لکھا کہ چھٹیوں میں لائلپور آجاؤ۔ نواز بٹ تیار ہو گئے تو شیر افضل کہنے لگا۔ میں بھی چلتا ہوں۔ راستے میں گاؤں اتر جاؤں گا۔ نواز، آغا جعفر کے پاس پہنچے اور اس کے ساتھ غلہ منڈی والے کمرے میں رات گزاری۔ اسی شام سیف خالد، شرافت اللہ، میاں محمود اور دو تین اور لوگوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں جہانگیر مرغ پلاؤ والے بڑے میاں بھی موجود تھے۔ انہوں نے مرغ پلاؤ

سے خوب تواضع کی۔ مرغ پلاؤ کی پلیٹ میں ایک شامی کباب بھی ہوتا تھا۔

دوسرے روز سیف خالد نواز بٹ کو اپنے گھر لے آئے۔

''اس میں ہماری پنجابی گردی کا بھی دخل تھا۔ جبکہ آغا جعفر ٹھیٹھ اردو سپیکنگ تھا۔ سیف کا گھر گلی وکیلاں میں تھا اس نے رہنے کے لئے ایک کمرہ مجھے دے دیا۔ ان کی بیگم بھی بہت اچھی خاتون تھیں، کمرے میں لینن اور سٹالن کے مکمل ورکس تھے۔ ابھی De-Stalinisation کے واقعات سامنے نہیں آئے تھے، شام کو نواز بٹ سے خوب بحث ہوتی۔ میاں محمود بھی اس گرما گرم بحث میں شریک ہو جاتے۔ ان کا گھر اسی گلی میں تھا۔ جتنی ہماری بحث ہوتی، اتنی ہی آپس میں محبت بڑھتی۔ میں کہتا کہ کل De-Stalinisation کرو گے۔ پرسوں مارکس کی نفی ہو جائے گی۔ سیف کہتا، کیا کریں۔لوگوں کو مطمئن بھی تو کرنا ہے۔ سٹالن نے قتل عام بھی تو بہت کیا تھا۔

''کیا انسان تھا سیف! ایک دن کہنے لگا 'چلو لاہور چلتے ہیں۔ میں نے کہا، ہمارے لاہور جانے پر پابندی ہے۔'

گھر کے دروازے کے باہر سی آئی ڈی کا آدمی بیٹھا رہتا تھا۔ سیف بولا۔ پچھلے دروازے سے نکلتے ہیں۔ ہم نکلے اور بس میں بیٹھ کر لاہور آگئے۔ وہاں پہلی بار سی آر اسلم سے ملاقات ہوئی۔ پنجاب میں سی آر اسلم سنٹرل کمیٹی کے ممبر تھے۔لائلپور والوں (سیف، شرافت اور میاں محمود) نے اپنی ایک ڈسٹرکٹ کمیٹی بنا رکھی تھی۔ میں سی آر اسلم سے جھگڑنے لگا۔'' آپ پارٹی کیوں نہیں بناتے۔ سندھ میں پارٹی ہے۔'' شہید حسن ناصر نے سندھ پارٹی کا تسلسل برقرار رکھا تھا۔ سیف نے لاہور کی خوب سیر کرائی۔ ہم اس کے لاہور والے فلیٹ میں نہیں گئے۔ 1951ء میں اسی فلیٹ سے سبط حسن گرفتار ہوئے تھے۔ کامریڈ لال خان سبطِ حسن کے نامہ بر تھے۔ لال خان کو پکڑ کر لے گئے۔ اصول یہ تھا کہ تین دن تک کوریئر نہیں آئے تو وہ جگہ چھوڑ دینی ہوتی ہے۔ تین دن تک لال خان پر تشدد ہوتا رہا تاوقتیکہ اس کی خاموشی کے وقفے سے فائدہ اٹھا کر سبط حسن اپنا ٹھکانا بدل لیں۔ چوتھے روز پولیس لال خان سے پتہ ٹھکانہ لے کر فلیٹ پر پہنچی۔ سبط حسن اور کہاں

جاتے۔ لاہور میں وہ کسی کو جانتے نہیں تھے، وہیں موجود رہے اور گرفتار کر لئے گئے۔

سیف خالد اور نواز بٹ دن بھر گھومتے گھامتے شام کو لائلپور واپس آگئے۔ ایک ماہ لائلپور رہنے کے بعد نواز بٹ پشاور چلے گئے۔

جنوری 1962ء میں سردیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو شیر افضل ملک نے کہا، گاؤں چلو، شکار کرتے ہیں۔ اس نے لائلپور سے آغا جعفر کو بھی بلا لیا۔ ہم نے چڑیاں وڑیاں ماریں، خوب انجائے کیا۔ شیر افضل کی سیف سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ وہاں میاں محمود بھی تھے۔ جب ان لوگوں کو پتہ چلا کہ شیر افضل سندھ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا رکن ہے تو ان پر اس کا کافی رعب پڑا۔ شیر افضل کو ان سے کافی احترام ملا۔ وہاں یہی بات ہوتی رہی کہ پارٹی بنائی جائے۔ اس اثناء میں شہر بدری کو گیارہ ماہ گزر گئے۔ نواز بٹ اور دوسرے ساتھیوں کی کراچی واپسی کا فیصلہ ہوا۔ ”میں ابھی پشاور میں تھا۔“ نواز بٹ نے ادھر اُدھر سے کتابیں لے کر قانون کے فرسٹ ائیر کا امتحان دیا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ لائلپور آگئے۔ آغا جعفر بھی کراچی واپس جانے کے لئے تیار تھے۔ نواز بٹ بتاتے ہیں۔

”دھوبی گھاٹ کے قریب ایک چھوٹا سا پارک تھا۔ سیف نے وہاں ہمارے اعزاز میں ایک جلسے کا اہتمام کیا۔ سامعین میں سو کے لگ بھگ لوگ تھے۔ سیف خالد، میاں محمود اور میں نے تقریریں کیں۔ یہ ایک مختصر سا مؤثر جلسہ تھا۔ اس کے بعد ہم کراچی چلے گئے۔“

تین چار ماہ ہی گزرے تھے کہ طلباء نے تین سالہ ڈگری کورس کے خلاف تحریک شروع کر دی اور ایک بار پھر بارہ طلباء فتحیاب علی خان، حسین نقی، سید سعید حسن، معراج محمد خان، خرم مرزا، نواز بٹ، واحد بشیر جوہر حسین، علی مختار رضوی، آغا جعفر، نفیس صدیقی اور امیر حیدر کاظمی کراچی بدر کر دیئے گئے۔ اس دفعہ انہوں نے اکٹھے شہر شہر جانے کی منصوبہ بندی کی۔ پہلے وہ حیدر آباد گئے اور خوب ہنگامہ آرائی کی۔ حیدر آباد سے نکالے گئے تو سکھر پہنچے، سکھر میں ہنگامہ کر کے نکالے گئے تو ملتان آگئے۔ ملتان میں ہنگامے کر کے نکلے تو سیدھا لائلپور کا رخ کیا۔ سب نے سیف خالد کے گھر یلغار کی۔ کل آٹھ لڑکے تھے۔ مسز شمیم سیف نے رات گئے ہمیں آلو کے پراٹھے بنا کر کھلائے۔ لائلپور میں بھی ہم نے جلسے

جلوس اور ہنگامے کیے۔ ہماری شکائتیں گورنر مغربی پاکستان نواب کالا باغ تک پہنچیں۔ نواب نے طفیل عباس کو بلا کر کہا کہ لڑکوں کے ہنگامے بند کراؤ۔ طفیل عباس نے جواب دیا، لڑکوں کی کراچی بدری ختم کر دیں، انہیں اپنے شہر کراچی جانے دیں۔ ہنگامے ختم ہو جائیں گے۔ چنانچہ ہماری شہر بدری کا حکم منسوخ ہوا اور صرف 33 روز بعد ہم کراچی واپس آگئے۔ اس بار ہم نے سیف پر زیادہ بوجھ ڈالا تھا۔ لیکن میں یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سیف کا دستر خوان بہت وسیع تھا اور زندگی بھر اسی طرح وسیع رہا۔

صدر ایوب نے مارچ 1962ء میں صدارتی نظام کے تحت ایک شخصی آئین مسلط کیا۔ عقیل عباس جعفری کے لفظوں میں صدر ایوب تمام اختیارات کا سرخیل تھا۔ آئین میں صدر کی حیثیت فیصل آباد کے گھنٹہ گھر کی سی تھی۔ جہاں ہر راستہ آکر ملتا تھا۔ اسی روز حبیب جالب کا شاعرانہ ردِ عمل نظم ''دستور'' کی صورت میں سامنے آگیا۔

میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا۔۔۔

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو، صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا
تم نے لوٹا ہے صدیوں ہمارا سکوں
اب نہ ہم پر چلے گا تمہارا افسوں
چارہ گر میں تمہیں کس طرح سے کہوں
تم نہیں چارہ گر، کوئی مانے مگر
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

فیض سے تعلقات

اگلے ہی روز 30اپریل کو فیض احمد فیض کے لئے لینن امن ایوارڈ کا اعلان سامنے آگیا۔ سیف خالد سمیت پاکستان کے ہر ترقی پسند کے لئے یہ خوشی سے بھرپور خبر تھی۔ سیف خالد شروع سے فیض کے بے حد مداح تھے 1949ء میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل پاکستان کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تو سیف ایک بیس سالہ نوجوان کے طور پر اس میں شریک تھے اور انہیں فیض صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ پھر جب 1951ء میں فیض راولپنڈی سازش کیس میں گرفتاری کے بعد سرگودھا اور لائلپور کی جیلوں میں قید تنہائی کی مشقت سے گزرے توان دنوں سیف خالد خودسی آئی ڈی کے چھاپوں کی زد میں تھے۔ اس اثناء میں انہیں روپوش ہونا پڑا۔ جب ایلس اپنی دونوں بیٹیوں میزہ اور سلیمہ کے ہمراہ فیض کی ملاقات کے لئے لائلپور آئیں تو بے بسی اور بے چارگی کے اس عالم میں سیف سیاسی بندشوں کے باعث ان کے لئے کچھ نہ کر سکے تھے لیکن اس کے بعد فیض جب جب لائلپور آئے، سیف کے لئے اور جہانگیر مرغ پلاؤ والے استاد فتح کیلئے فیض صاحب سے ملاقات بہت بڑے اعزاز کی بات تھی۔

کئی برس بعد 1976ء میں جب لائلپور میں فیض صاحب کی 65ویں سالگرہ منائی گئی تو سیف خالد اور فیض صاحب کے تعلق کے حوالے سے اشفاق بخاری کی کتاب ''فیض احمد فیض، چندنئی دریافتیں'' میں کئی قیمتی یادیں درج ہوگئی ہیں۔ اشفاق بخاری کے الفاظ میں:

> ''لائلپور کے حوالے سے فیض صاحب کی بساطِ یاراں میں شامل محمد اسحاق المعروف ساقی، سیف خالد ایڈووکیٹ،علی محمد خادم، رانا سخاوت علی رائے دوست محمد ایڈووکیٹ، رائے عبدالرزاق ایڈووکیٹ، رائے حفیظ اللہ، گویا یہی احبابِ فیض تھے۔۔۔

سالگرہ کی تقریب میں راقم الحروف نے بھی پنجابی میں فیض صاحب کے بارے میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ لیکن اس تقریب میں سیف خالد اور ان کی بیگم سیف خالد جس

طرح پیش پیش تھیں، ایسی وارفتگی کی غالباً کوئی دوسری مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ اشفاق بخاری ایک واقعہ کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں۔

''سٹیج سیکرٹری پروفیسر ارشاد احمد خان اور مضمون نگاروں کے خوبصورت تعارف و تبصرہ کے دوران شہر کے ایک مغنّی جیکسن گل کلام فیض سے اپنے سُر کا جادو جگاتے رہے۔ جیکسن گل سُر، تال اور لے سمجھنے والا ایک ابھرتا ہوا نوجوان تھا وہ بہت دھیمے سُروں میں گاتا تھا۔ اس کی آواز کی لے اور لوچ میں ایک فطری اور قدرتی سرگم تھا۔ ایسی آواز جو ہارمونیئم کے سُر سے ذرا بلند ہو کر غزل کی گائیکی کے لئے مثالی ہوتی ہے۔ جیکسن گل نے اس تقریب کے لئے بطور خاص ''دست صبا'' سے کلام چنا تھا۔ اس تقریب کی تیاری کے حوالے سے جیکسن گل کا یہ انداز تقریباً ایک ماہ سے یوں جاری و ساری تھا کہ وہ روزانہ صبح سویرے اپنے سازندوں کے ہمراہ سیف خالد کے کچہری بازار کی گلی میں واقع گھر پہنچ جاتا۔ جہاں ناشتے سے لے کر رات کے کھانے کے دوران وقفے وقفے سے فیض صاحب کے کلام کی دھنیں تیار کرتا۔ سیف خالد اور شمیم سیف خالد اس مہمان سے اس حوالے سے بہت خوش تھے کہ وہ بھی ان کی مانند فیض کی محبت کا اسیر ہے۔ جاتے ہوئے سیف خالد چپکے سے کچھ رقم جیکسن گل کی جیب میں ڈال دیتے۔ یہ لطیفہ بھی ان دنوں زبان زدِ عام تھا کہ جب سالگرہ کی تقریب اپنے اختتام کو پہنچی تو جیکسن گل نے سیف خالد سے کہا کہ جناب آئندہ کی سالگرہ فیض کی ابھی سے ریہرسل نہ شروع کر دی جائے۔''

آدھی رات کو تقریب اختتام کو پہنچی تو فیض صاحب کی سالگرہ کا کیک کاٹا گیا۔ اسٹیج سے تقریب کے خاتمے کا اعلان ہوا لیکن کوئی بھی اپنے اپنے گھر جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ جلد ہی شہر کے نوجوان شعرا ان کے گرد جمع ہو گئے۔ نوجوان شاعرات بھی اپنی جگہ چھوڑنے پر آمادہ نہ تھیں۔ اس محفل میں اسحاق ساقی، سیف خالد اور ان کی بیگم بھی شامل ہو گئے۔ جب یہ محفل چھٹی تو وہ اس قافلے کے ہمراہ اپنے میزبان ساقی کے گھر پہنچے۔ اگلے روز بھی فیض صاحب کے حوالے سے کئی پروگرام تھے۔ سیف خالد کم و بیش ہر تقریب میں موجود تھے۔ وہ فیض صاحب کے ہمراہ باری علیگ کے مزار پر بھی گئے۔

واپسی پر اسحاق ساقی کے گھر پھر محفل جمی، اسی اثناء میں جہانگیر مرغ پلاؤ والے' بھائی فتح' اخبار میں لپیٹے ہوئے کوئی شے (مرغ پلاؤ ہرگز نہ تھا) بغل میں دبائے اپنے مخصوص لدھیانوی سٹائل میں وارد ہوئے۔ فیض صاحب کے گھٹنوں کو چھوا۔ نذر پیش کی۔ جو ساقی صاحب اٹھا کر اندر لے گئے۔ نومبر 1976ء کی یہ تاریخی تقریب سیف خالد کو ہمیشہ یاد رہی اور وہ بھی زندگی بھر دوستوں سے اس کا ذکر کرتے رہے۔ اب واپس اپنی داستان کی طرف چلتے ہیں۔

نیشنل عوامی پارٹی کی بحالی

یکم جون 1962ء کو جب فیض صاحب لینن امن انعام وصول کررہے تھے تو 2 جون کو ان کے پرانے رفیق آزاد پاکستان پارٹی، پاکستان نیشنل پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کے بانی رہنما ترقی پسند سیاست دان میاں افتخار الدین انتقال کر گئے۔ 14 جولائی 1962ء کو سیاسی جماعتوں کی بحالی کا بل منظور ہوا جس کے نتیجے میں سیاسی جماعتوں کو اپنی بحالی اور سیاسی سرگرمیوں میں شریک ہونے کی اجازت مل گئی۔ کئی سیاسی پارٹیوں نے بحال ہوکر اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں لیکن نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) کی بحالی کے کوئی آثار ہی نہیں تھے۔ نیپ کہیں 1964ء میں جا کر بحال ہوئی۔ شمیم اشرف ملک کے بقول وہ اور سیف خالد نیپ کی فوراً بحالی کے زبردست حامی تھے۔ ادھر کراچی میں نواز بٹ بھی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے اس مہم میں شریک تھے واپس آکر انہوں نے کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ لیکن پارٹی نے انہیں پھر سیاسی سرگرمیوں کی طرف کھینچ لیا۔ جب 1964ء میں نیپ نے اپنی سیاسی سرگرمیاں شروع کیں تو نواز بٹ نیپ میں کام کرنے لگے۔ معراج محمد خان کے بڑے بھائی منہاج برنا نیپ کے انچارج تھے۔ نواز بٹ میاں محمود الحق عثمانی کے گھر آنے جانے لگے لیکن اس سے قبل ایک اہم پیش رفت ہوئی۔ نیپ ابھی بحال نہیں ہوئی تھی جب لائلپور سے سیف خالد اور میاں محمود احمد نواز بٹ

کے پاس کراچی آئے۔ یہ 1962ء کے آخری ایام تھے۔ سیف خالد نواز بٹ کے پاس پہنچے اور دونوں ایک چینی ریسٹوران 'اے بی سی ریسٹوران' میں اکٹھے کھانا کھانے کے لیے باہر نکلے، کھانا محمود احمد نے کھلایا۔ اس ملاقات میں اہم فیصلے ہوئے۔ 63-1962ء میں لائلپور کمیونسٹ پارٹی کے، سندھ کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ روابط قائم ہوگئے۔ اس وقت پنجاب میں پارٹی کا وجود نہیں تھا۔ اسی دوران روس۔ چین کے درمیان جھگڑے کا آغاز ہوگیا۔ سیف کا جھکاؤ واضح طور پر سوویت یونین کی طرف رہا جبکہ میاں محمود ڈھلمل یقین رہے، کبھی ادھر کبھی ادھر۔ سندھ پارٹی میں یہ تفرقہ بڑھنے لگا۔ منہاج برنا اور طفیل عباس کا جھکاؤ چین نوازی کی طرف تھا۔ شیر افضل ملک سوویت نواز تھے۔ اس اثناء میں جمال نقوی حیدر آباد سے کراچی آگئے اور پارٹی میں خاصے فعال ہو گئے۔ روس، چین کی تقسیم بڑھتی جا رہی تھی۔ اس میں زیادہ رول شیر افضل ملک کی طنزیہ گفتگو نے ادا کیا۔ اس وقت تک رشید حسن خان اور معراج محمد سوویت نواز تھے۔ لوگوں کے خلاف شیر افضل کی شخصی فقرے بازی نے روس چین تنازعے کو بڑھا دیا۔ حالانکہ ساری این ایس ایف اس کی شاگرد تھی۔

ایک روز رشید حسن خان نواز بٹ کے گھر آیا۔ اس نے تنگ جینز پہن رکھی تھی۔ شیر افضل نے اسے دیکھ کر فقرے بازی شروع کر دی۔ اس پر رشید حسن خان بگڑ گیا اور چینی دھڑے میں شامل ہوگیا۔ شیر افضل کے رویے سے تنگ آکر معراج محمد خان اور اختر حسین بھی چین نواز ہو گئے۔ حالت یہ ہوگئی کہ این ایس ایف کے سوویت نواز دھڑے کے پاس صدارت کیلئے کوئی بندہ نہیں تھا۔ جو ہر حسین بھی بھاگ گیا چنانچہ امیر حیدر کاظمی کو این ایس ایف کا سربراہ بنانے کا فیصلہ ہوا۔ اب نواز بٹ، م۔ ر۔ حسان، انور احسن صدیقی اور شیر افضل ملک (سیکرٹری) کی جمال نقوی کے تحت ایک ڈسٹرکٹ کمیٹی تشکیل پائی۔ شیر افضل اپنی مذاق اڑانے کی عادت سے باز نہ آیا۔ نواز بٹ نے پارٹی سے اس کی شکایت کر دی۔ جمال نقوی نے اسے پارٹی سے نکالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انور احسن صدیقی بھی معاملات سے دل برداشتہ ہوکر پارٹی چھوڑ گیا۔

نیشنل عوامی پارٹی کی بحالی کے لئے پارٹی رہنما دو دھڑوں میں بٹ چکے تھے۔ ایک دھڑا پارٹی کی فوری بحالی کا حامی تھا جب کہ ایک دھڑا اس عمل سے پہلو تہی کر رہا تھا۔نیپ کے پرانے کارکن اور مورخ چودھری ظفر اندر کی کہانی سناتے ہیں:

اگست 1963 کی ایک صبح مولانا بھاشانی مشرقی پاکستان سے راولپنڈی پہنچے۔ اس بار پارٹی کے کارکن ان کی آمد سے بے خبر تھے۔ وہ بہت حیران ہوئے جب انہیں خبر ہوئی کہ مولانا بھاشانی راولپنڈی کے ہوٹل فلیشمین میں قیام پذیر ہیں۔

چودھری ظفر علی کے بیان کے مطابق: ''اس سے پہلے وہ جب بھی یہاں آتے تھے تو مصنف کو میزبانی کا شرف عطا کرتے تھے۔ہوٹل کے باہر پاکستانی اور غیر ملکی اخباری رپورٹروں کا جم غفیر جمع تھا جب مولانا جنرل ایوب خان کو ملنے گئے ہوئے تھے۔واپس آئے تو سب سے پہلے صحافیوں سے گفتگو کی۔'' صحافیوں نے مذاکرات کے بارے میں استفسار کیا تو بولے:

''مذاکرات کی کوئی بات نہیں ہوئی میں بولتا رہا وہ خاموش سنتے رہے۔ اللہ اللہ خیر سلاّ۔'' کمرے کے اندر گئے۔ اطمینان کا سانس لیا تو کارکنوں نے پوچھا''بابا سچ سچ بتاؤ بات کیا ہے؟'' بولے،''اس (ایوب خان) نے مجھے چین جا کر ماؤ سے ملنے کو کہا ہے''یہی پیغام انہیں گورنر مغربی پاکستان امیر محمد خان پہلے سے پہنچا چکے تھے۔ ایوب خان سے ملاقات کا اہتمام بھی انہوں نے ہی کرایا تھا''اکتوبر میں وہ ایک نیم سرکاری وفد لے کر پاکستان سے پیکنگ روانہ ہو گئے جہاں ان کی ملاقات ماؤزے تنگ اور چو این لائی سے ہوئی جنہوں نے انہیں ایوب خان کے بارے میں نرم روی اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔

''(پاکستان میں فوجی حکمرانی یا عوامی قوت)'' طارق علی۔

مولانا بھاشانی کی چین میں کمیونسٹ انقلاب کے بانی ماؤزے

تنگ سے عالمی مسائل پر تفصیلی گفتگو ہوئی تھی تاہم نیشنل عوامی پارٹی اپنی جملہ حکمت عملی پالیسی کے تابع فرمان بنانے پر آمادہ نہ تھی۔ اس کے ترقی پسند عناصر بلاشبہ خارجہ پالیسی اور ریڈیکل اقتصادی اصلاحات کو باقی سب امور پر ترجیح دیتے تھے لیکن صوبائی خودمختاری کے حامی اور ون یونٹ کے مخالف ون یونٹ کی تنسیخ اور صوبائی خودمختاری کے سوا کسی مسئلہ پر بات کرنے یا سننے کے روا دار نہ تھے۔ اس کے علاوہ روس و چین کے اختلافات اپنی سرحدوں سے باہر نکل کر عالمی اشتراکی تحریک کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تو نیشنل عوامی پارٹی کے اندر سوشلسٹ عناصر بھی پارٹی میں پھوٹ ڈالنے سے گریزاں نہ ہوئے۔ بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک میں موجود چین و روس کے اختلافات 1964ء تک سامنے آگئے تھے۔

مولانا بھاشانی چین کے دورہ سے چین سے ہمدردانہ رجحانات لے کر لوٹے تھے۔ اس وقت تک این اے پی کی بحالی عمل میں نہیں آئی تھی۔ جنوری 1964ء میں پارٹی کو بحال کرنے کے حق میں کارکنوں نے پشاور میں اجلاس منعقد کیا۔ جہاں پارٹی کا سنجیدہ ذہن جلد بازی میں کسی فیصلہ پر پہنچنے کی راہ میں حائل ہو گیا۔

جب تک سب رجحانات پارٹی بحال کرنے پر رضامند نہ ہوئے اسے بحال کرنے سے اجتناب برتا گیا۔ تاہم 28۔29 فروری 1964ء کو باہمی افہام وتفہیم سے پارٹی بحال کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

چودھری ظفر علی کے مطابق: 1964ء کے اجلاس میں سب سے اہم فیصلہ نیپ کی نظریاتی اساس میں تبدیلی رونما کرنے کا تھا۔ 1957ء میں پارٹی قائم کرتے وقت پاکستان میں ریاست کو فلاحی مملکت بنانے کا تصور پیش کیا گیا تھا۔ اب اس میں ترمیم کر کے فلاحی کی جگہ ''سوشلسٹ

ریاست'' کے الفاظ درج کر دیئے گئے۔ پاک بھارت جنگ 1965ء
میں شروع ہوئی تھی اور سترہ دن بعد اعلان تاشقند پر انجام پذیر ہوئی
تھی۔ مغربی پاکستان میں تاشقند معاہدہ کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا
ہوا تھا۔ نیپ نے اس کا کوئی اثر قبول نہ کیا بلکہ ڈنکے کی چوٹ پر تاشقند
معاہدہ کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ ان ہی دنوں عوامی لیگ نے چھ نکاتی
نصب العین کا اعلان کیا تو بھاشانی اور محمد طہٰ نے کھل کر ان کے خلاف
بیانات دیئے۔ پاکستان کو مسائل در مسائل الجھتے دیکھ کر مولانا بھاشانی
نے ان کا دقیق جائزہ لینے کے لئے چھ رکنی کمیٹی قائم کر دی جس نے
نیپ کی 6، 4 جون کو منعقد سنٹرل کمیٹی کے سامنے اس رائے کا اظہار کیا
کہ پاکستان کے سب مسائل کا حل سوشلزم میں ہے جس پر عمل پیرا
ہونے کے لئے ملک میں جمہوریت قائم کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ اسی
اجلاس میں ویت نام کے مسئلہ پر امریکہ کی مذمت کا ایک بار پھر کھل کر
اعلان کیا گیا اور حکومت سے استدعا کی گئی کہ وہ ویت نامی حریت
پسندوں کی مدد کے لئے نیپ کو اپنے دس ہزار رضا کار ویت نام بھیجنے کی ا
جازت دے (روزنامہ ڈان مورخہ 11 جولائی 1964ء)

سیف خالد ان تمام مباحث سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے تھے۔ جیسے کہ بعد میں
انہوں نے راقم الحروف سے کئی بار ان مباحث پر اپنی رائے پیش کی۔ وہ اس تمام عرصے
میں نواز بٹ اور کراچی کے دیگر ساتھیوں سے مسلسل رابطے میں تھے۔ وہ پوری ثابت قدمی
سے نیپ میں روس نواز سیاست سے جڑے رہے۔ اس عرصہ میں ان کا شمیم اشرف ملک
سے بھی مسلسل تبادلہ خیالات ہوتا رہا جبکہ ان کے پرانے ساتھی میاں محمود احمد کا جھکاؤ چین
نواز سیاست کی طرف ہوتا چلا گیا۔ دیگر ساتھیوں میں لاہور سے سی آر اسلم اور ملتان سے
قسور گردیزی بھی چینی سیاست کی جانب مائل ہوتے چلے گئے۔ سیف خالد نے لائلپور اور
لاہور میں اپنے ان ساتھیوں سے مسلسل بحثیں کیں جیسا کہ کراچی کی صورت حال میں ہم

نے دیکھا۔ روس۔ چین تفرقہ نظریاتی سے زیادہ شخصی تناؤ کا شاخسانہ تھا جس پر سیف خالد اپنے دھیمے لہجے کو برقرار نہ رکھ پائے اور کئی بار برہمی کا اظہار کرتے۔ ان کا کہنا تھا کہ چینی لائن دراصل ایوب خان کی طرف جھکنے کی خاطر بہانے کے لئے اپنائی جا رہی تھی۔

18 جنوری 1964ء کو مغربی پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کا پہلا سرکلر لاہور سے جاری ہوا جس میں کہا گیا کہ نیشنل عوامی پارٹی، اسی صورت میں پاکستان کی تعمیر و ترقی اور اسے آزاد جمہوری اور خوشحال ملک بنانے کا تاریخی رول ادا کر سکتی ہے جب وہ نظریاتی لحاظ سے متحد اور تنظیمی لحاظ سے مضبوط ہو۔ نظری یک جہتی اور تنظیمی مضبوطی کے بغیر پارٹی کا پروگرام عوام تک نہیں پہنچایا جا سکتا اور نہ ہی پارٹی کے پروگرام کی بنیاد پر عوام کو متحرک اور منظم کیا جا سکتا ہے۔

سرکلر میں بتایا گیا کہ مغربی پاکستان نیپ کا مرکزی دفتر لاہور میں قائم کیا گیا ہے جو دیگر صوبائی شاخوں سے رابطے میں رہے گا۔ سرکلر مغربی پاکستان نیپ کے جنرل سیکرٹری محمود علی قصوری کے نام سے جاری کیا گیا تھا جس میں کئے جانے والے مطالبات سے پارٹی پالیسی کی وضاحت ہوتی تھی۔ پہلا مطالبہ سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں کی رہائی کا تھا۔ مغربی پاکستان کے صدر عبدالغفار خان خرابیٔ صحت کے باوجود ابھی تک رہا نہیں کئے گئے تھے۔ دوسرا مطالبہ بالغ حق راء دہی اور صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے براہ راست انتخابات کا تھا۔ کہا گیا کہ جمہوریت کی بحالی اور فروغ اور حفاظت عوام کو بالغ رائے دہی کا حق دیئے بغیر نہیں ہو سکتی اور نہ ہی صوبائی اور مرکزی اسمبلیاں صحیح معنوں میں عوام کی نمائندگی کر سکتی ہیں۔ تیسرے مطالبے کا تعلق پاکستان کی قومی آزادی اور عالمی امن و سلامتی سے تھا۔ چوتھے مطالبے میں کہا گیا کہ سب سے بنیادی مسئلہ ملک کے اندر صحیح قسم کی جمہوریت اور آئین میں مناسب تبدیلیوں کا تھا۔ 1962ء کے آئین نے پاکستان کے حقیقی حکمرانوں یعنی دس کروڑ عوام کو ان کے حقوق نہیں دیئے۔

سرکلر کے آخر میں کہا گیا کہ ان چاروں مطالبات کو عوام کی صفوں میں لے جانے کے ضروری اقدامات کئے جائیں۔

بحالی کے وقت نیپ متحد تھی اور اسے متحد رکھنے کی کوششیں جاری تھیں۔ 1957ء سے اس نے ون یونٹ کے خلاف اصولی مؤقف اپنا رکھا تھا۔ اس لئے نیپ کی بحالی کے دنوں میں ہی مغربی پاکستان نیپ کے ساتھ ساتھ اس صوبائی سطح پر نیشنل عوامی پارٹی پنجاب و بہاولپور بھی قائم کر دی گئی، جس کے جنرل سیکرٹری سی آر اسلم مقرر کئے گئے۔ ان کی جانب سے 28 جنوری 1964 کو سرکلر نمبر 7 جاری ہوا جس میں کم و بیش وہی مسائل بیان کئے گئے تھے جو مغربی پاکستان نیشنل عوامی پارٹی نے بیان کئے تھے اس میں بنیادی جمہوریتوں کے نظام پر تنقید کرتے ہوئے حق بالغ رائے دہی اور اسمبلیوں کے براہ راست انتخابات پر زور دیا گیا تھا۔ کہا گیا کہ حق بالغ رائے دہی کے بغیر جمہوریت کا سنہرا خواب نامکمل رہتا ہے اور جمہوریت کی بحالی، استقامت اور فروغ ناممکن ہوتا ہے۔ کوئی بھی جمہوری ملک ہر بالغ کو ووٹ کا حق دیئے بغیر جمہوری کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا۔ ہر پاکستانی شہری کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران کا انتخاب کرے۔ اس طرح براہِ راست انتخاب سے نہ صرف اسمبلیاں جمہوری ہوں گی بلکہ اس سے شہریوں کی سیاسی تعلیم بھی ہوگی اور جب ممبران یا سیاسی جماعتیں مقررہ مدت کے بعد ووٹ لینے کی غرض سے عوام کے پاس جائیں گی تو وہ ان کے گزشتہ اعمال، کردار اور کارکردگی کا محاسبہ کرسکیں گے اور عوام صرف انہی سیاسی جماعتوں اور ان کے پروگراموں کا ساتھ دیں گے، جو ان کے مفادات اور خواہشات پر پوری اتریں گی۔ عوام اس وقت یہ بھی دیکھیں گے کہ وہ کون سی سیاسی جماعتیں ہیں جنہوں نے اپنے پروگرام پر عمل کیا ہے اور اپنے وعدے پورے کئے ہیں۔ بعینہٖ یہی مؤقف 1957 میں نیپ نے اپنے منشور میں اپنایا تھا۔

اس مسئلے کی مزید تشریح کرتے ہوئے کہا گیا کہ حق بالغ رائے دہی سے انتخابات میں ووٹ خریدنے، بوگس ووٹ ڈالنے اور دباؤ استعمال کرنے کے مواقع بھی بہت کم ہوتے ہیں۔۔۔ اگر ہم نے اس حق کے حاصل کرنے کے لئے عوام کو متحرک نہ کیا تو اس بات کا قوی احتمال ہے کہ براہ راست انتخابات کی جگہ بالواسطہ انتخابات کا طریقہ اختیار کیا

جائے اور اس طرح پاکستان کے عوام اپنے اس بنیادی حق سے محروم ہو جائیں اور درحقیقت یہی ہوا کہ 1964ء کا صدارتی انتخاب بالواسطہ طریقے سے منعقد ہوا۔

اس سرکلر میں تین دیگر مسائل کی نشاندہی بھی کی گئی تھی۔ دوسرا مسئلہ سیاسی نظر بندوں اور قیدیوں کی رہائی، ان پر عائد شدہ جرمانوں کی واپسی اور ضبط شدہ جائیدادوں کی واگزاری کے سوال سے عبارت تھا۔ نیشنل عوامی پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں کو نظر بند اور قید بھی رکھا جا رہا تھا۔ ان کی جائیدادیں بھی ضبط کی گئی تھیں اور ان پر بھاری جرمانے بھی عائد کئے گئے تھے۔

تیسرا مسئلہ ساتویں امریکی بحری بیڑے کو بحر ہند میں بھیجنے کا تھا۔ جس کی بحرِ ہند میں آمد سے خطے کے ملکوں کی آزادی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ یہ بحری بیڑہ انڈونیشیا، سیلون (سری لنکا) برما، عرب ممالک اور پاکستان پر دباؤ ڈالنے کے لئے آرہا تھا۔ اس کی آمد کا مقصد امریکی سامراجی مفاد کی حفاظت اور جنوبی ویت نام، کمبوڈیا، لاؤس، ملائشیا اور دیگر ممالک کی قومی آزادی کی تحریکوں کو کچلنے کے سوا کچھ نہ تھا۔

چوتھا مسئلہ ملک میں مکمل جمہوریت سے متعلق تھا، یہ ایک تلخ حقیقت تھی کہ 1962ء کے آئین میں دس کروڑ پاکستانی عوام کو جمہوریت کے بنیادی حقوق حاصل نہیں تھے۔ یہاں پہلے نکتے کو دہراتے ہوئے کہا گیا کہ کوئی بھی حکومت اور ملک کی اسمبلیاں، جوعوام کی براہِ راست نمائندہ نہ ہوں، عوام کی صحیح ترجمانی نہیں کرسکتیں۔ انتظامیہ مضبوط اور عدلیہ آزاد ہو۔ قانون سازی کے تمام فرائض پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیاں سرانجام دیں۔ 1962ء کے آئین کے تحت قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران کو کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔ عوام کو دیئے گئے بنیادی حقوق ناکافی تھے۔ ان میں شخصی آزادی کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ نظر بندی کے اختیارات جابرانہ طریقے پر وسیع کر دیئے گئے تھے۔ کوئی بھی آئین جوانسانیت اور انصاف کے تقاضوں کو پورا نہ کرتا ہو، قابل قبول نہیں سمجھا جاسکتا۔

پنجاب۔ بہاولپور کی صوبائی نیپ نے دوبارہ اپنے کام کا آغاز کیا۔ سی آر اسلم کمیونسٹ پارٹی کے انتہائی سینئر اور معتبر رہنما تھے۔ بحالی کے دنوں سے نیشنل عوامی پارٹی

پنجاب بہاولپور کو ان کی رہنمائی نصیب ہوئی۔ 18 فروری 1964ء کو انہوں نے سرکلر نمبر 8 جاری کیا۔ جس میں اطلاع دی گئی کہ بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات سال کے آخر تک ہوں گے۔ اگر چہ نیپ براہ راست انتخابات کی حامی تھی جس کی وضاحت سرکلر 7 میں کر دی گئی تھی تاہم نیپ کا یہ بھی خیال تھا کہ یہ انتخابات عوام تک جانے کا ایک موقع فراہم کر رہے ہیں اس لئے اس موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

نیشنل عوامی پارٹی کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کے پروگرام پر عمل کر کے ہی بے مالک اور چھوٹے مالک کسانوں کو زمین مل سکتی ہے کاشتکاروں کا مالیہ اور آبیانہ کم ہو سکتا ہے، انہیں عمدہ بیج اور سستی کھاد مہیا ہو سکتی ہے۔ ان کی پیداوار کی انہیں معقول قیمت مل سکتی ہے۔ دیہاتی اور شہری زندگی کا فرق مٹ سکتا ہے۔ تعلیم اور طبی امداد کا مناسب انتظام ہو سکتا ہے۔ عوام کو ضروریاتِ زندگی سستے داموں مہیا ہو سکتی ہیں۔ مزدوروں کو اجتماعی سودا بازی کا حق کم از کم بنیادی اجرت، رہائش کے لئے مکان، بچوں کی فنی تعلیم، کام اور رخصت کی سہولتیں مل سکتی ہیں۔ رشوت، چور بازاری اور خویش پروری کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ تعلیم قومی ضروریات کے مطابق عام اور سستی ہو سکتی ہے۔ بے کاری دور ہو سکتی ہے۔ ہر شہری کو ترقی کے یکساں مواقع میسر آ سکتے ہیں۔ عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق مل سکتے ہیں۔ ملک کی صنعتی ترقی ہو سکتی ہے اور معاشی انصاف کا خواب پورا ہو سکتا ہے۔ تہذیبی پستی دور ہو سکتی ہے۔ اتحاد، پیار اور باہمی تعاون کی فضا پیدا ہو سکتی ہے اور ایسے سماج کی داغ بیل پڑ سکتی ہے جس میں سچا انصاف اور سچی خوشی ہر شہری کو ملے گی۔ اور کوئی انسان کسی انسان کی محنت پر ڈاکہ نہ ڈال سکے گا۔

کم و بیش یہی باتیں تھیں جو 1970ء کے عام انتخابات سے پہلے سیف خالد مجھ سے اکثر کیا کرتے تھے۔ وہ بتایا کرتے کہ صرف ہماری پارٹی ہی ایسا انسان دوست پروگرام دے سکتی تھی۔

مجھے یاد ہے، اسی طرح کی گفتگو کے دوران میں نے پوچھا کہ پنجاب میں ہم

حبیب جالب کا صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑ رہے ہیں کیا ہم یہ انتخاب جیت جائیں گے۔ میرے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر نہایت دھیمے لہجے میں بولے۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ حبیب جالب کے انتخاب کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ اہم بات یہ ہے کہ اس عمل سے ہم اپنے کارکنوں کی زبردست تربیت کر رہے ہیں۔ اگر ہم یہ انتخاب جیت جاتے ہیں تو پنجاب میں ایک سیٹ جیت کر ہم کوئی بڑا فرق پیدا نہیں کر سکیں گے۔ دراصل ساری اہمیت سیاسی عمل کی ہے۔''

مجھ پر ان کی اس بات کا زبردست اثر ہوا تھا اور میں پہلے سے بھی زیادہ جوش و جذبے سے جالب کے الیکشن میں کام کرنے لگا۔ میرا زیادہ وقت ان کے مال روڈ کے کمرے میں گزرتا یا جالب کے جلسوں میں۔

1964ء کے دوران ہی نیپ کے حلقوں میں روس۔چین کے درمیان اختلافات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ انتخابات کا سال بھی تھا۔ ایوب خان کو میدان سے باہر کرنے کے لئے ایک مضبوط صدارتی امیدوار کی ضرورت تھی۔ کئی امیدواروں کے نام سامنے آئے بالآخر فاطمہ جناح کے نام پر اتفاق کر لیا گیا۔ نیپ نے بالعموم اور سیف خالد نے بالخصوص بڑھ چڑھ کر مادرِ ملت کے حق میں کام کیا اور گرفتار بھی ہوئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس تمام عرصے میں مولانا بھاشانی اپنے آشرم سے باہر نہ نکلے۔ ان پر ایوب خان کی حمایت سمیت طرح طرح کے الزام لگے، جواب تاریخ کا حصہ ہیں۔

ایوب خان کا انتخابی نشان گلاب کا پھول اور فاطمہ جناح کا انتخابی نشان لالٹین تھا۔ سیف خالد لالٹین کی مہم میں اپنا تن، من، دھن لٹا کر شریک تھے۔

فاطمہ جناح کیسے ہاریں۔ کراچی اور مشرقی پاکستان کے بڑے حصے میں ایوب خان کو شکست ہوئی لیکن وسیع پیمانے پر جھرلو پھیر کر ایوب خان کو فتح دلائی گئی۔ کراچی میں اسے ووٹ نہ دینے پر ایوب خان نے عوام سے انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ ہزارہ سے کراچی لا کر متعدد ٹرکوں کی قیادت ایوب خان کے بیٹے گوہر ایوب نے کی۔ کراچی کی سڑکوں پر

بیدریغ گولیاں چلیں۔ متعدد شہری ہلاک ہو گئے۔ 4 جنوری 1965ء کے اس مسلح حملے کو جشن فتح کا نام دیا گیا۔

واقعات کے مطابق 4 جنوری کو کیپٹن گوہر ایوب خوشی سے ہوا میں گولیاں چلاتا ایک جیپ میں نظر آیا۔ شہر میں پہلے سے دفعہ 144 لگی ہوئی تھی۔ جب یہ جلوس لالو کھیت (لیاقت آباد) کی سڑکوں سے گزرا تو فائرنگ سے کئی لوگ ہلاک ہو گئے جنہیں آج بھی شہدائے لیاقت آباد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس روز ہزارہ کے حملہ آوروں نے لیاقت آباد سمیت کئی بستیوں پر حملے کئے۔ مقامی آبادی نے رات بھر مقابلہ کیا۔ زخمیوں کو ہسپتال پہنچایا گیا۔ اگلے روز شہر میں فوج طلب کر لی گئی۔ پولیس کے مطابق چھ لوگ ہلاک ہوئے۔ بعد ازاں یہ تعداد بیس بتائی گئی۔ لیکن عام خیال یہ تھا کہ سرکاری تعداد کے مقابلے میں کہیں زیادہ لوگ مرے تھے۔ اس حادثے کے نتائج جانی اور مالی نقصان سے زیادہ ثابت ہوئے۔ پٹھان اور مہاجر آبادی کے درمیان مستقل دشمنی کا بیج بو دیا گیا۔ بعد ازاں یہ وضاحت سامنے آئی کہ جب گوہر ایوب اپنے جلوس کو لے کر لیاقت آباد سے گزرا تو لوگوں نے اس پر پتھراؤ کیا تھا۔ جس پر اس کے بپھرے ہوئے حامی قابو سے باہر ہو گئے اور اسی رات اپنی توہین کا بدلہ لے لیا۔ اس حملے کے اسباب بھی شائع نہیں کئے گئے لیکن کہا جاتا ہے کہ اگر اہل ہزارہ وہ جلوس لے کر نہ نکلتے تو نسلی فسادات بھی نہ ہوتے۔

اس سانحہ کے اسباب جاننے کے لئے ایک شہری کمیٹی بنائی گئی جس میں محمود الحق عثمانی اور فیض احمد فیض شامل تھے۔ راقم الحروف ان دنوں عبداللہ ہارون کالج کا طالب علم تھا۔ اس کالج کے پرنسپل فیض احمد فیض تھے۔ م۔ ر۔ حسان اسی کالج میں وائس پرنسپل تھے۔ فیض اس سانحہ پر بے حد دکھی تھے۔ ان سے جو بھی ملنے آتا۔ وہ پر زور لفظوں میں اپنے دُکھ کا اظہار کرتے ''لہو کا سراغ'' کے عنوان سے ان کی ایک نظم سامنے آئی۔ مجھے اس نظم کی خبر ماہنامہ 'افکار' میں سحر انصاری سے ملی۔ سحر انصاری اس اثناء میں فیض صاحب سے ہارون کالج میں ملاقات کر چکے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر اس نظم کا یہ شعر تھا۔

نہ مدعی، نہ شہادت، حساب پاک ہوا

یہ خونِ خاک نشیناں تھا، رزقِ خاک ہوا

اب یہ نظم فیض کے شعری مجموعے "سرِ وادیِ سینا" میں موجود ہے اور ہر خاص و عام کو دستیاب ہے۔ اپنے تناظر کے باعث اس نظم کو یہاں دہرانے کو جی چاہتا ہے۔

کہیں نہیں ہے، کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ دست و ناخنِ قاتل، نہ آستیں پہ نشاں
نہ سرخیِ لبِ خنجر، نہ رنگِ نوکِ سناں
نہ خاک پر کوئی دھبا، نہ بام پر کوئی داغ

نہ صرفِ خدمتِ شاہاں کہ خوں بہا دیتے
نہ دیں 'کی نذر' کہ بیعانہ جزا دیتے
نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا
کسی علم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا
پکارتا رہا بے آسرا یتیم لہو
کسی کو بہرِ سماعت نہ وقت تھا نہ دماغ

نہ مدعی نہ شہادت، حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

اسی مہینے اس موضوع پر فیض نے ایک قطعہ لکھا جو اسی کیفیت کا حامل تھا۔ ایک طرف سیکڑوں گرفتاریوں سے زنداں آباد ہو گئے۔ دوسری طرف قلقلِ مے کا شور بپا تھا۔

زنداں زنداں شورِ اناالحق، محفل محفل قلقل مے
خونِ تمنا در یا دریا، در یا دریا عیش کی لہر
دامن دامن رُت پھولوں کی، آنچل آنچل اشکوں کی
قریہ قریہ جشن بپا ہے، ماتم شہر بہ شہر

فیض نے اس قطعہ کے نیچے یہ نوٹ لکھا کہ گلاب کا پھول، سابق صدر ایوب خان کا انتخابی نشان تھا، اسی لئے انہوں نے کہا:

دامن دامن رُت پھولوں کی، آنچل آنچل اشکوں کی

فاطمہ جناح کے انتخابی معرکے میں سیف خالد لاہور میں تھے۔1962ء میں وہ وکالت چھوڑ کر لائلپور سے لاہور آ گئے تھے۔ ان کے والد پہلے سے لاہور میں تھے۔ وہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کے پریس انچارج تھے اور لاہور کے علاقے راج گڑھ میں مقیم تھے۔ جب 1963ء میں سیف کے والد کا انتقال ہو گیا تو بھی وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ لاہور میں ہی رہتے رہے۔ لاہور میں انہوں نے کسی حد تک وکالت کا پیشہ اپنایا، کچھ دوسرے کام بھی کئے۔ اس عرصہ میں وہ کبھی کبھار کراچی بھی چلے جاتے۔ اس دوران انہوں نے چھوٹے چھوٹے کاروبار کئے۔ 1965ء میں وہ لائلپور واپس چلے گئے اور وکالت کی طرف رجوع کیا۔ ان کے فرزند ندیم خالد کے مطابق انہیں وکالت میں پہلے جیسی کامیابی نہیں ملی۔ کاروبار کی طرف رجوع کیا۔ انہوں نے جوتوں کے کاروبار میں عبدالرزاق اور میاں زاہد سرفراز کے ساتھ شراکت کی لیکن بنیادی طور پر وہ کاروبار کے آدمی نہیں تھے۔ سیاست ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ اسی کے ہو رہے۔ ندیم مزید بتاتے ہیں۔ کہ آگے چل کر ان کی والدہ نے روسی ٹی وی کا کاروبار شروع کیا جو کافی کامیاب رہا۔ ٹی وی روس سے درآمد کئے گئے۔ ایک ٹی وی -/800 روپے میں پڑتا تھا۔ اور گاہک کو -/900 روپے میں فراہم کیا جاتا تھا۔ حسین نقی بتاتے ہیں کہ سیف سے کافی

گہرا تعلق بن گیا تھا۔ انہوں نے رزاق سے سات نمبر کا جوتا دلایا جو دس گیارہ سال میں بھی نہیں پھٹا۔اور -/900روپے کا ٹی وی تو انہوں نے مفت لگا کر دیا۔ آئی اے رحمان کی بھی یہی رائے ہے کہ سیف خالد کاروباری ذہن کے حامل نہیں تھے۔ حتیٰ کہ سوویت یونین سے بھی انہوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ البتہ انہوں نے رزاق کو ضرور آگے بڑھایا۔ زاہد سرفراز کی بھی کاروبار میں مدد کی ایسا لگتا ہے کہ ان کا اشتراک اپنے پارٹنرز کو فائدہ پہنچانے کی حد تک تھا۔ وہ کھڑ پینچ دانشور تھے۔ ان کے ہاتھ میں ہر وقت کوئی نہ کوئی کتاب، اخبار، رسالہ ضرور ہوتا تھا۔ جتنے بھی کھڑ پینچ تھے، وہ رحمان صاحب کے علم سے متاثر تھے۔ غالباً اسی لئے سیف آئی اے رحمان سے بحث نہیں کرتے تھے۔ ساٹھ کی دہائی میں اپنے قیام لاہور میں ان کا نقی بلڈنگ میں جمگھٹا رہا کرتا تھا۔ اس گروپ میں شمیم اشرف ملک، امتیاز شاہ اور امین مغل سمیت بائیں بازو کے بہت سے سیاسی کارکن اور دانش ور شامل تھے۔ ان سب کا ملنا جلنا اور یارانہ تھا۔ آئی اے رحمان کا کہنا ہے کہ یہ سب لوگ مجھے لیفٹ کے بارڈر پر سمجھتے تھے اور میں اس پر مطمئن تھا۔

اسی زمانے میں پاک۔ سوویت فرینڈ شپ سوسائٹی کو فروغ حاصل ہوا۔ اور بھی فرینڈشپ سوسائٹیاں بنیں۔ پاک بلغارین فرینڈشپ سوسائٹی بھی بنی۔ 1965ء کے بعد جب وہ لائلپور واپس آگئے تو انہوں نے پاک سوویت فرینڈ شپ سوسائٹی کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ندیم خالد کے مطابق: ''پاک سوویت فرینڈ شپ سوسائٹی پاکستان کے دوسرے شہروں میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھی ہوئے تھی لیکن لائل پور کی شاخ زیادہ متحرک تھی اور اس نے 60ء کے عشرے میں لائل پور اور قریبی قصبوں اور دیہات سے طالب علموں کو سوویت یونیورسٹیوں میں تعلیم کے لئے بھیجنا شروع کیا۔ 100 کے قریب طالب علم سوویت یونین اور دیگر مشرقی یورپی سوشلسٹ ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے اور بعد میں لوٹ کر معیشت کے مختلف شعبوں میں خدمات انجام دینے لگے۔ یہ سیف خالد کی دور اندیشی اور ویژن تھا کہ غریب اور نچلے متوسط طبقے کے بچے بیرونی ممالک میں اعلیٰ

تعلیم حاصل کر پائے۔"

آئی اے رحمان بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ سیف خالد سوویت یونین میں پاکستانی بچوں کے تعلیم حاصل کرنے کے سرگرم حامی تھے۔اس سلسلے میں اولین لوگ لائل پور سے گئے جن میں ان کے بعض اقارب بھی تھے۔

نقی بلڈنگ کی محفلوں کے حوالے سے ہم نے مختصراً بات کی۔ اس سلسلے میں امین مغل زیادہ وضاحت سے بات کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ

"لاہور میں چار پانچ لوگوں کا گروپ بن گیا۔ میں نیپ کا باقاعدہ رکن نہیں تھا۔ لیکن اس کی سرگرمیوں میں شامل تھا۔ گروپ میں ایرک سپرین، سی آر اسلم، سید مطلبی فرید آبادی، میجر اسحاق، انور چوہدری، عابد منٹو اور سیف خالد شامل تھے۔ گروپ میں آنے سے پہلے میں ایرک سپرین کے زیر اثر اشتراکی تحریک میں آچکا تھا۔ جب میں ان لوگوں کے قریب آیا تب سبط حسن لاہور میں ہی تھے۔ اس وقت سندھ میں سندھ کمیونسٹ پارٹی وجود نہیں رکھتی تھی۔ شمیم اشرف ملک، انور چوہدری، سیف خالد اور میاں منت اللہ کمیونسٹ گروپ کا حصہ نہیں تھے۔ سیف خالد اور بعد میں دوسرے لوگ نیپ میں ضرور سرگرم تھے۔ البتہ یہ سب لوگ روس کے حامی تھے۔ 1962ء میں میں کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن میں شامل ہوا۔"

امین مغل 1958ء میں اسلامیہ کالج میں لیکچرر ہو گئے تھے۔ کالج کے پرنسپل حمید احمد خان نے کالج کے معاملات کو ایرک سپرین کے سپرد کر رکھا تھا۔ 1965 کی جنگ سے پہلے یا تھوڑا بعد امین مغل کا شمیم اشرف ملک سے تعلق بن گیا ان دنوں نیپ میں خاصا خلفشار تھا۔ امین مغل بتاتے ہیں کہ اندر خانے لڑائی چل رہی تھی۔ بعد ازاں 1968 میں ولی نیپ اور بھاشانی نیپ سامنے آئیں۔ لڑائی کے آغاز میں روس کو گالی نہیں پڑتی تھی۔ بعد میں گالی بھی پڑنے لگی۔ میجر اسحاق کو نیپ کا سیکرٹری جنرل بنایا جانا تھا۔ لیکن ڈھاکہ جا کر بھاشانی منحرف ہو گئے۔ اس پر میجر اسحاق الگ ہو گئے۔ ایرک سپرین نے ان کا ساتھ دیا۔ امین مغل بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ 1966ء میں امین مغل چینی سیاست

چھوڑ کر روس نواز سیاست کا حصہ بن گئے اور معاہدہ تاشقند کی حمایت کرنے لگے۔ پنجاب کی اکثریت معاہدہ تاشقند کے خلاف تھی۔ چین نواز حلقے بھی اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس مخالفت میں حبیب جالب بھی شامل تھے۔ سیف خالد نیپ میں فعال رہے۔

اس اثناء میں سیف خالد کے ہاں چار بچوں کی ولادت ہو چکی تھی۔ یکم نومبر 1958ء کو ندیم خالد پیدا ہوئے۔ 4اگست 1960ء کو صبوحی خالد اس دنیا میں آئیں۔ 9اپریل1962ء کو نیاز خالد اور 8مئی 1966ء کو خرم خالد پیدا ہوئے۔ اس دوران 1965ء کی پاک بھارت جنگ ہوئی جو سترہ روز تک جاری رہی لیکن اس جنگ اور بعد کے واقعات کا ذکر ہم اگلے باب میں کریں گے۔

چوتھا باب

نیشنل عوامی پارٹی: تنظیم کاری سے دھڑے بندی تک

1964ء میں لاہور اور کراچی نیپ کی سرگرمیوں کے بڑے مراکز تھے۔ سیف خالد ابھی تک لاہور میں تھے اور 77۔مال روڈ پر ان کا آنا جانا شروع ہو چکا تھا۔ جہاں سے پنجاب بہاولپور نیپ کے جنرل سیکرٹری سی آر اسلم اور دوسرے ساتھی پارٹی کی سر گرمیاں پورے پنجاب تک پھیلا رہے تھے۔ یہاں ان کی ملاقاتیں پنجاب کے مختلف اضلاع سے آنے والے کارکنوں سے ہوتی رہتی تھیں۔ ان میں لائلپور سے آنے والے میاں محمود بھی شامل تھے۔ ان سے ہونے والی ملاقاتوں کے نتیجے میں ہی انہوں نے لائلپور واپس جانے کا فیصلہ کیا ہوگا کیونکہ 1965ء میں وہ لائلپور منتقل ہو گئے۔ 1964ء میں اگرچہ روس۔ چین تنازعہ کا آغاز ہو چکا تھا لیکن نیپ تک یہ معاملات ابھی نہیں پہنچے تھے۔صوبائی پارٹی، نیپ مرکز کے اغراض و مقاصد کو اختیار کر چکی تھی۔ پانچ صفحات پر مشتمل پنجاب و بہاولپور نیپ کا آئین سائیکلوسٹائل کی صورت میں شائع ہو چکا تھا۔ نئے سٹ اپ کے مطابق پنجاب نیپ کے صدر سی آر اسلم، محمد قسور گردیزی مرکزی نیپ کے نائب صدر، صوبائی نیپ جوائنٹ سیکرٹری سردار شوکت علی اور پبلیسٹی سیکرٹری غلام محمد ہاشمی تھے۔

نیشنل عوامی پارٹی کی تنظیم کاری 1964۔65ء

ایوب خان نے انتخابی مہم سر کرنے کے بعد اپنے اقتدار پر قبضہ برقرار رکھنے کے

لئے ہندوستان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ یہ چھیڑ چھاڑ آپریشن جبرالٹر کی صورت میں سامنے آئی۔ یہ دراصل ان خفیہ حملوں کا کوڈ نام تھا جو جولائی۔اگست 1965ء کے دوران مقبوضہ کشمیر میں کئے گئے اور ستمبر 1965ء کی پاک۔بھارت جنگ کی وجہ بن گئے۔ تحقیق کار سلطان ایم جلالی کا خیال ہے کہ گو آپریشن بجائے خود بڑا نڈر اور دلیرانہ منصوبہ رہا ہو لیکن عمل درآمد کے حوالے سے یہ ایک ناپختہ اور غیر پیشہ ورانہ عمل تھا۔ 6 ستمبر علی الصبح بھارتی فوجوں نے پاکستان کے کئی محاذوں پر حملہ کر دیا لیکن اس کا ذکر کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تفصیلی رپورٹ کا جائزہ لیا جائے جسے نیپ کے مرکزی جنرل سیکرٹری محمود الحق عثمانی نے جولائی 1965ء میں نیشنل عوامی پارٹی کے ڈھاکہ اجلاس میں پیش کیا اور جس میں نیپ کے قیام کے پس منظر کی بات کرتے ہوئے انہوں نے 1963-65ء کے درمیان رونما ہونے والے واقعات کا تجزیہ کیا۔ مئی 1963ء میں ایوب حکومت نے قومی جمہوری فیڈریشن (NDF) کے دس رہنماؤں کو گرفتار کر لیا جن میں شیخ عبدالمجید سندھی، میاں محمود علی قصوری، عطاءاللہ مینگل اور خود محمود الحق عثمانی کا تعلق نیپ سے تھا۔ نیپ کی مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس 5 جولائی 1964ء کو پشاور میں منعقد ہوا جس میں ملک کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لیا اور ایک سات رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی تاکہ وہ 20 جولائی کو ڈھاکہ میں حزب اختلاف کی دوسرے پارٹیوں کے اجلاس میں شرکت کر کے دسمبر 1964ء کے انتخابات کے لئے ایک مشترکہ پروگرام تشکیل دے سکے۔ کمیٹی میں مولانا بھاشانی (صدر) سمیت میاں محمود علی قصوری، سید الطاف حسین، حاجی محمد دانش، میجر اسحاق محمد، احمد الکبیر اور محمود الحق عثمانی شامل تھے۔ انتخابات میں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ مادرِ ملت کو شکست ہوئی۔

رپورٹ میں دیگر امور کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا کہ نیپ کی مجلسِ عاملہ کا دوسرا اجلاس یکم مارچ کو پشاور میں منعقد ہوا جو تین روز تک جاری رہا۔ نیپ کی مجلس عاملہ کا تیسرا اجلاس 17-19 ستمبر 1964ء کو کراچی میں ہوا۔ اجلاس میں حزب اختلاف کی دوسری جماعتوں کے ساتھ ہونے والے مذاکرات کی رپورٹ پیش کی گئی۔ کمیٹی میں مولانا بھاشانی، میاں

محمود علی قصوری، سید الطاف حسین اور محمود الحق عثمانی شامل تھے۔ مجلس عاملہ کا چوتھا اجلاس 18-14 جنوری 1965ء کو کراچی میں منعقد ہوا۔ جس میں صدارتی انتخاب میں محترمہ فاطمہ جناح کی شکست کا جائزہ لیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ نیپ آنے والے قومی اور صوبائی انتخابات میں حصہ لے گی، مولانا بھاشانی اپنی اہلیہ کے انتقال کے باعث اجلاس میں شریک نہ ہو سکے۔ لہٰذا اجلاس کی صدارت شیخ عبدالمجید سندھی نے کی۔ پانچ رکنی کمیٹی میں شیخ عبدالمجید سندھی، محمود علی قصوری، حاجی محمد دانش اور محمود الحقؒ عثمانی شامل تھے۔

12000 اراکین پر مشتمل کراچی یونٹ قائم کیا گیا جس میں انیس ہاشمی کو صدر اور اقبال آفریدی کو جنرل سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ سندھ کے صوبائی یونٹ کے 10 میں سے 6 اضلاع کے ارکان کی تعداد 5000 تھی۔ دادو اور جیکب آباد کے اضلاع میں نیپ کی ضلعی کمیٹیاں موجود نہیں تھیں۔ منتخب صوبائی کونسل کے ارکان کی تعداد 200 تھی۔ سندھی کونسل کے صدر شیخ عبدالمجید سندھی اور قاضی فیض محمد جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔

پنجاب و بہاولپور یونٹ کا صوبائی اجلاس 29-28 مئی کو لاہور میں منعقد ہوا جس میں سی آر اسلم صدر اور قسور گردیزی جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے جب کہ مغربی پاکستان نیپ کونسل کا اجلاس 12-11 جولائی 1965ء کو لاہور میں منعقد ہوا جس میں غوث بخش بزنجو، جنرل سیکرٹری، ارباب سکندر خان خلیل اور شیخ عبدالمجید سندھی نائب صدور اور میاں عارف افتخار اور انیس ہاشمی جوائنٹ سیکرٹری منتخب ہوئے۔

کوئٹہ اور قلات میں غیر معمولی صورت حال کے باعث صرف کوئٹہ ڈویژن میں کمیٹی کا قیام عمل میں آسکا۔ اس میں خیر بخش مری صدر اور خالد خان جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ قلات ڈویژن میں کمیٹی قائم نہ ہو سکی۔

مشرقی پاکستان کونسل کا اجلاس 25-24 جولائی کو ڈھاکہ میں منعقد ہوا۔ صوبائی کونسل کے ارکان کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ مشرقی پاکستان کی تمام 17 اضلاع میں ضلعی کمیٹیاں بن گئیں۔

علاوہ ازیں، کراچی نیپ نے 5-6 جولائی 1965ء کو ایک سیاسی کانفرنس منعقد کی

جس میں سندھ بھر سے پارٹی کارکنوں اور رہنماؤں نے شرکت کی۔

مولانا عبدالحمید بھاشانی ابھی تک پارٹی کے سربراہ تھے لیکن ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔

26-28 دسمبر 1965ء کو نیپ کی مجلس عاملہ کا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا جس کی صدارت نیپ کے صدر مولانا عبدالحمید بھاشانی نے کی۔ مجلس عاملہ کے جن ارکان نے اجلاس میں شرکت کی ان میں محی الدین، احمد غازی الحق، زین الدین، عبداللطیف افغانی، حاتم علی خان، محمد افضل بنگش، میاں محمود احمد، میاں محمود علی قصوری، امیر زادہ خان، دیوان محبوب علی، احمد الکبیر، سعید الحسن، سی آر اسلم، سردار شوکت علی، میاں عارف افتخار، انیس ہاشمی، سید الطاف حسین، غوث بخش بزنجو، شوکت علی خان، حاجی محمد دانش، انور زاہد، عبدالمجید سندھی اور محمود الحق عثمانی شامل تھے۔ مولانا بھاشانی نے اپنے صدارتی خطبہ سے اجلاس کا آغاز کیا۔ انہوں نے پارٹی کارکنوں اور رہنماؤں پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ وہ عوام کے مسائل میں دلچسپی لینے کی بجائے اپنا زیادہ وقت روس۔ چین جھگڑے پر ضائع کرتے ہیں۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ پارٹی پروگرام پر عمل کرتے ہوئے عوام کے معاملات میں شمولیت کے لئے ایک منظوم تنظیم کاری کی ضرورت ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ نیشنل عوامی پارٹی کیمونسٹ پارٹی نہیں ہے اس لئے ہمیں خود کو روس۔ چین تنازعے میں نہیں الجھانا چاہیے۔ اس لئے کہ چینی کمونسٹ پارٹی اور کیمونسٹ پارٹی آف سوویت یونین، دونوں عظیم پارٹیاں ہیں انہوں نے زور دیا کہ نیپ کو ایک حقیقی عوامی پارٹی میں تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔

نیپ کے جنرل سیکرٹری محمود الحق عثمانی نے اپنے خطاب میں بلوچستان کے حوالے سے مغربی پاکستان کے گورنر ملک امیر محمد خان سے ملاقات کی اور ہونے والے مذاکرت کا بتایا۔

پنجاب نیپ کے صدر محمود علی قصوری نے پارٹی کے صدر اور جنرل سیکرٹری کے خطاب کے حوالے سے کہا کہ ملک کی صورت حال سچ مچ ویسی ہی ہے جیسی صدرِ پارٹی نے بیان کی ہے تو یہ کوئی اچھی مثال نہیں ہے۔ لیکن ہمیں روس۔ چین تنازعے کے نام پر اس

تنازعے کے حوالے سے پارٹی میں موجود اختلافات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ انہوں نے مزید کہا کہ نیپ ایک محب وطن قومی پارٹی ہے اور افروایشیائی جماعت نہیں ہے اس لئے اسے محض سامراج دشمن جدوجہد کے پلیٹ فارم تک محدود رکھنے کے رجحان پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس سے پارٹی خود اپنے عوام میں تنہا ہو جائے گی۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت ہمارا بنیادی کام داخلی جمہوری قوتوں کو آمرانہ حکومت کے خلاف متحد کرنا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ پارٹی میں ایجنٹوں کو برداشت نہیں کرنا چاہئے۔ اور انہیں پارٹی سے نکال باہر کرنا چاہئے۔ اس پر مولانا بھاشانی نے وضاحت کی کہ انہوں نے پارٹی کی صفوں میں اتحاد برقرار رکھنے کی بات کی تھی۔ محمود علی قصوری، انور زاہد، احمد الکبیر، حاجی دانش، عارف افتخار اور غازی الحق نے اس مسئلے پر مختصراً اظہار خیال کیا جس کے بعد فیصلہ ہوا کہ پہلے نکتے کے طور پر کاکسس بازار کے طوفان پر بات کی جائے۔ اس کے بعد مولانا بھاشانی نے اجلاس کو متاثرہ علاقوں کے اپنے دورے کے تاثرات سے آگاہ کیا کہ اس خلافِ معمول طوفان سے کس قدر جانی اور مالی نقصان ہوا ہے۔ اس پر کمیٹی نے ایک متفقہ قرارداد منظور کی اور متاثرہ علاقوں کے لوگوں کے لئے فنڈ جمع کرنے کے لئے ایک ریلیف کمیٹی قائم کر دی۔

اس کے بعد کمیٹی نے اس امر پر بحث کی کہ مسئلہ کشمیر کے حوالے سے بیرون ملک ایک وفد بھیجا جائے جو مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے مختلف ملکوں کی حمایت حاصل کرے۔ جنرل سیکرٹری نے اس مسئلے پر وزارت خارجہ سے اپنی مراسلت اور ٹیلیفون پر گفتگو کے بارے میں بتایا۔ محمود علی قصوری نے بتایا کہ حکومت نے پہلے ہی بیرون ملک وفود بھیجنے کا ادارہ ترک کر دیا ہے۔ اب مسئلہ کشمیر پر پارٹی کے مؤقف کے تناظر میں بحث ہوئی۔ محمود علی قصوری، دیوان محبوب، سردار شوکت علی، افضل بنگش، غوث بخش بزنجو، شیخ عبدالمجید سندھی اور محمود الحق عثمانی نے بحث میں حصہ لیا۔ افضل بنگش نے کشمیر کے مسئلے پر بیرون ملک وفود بھیجنے کی مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ قوم مصیبت میں ہے اس لئے پارٹی کے رہنماؤں کی ملک میں موجودگی ضروری ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ پارٹی کے پاس رقوم کی کمی ہے جن

کو ملک میں پارٹی کو منظم کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔ دیوان محبوب نے بیرون ملک پارٹی وفود کی حمایت کی لیکن حکومتی وفود میں شمولیت کی مخالفت کی کیونکہ مسئلہ کشمیر پر نیپ اور حکومت کے مؤقف میں اختلاف ہے۔ نیپ کشمیریوں کے لئے حق خود ارادیت جبکہ حکومت اس مسئلے پر رائے شماری کی بات کرتی ہے۔ سردار شوکت علی نے کہا کہ نیپ نے ابھی اپنا حتمی مؤقف طے نہیں کیا۔ ارکان نے آئین کی روشنی میں اس مسئلے پر بحث کی۔ اجلاس نے ہوانا میں افریقی ایشائی لاطینی امریکی عوامی یکجہتی کانفرنس کی حمایت میں قرارداد منظور کی۔

اگلے روز 27 دسمبر کو افریقی ایشائی اور لاطینی امریکی ملکوں میں مسئلہ کشمیر کی وضاحت کے لئے ایک وفد بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ بعد ازاں ملک کی سیاسی صورت حال کے حوالے سے دن بھر بحث ہوئی، افضل بنگش، لطیف افغانی، سید الطاف حسین، محمود علی قصوری، سی آر اسلم، حاجی دانش، محی الدین احمد، احمد الکبیر، دیوان محبوب، عارف افتخار، سردار شوکت علی، غوث بخش بزنجو، انور زاہد اور محمود الحق عثمانی نے بحث میں حصہ لیا۔ اسی روز سردار شوکت علی، محمود علی قصوری اور احمد الکبیر کراچی سے چلے گئے۔

اجلاس کے تیسرے روز 28 دسمبر کو ملک کی سیاسی صورت حال کے حوالے سے بحث جاری رہی۔ قرار دادیں پیش اور چند ترمیمات کے ساتھ منظور کی گئیں۔ یہ موضوع بھی زیر بحث آیا کہ مسئلہ کشمیر اگر مناسب وقت میں حل نہیں ہوتا تو اسے اقوام متحدہ سے واپس لے لینا چاہئے۔ اس کے حق اور مخالفت میں بحث ہوئی۔ آخر میں اس کے حق میں قرار داد منظور کر لی گئی۔ تیسرے روز پارٹی کے تنظیمی امور بھی زیر بحث آئے۔ رکنیت سازی کی مہم پر بھی زور دیا گیا۔ مشرقی پاکستان کے لئے جمع ہونے والے ریلیف فنڈ کا معاملہ بھی زیر بحث آیا۔ کمیٹی نے رہوڈیشیا، کشمیر اور ویت نام میں ہونے والے مظالم کے خلاف قرار دادیں بھی منظور کیں۔

پارٹی پالیسی:

جولائی 1965ء میں مغربی پاکستان نیشنل عوامی پارٹی نے آزادی، جمہوریت اور سوشلزم کے بارے میں چند اہم فیصلے کئے جس کے پیش لفظ میں میاں محمود علی قصوری نے کہا:

''ملک بھر کے اہم مسائل کے بارے میں پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کے نقطہ نظر کو جاننے اور سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پارٹی کی مجالس اعلیٰ کی قراردادوں کو غور سے پڑھا جائے اخبارات آج کل کے مخصوص حالات کی وجہ سے پارٹی کی قراردادوں کو نہ تو پورا شائع کر سکتے ہیں اور نہ ہی اجمالی رپورٹوں میں قراردادوں کی صحیح عکاسی کرتے ہیں اس لئے عوام کے بعض حلقوں میں ہمارے متعلق بدگمانیاں پیدا ہونا کوئی تعجب کا مقام نہیں ہے۔ مگر حیرت اس بات پر ہے کہ بعض حلقے یہ الزام لگا رہے ہیں کہ پارٹی نے جمہوری اصولوں کی سربلندی کے فرض کو ادا کرنا ترک کر دیا ہے اور اس کی بجائے اینٹی امپیریلزم ہی کو پارٹی کا واحد نصب العین قرار دے دیا ہے اور کچھ لوگ اور بھی آگے جاتے ہیں اور مشہور کرتے ہیں پارٹی جمہوریت کی جدو جہد کو چھوڑ کر موجودہ آمرانہ حکومت کا دم چھلا بن گئی ہے۔ برعکس اس کے پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کی یہ پختہ رائے ہے کہ موجودہ برسراقتدار پارٹی شہری آزادیوں کا دائرہ دن بدن تنگ کر رہی ہے اور وہ ایسے قوانین اور آرڈینینسوں کو جنم دے رہی ہے کہ جمہوری انداز میں سیاسی سرگرمیاں جاری رکھنا مشکل ہوگیا ہے۔ جہاں تک خارجہ پالیسی کا تعلق ہے پارٹی اس میں نئے رجحان کو بہ نظر احسن دیکھنے کے باوجود یہ سمجھتی ہے کہ خارجہ پالیسی میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی اور موجودہ حکمران طبقہ اشترا کی ممالک کے ساتھ تجارتی اور دیگر معاہدوں کے باوجود اپنے طبقاتی مفادات کے پیش نظر امریکی سامراجیت سے پاکستان کے عوام کو نجات دلانے کے لیے تیار نہیں۔ پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کے کارکن ہمیشہ اصولی فکری اور جمہوری نصب العین سے وابستہ رہے ہیں۔ انہوں نے نامساعد اور کٹھن حالات میں بھی اپنا مطمع نظر عوام کے سامنے پیش کیا ہے۔ پاکستان میں شہری آزادیوں کی جدو جہد پاکستان نیشنل عوامی پارٹی

کے کارکنوں کی جدوجہد سے عبارت ہے اور انہوں نے اس جدوجہد کے دوران عوام کے معاشی حقوق کو منوانے کی بھرپور سعی کی ہے پاکستان نیشنل پارٹی کے پیش نظر ابتداء سے ہی عوام کی سیاسی آزادی اور معاشی برابری اور وسعت کے تصورات رہے ہیں اس لئے جہاں ہم نے عوام کی حاکیت عوامی حقوق شہری آزادی کی بنیاد پر منصفانہ انتخابات قانون ساز اداروں کی بالادستی، تعلیمی درسگاہوں میں علمی ترقی اور جمہوریت اور انصاف پسندی کے عقائد کے پھیلانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وہ اہم معاشی طور پر مجبور طبقات کی بہتری کے مثلا بنیادی صنعتوں کا فروغ، عوام کے لیے مکان تعلیم خوراک اور علاج، کسانوں کے لئے زمین، مزدور تحریکوں کی نشوونما اور ہڑتال کا حق، مزدوروں کے لئے بین الاقوامی ادارہ محنت کے مجوزہ قوانین، کم تنخوا پانے والے ملازمین کیلئے بہتر شرائط ملازمت ملکی معیشت پر چند خاندانوں کی بجائے عوام کی ملکیت کے مطالبات اسی ذہن کے مظہر ہیں، اس کے ساتھ ہی پاکستان کے مختلف صوبوں کے باشندوں میں اتحاد اور دوستی، ہمارے سیاسی اعتقادات کا بنیادی جزو ہیں۔

پارٹی نے اپنے پروگرام میں واضح کر دیا ہے کہ مشرقی پاکستان کو صوبائی اٹانومی (خودمختاری) اور مغربی پاکستان میں صوبوں کی بحالی کے ساتھ مغربی پاکستان ذیلی فیڈریشن کے قیام کے مطالبہ کا مقصد یہ نہیں کہ ملک کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے دور کیا جائے بلکہ یہ کہ جو مواقع آپس میں بداعتمادی سے پیدا ہو سکتے ہیں یا ہو رہے ہیں ان کو رفع کر کے ملک کو مضبوط بنایا جائے۔ مشرقی پاکستان کے متعلق ہم نے صوبائی خودمختاری کے ساتھ ساتھ پاکستان کے اس حصہ کے دفاع کے مسئلہ کو ہمیشہ ملک کے ذی فہم طبقہ کے سامنے پیش کیا ہے۔ ماضی قریب کے واقعات نے جہاں پارٹی کی مجوزہ خارجہ پالیسی کی مکمل تائید کی ہے وہاں مشرقی پاکستان کے متعلق بھی ہمارے نقطہ نظر کو تمام قوم کو اپنانا پڑا ہے۔

پارٹی جمہوریت کی بحالی اور ملک کو سامراجی چنگل سے چھڑانے کی تحریک میں ہمیشہ پیش پیش رہی ہے چنانچہ آج بھی پاکستان کے دونوں حصوں میں پارٹی کے سیکڑوں

کارکن نظر بند ہیں۔ کئی کارکنوں پر مقدمات چل رہے ہیں۔ جولائی 1965 کو مرکزی کونسل نے اپنے ڈھاکہ کے اجلاس میں جہاں واضح طور پر اپنے مقاصد میں مغربی سوشلزم کو شامل کیا وہاں ویسے ہی کھلے الفاظ میں پارٹی نے موجودہ حکومت کے نظام کو غیر جمہوری قرار دیا اور جمہوریت، شہری آزادیوں کی بحالی، بلامقدمہ گرفتار نظر بندوں کی رہائی اور بلوچستان میں تشدد ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔ پارٹی نے اس امر کی بھی نشاندہی کی کہ اگرچہ وہ پاکستان کے ایشیائی افریقی اور سوشلسٹ ممالک سے بڑھتے ہوئے تعلقات کو مستحسن نظروں سے دیکھتی ہے لیکن پارٹی اس رجحان کو خارجہ پالیسی میں بنیادی تبدیلی نہیں سمجھتی کیونکہ پاکستان ابھی تک سیٹو، سینٹو اور پاک امریکہ معاہدوں کے باعث فوجی معاشی اور انتظامی طور پر سامراجی ممالک سے بندھا ہوا ہے۔ میری رائے میں دوسری جنگ عظیم کے بعد جن ممالک نے اپنی معیشت کی بنیاد سامراجی ممالک سے امداد اور قرض حاصل کر کے سرمایہ داری کے اصولوں پر رکھی ہے وہ سرمایہ داری نظام کو چھوڑے بغیر اپنی خارجہ پالیسی کی بنیاد سامراج دشمنی پر نہیں رکھ سکتے۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں ہونے والے حالیہ واقعات سے یہ بھی ثابت ہوگیا ہے کہ نو آزاد ممالک کی معیشت میں سامراجیوں کا عمل دخل غیر جمہوری ماحول، شہری آزادیوں کا فقدان، سی آئی اے کی سرگرمیوں کے لئے انتہائی سازگار ہوتا ہے اس لئے ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ پاکستان میں ایک ایسے نظام حکومت کو وجود میں لایا جائے جس میں صرف رائے عامہ کا آئینی اور جمہوری دباؤ برسر اقتدار پارٹی کو اقتدار میں رکھ سکے تاکہ ہمارا ملک سی آئی اے جیسی رسوائے زمانہ تنظیموں کی سازشوں کی آماجگاہ نہ بنے۔

پارٹی کا اپنا اخبار نہ ہونے کے باعث مغربی پاکستان میں کونسل کے ڈھاکہ سیشن کی مناسب اشاعت نہیں ہوسکی اور پارٹی کے اراکین اور عوام کونسل کے فیصلوں سے آگاہ نہیں ہوسکے مغربی پاکستان کی مجلس عاملہ نے اعلان تاشقند پر عدم اطمینان کا اظہار کیا لیکن مجلس عاملہ کی قرارداد کچھ اس طرح اخبارات میں شائع ہوئی کہ قرارداد کی روح مسخ ہوگئی اسی طرح پارٹی کے کارکنوں اور عوام میں مایوسی اور بے اطمینانی کا پیدا ہونا لازم تھا۔

کمیونسٹ پارٹی اور سیف خالد

نواز بٹ کے مطابق پنجاب میں کمیونسٹ پارٹی کو کھڑا کرنے میں سیف خالد نے اہم کردار ادا کیا۔۔ دراصل پنجاب میں رابطوں کا آغاز، انیس ہاشمی نے کیا تھا۔ پھر انیس ہاشمی، سیف خالد اور میاں محمود نے پنجاب میں کمیونسٹ سرگرمیوں کو تیز کیا۔ 1964ء میں شیر افضل کے پارٹی سے نکل جانے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کی کراچی ڈسٹرکٹ کمیٹی سکڑ گئی۔ اس موقع پر انیس ہاشمی پارٹی میں داخل کئے گئے۔ وہ پہلے بھی پارٹی میں رہے تھے۔ 1951ء میں جب وہ گرفتار ہو گئے تو رہائی کے بعد مقبول آئل مل میں کام کرتے رہے۔ رہائی کے بعد پارٹی میں زیادہ سرگرم نہیں رہے غالباً چندہ دیتے رہے۔ ان دنوں کراچی کمیٹی کے سیکرٹری نواز بٹ تھے نازش امروہوی انڈر گراؤنڈ تھے اور کبھی کبھار ہی ملا کرتے تھے۔ ہفتہ وار اجلاس سندھ کے سیکرٹری جنرل جمال نقوی لیتے تھے۔ اس وقت پاکستان کمیونسٹ پارٹی کا وجود نہیں تھا۔

پھر چین نوازی کا دور چلا۔ میاں محمود اور سی آر اسلم چین نواز ہو گئے۔ سیف خالد ڈٹے رہے۔ ان کے ساتھ شرافت اللہ وغیرہ بھی گئے۔ سیف بے حد مہمان نواز اور دوستی نبھانے والے انسان تھے۔ سیف کی وساطت سے لائلپور پہلے ہی 1962-63ء سے سندھ کے رابطے میں آچکا تھا۔ انیس ہاشمی کے بھائی حمید ہاشمی امروز میں کام کرتے تھے۔ 1964ء پی آئی اے کی قاہرہ جانے والی افتتاحی پرواز گر کر تباہ ہو گئی۔ اس میں حمید ہاشمی سمیت متعدد صحافی مارے گئے۔ نواز بٹ بتاتے ہیں کہ وہ کراچی میں انیس ہاشمی کے گھر گئے اور فرش پر بیٹھے۔ انیس ہاشمی ڈرائینگ روم میں صوفے نہیں رکھتے تھے۔ فرش پر دری بچھی ہوتی، جس پر سب بیٹھتے تھے۔ ان کا گھر فردوس کالونی میں تھا، جو انہوں نے خود بنایا تھا بعد ازاں وہ پاپوش نگر اپنے بیٹے کے گھر منتقل ہو گئے۔

اس زمانے میں نواز بٹ پاجامہ کرتا پہنتے تھے۔ ابھی عوامی سوٹ شلوار قمیض کا رواج نہیں ہوا تھا۔ نواز انیس ہاشمی کے ساتھ نیپ کراچی کے سیکرٹری بنے تو ان کا انیس

ہاشمی کے گھر آنا جانا بڑھ گیا۔ سیف خالد جب کبھی کراچی آتے وہ انیس ہاشمی سے ضرور ملتے۔ نواز خود کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ ان کے والد کماتے اور نواز دوستوں کی خوب مہمان نوازی کرتے۔ کئی بار رمضان میں بیس پچیس لڑکوں کی فلائٹ آتی اور انکے گھر مہمان ہوتی۔

اب پنجاب پارٹی میں سی آر اسلم نہیں تھے۔ انیس ہاشمی نے ان کے بغیر پنجاب میں پارٹی کو آگے بڑھایا۔ سیف خالد نے شمیم اشرف ملک کو پارٹی میں لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی اہلیہ نسیم بھی پارٹی میں کافی متحرک ہوگئیں۔

سیف خالد اور انیس ہاشمی کی دوستی نے پنجاب میں بڑا کام کیا۔ سیف خالد افراد کی نشاندہی کرتے اور انیس ہاشمی ان کو پارٹی میں لے آتے۔ سیف خالد اور شمیم اشرف کی وجہ سے پنجاب میں کمیونسٹ پارٹی منظم ہونا شروع ہوئی اور جب 1965ء میں بزنجو پارٹی میں آئے تو کمیونسٹ پارٹی پورے پاکستان کی پارٹی بن گئی۔ نواز بٹ کے بقول:

”نازش امروہوی میرے گھر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے بزنجو کو لانے کا کہا۔ بزنجو کراچی کے پرانے پارک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ نواز انہیں لانے ہوٹل گئے تو بزنجو پہلے سے جانتے تھے کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ اس زمانے میں بلوچوں کا ایک بڑا ونگ کمیونسٹ پارٹی میں آیا۔ لال بخش رند، نقشبندی اور کچھ دوسرے،“ نواز بٹ، بزنجو کو لے کر اپنے گھر آئے تو انہیں کمرے سے نکال دیا گیا کیونکہ وہ اجلاس میں بیٹھنے کے مجاز نہیں تھے۔ دونوں کی علیحدگی میں میٹنگ ہوئی اور غوث بخش بزنجو پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اب بزنجو اور گل خان نصیر نے بلوچستان میں کمیونسٹ پارٹی کی تعمیر کی۔ گل خان نصیر بلوچی اور براہوئی کے ملک الشعرا تھے۔ انور رشید صدیقی نے ان کے کلام کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ نواز بٹ کے گھر شعرو شاعری کی محفلیں جمتیں۔ گل خان نصیر، حبیب جالب اور کئی دوسرے۔ 1962ء سے ان ادبی بیٹھکوں کا سلسلہ جاری تھا۔ کئی بار سیف خالدلائلپور سے کراچی آتے تو ان محفلوں کا حصہ بنتے۔ جالب نے اپنی نظم 'دستور' اسی گھر میں سنائی تھی۔ انہی ملاقاتوں میں نواز بٹ کو پتہ چلا کہ غوث بخش بزنجو اور میر گل خان نصیر قلی کمپ میں

ایوب خان کے قیدی رہے تھے۔ نواز گل خان کے ذریعے ہی بزنجو سے متعارف ہوئے تھے۔ بزنجو لیاری میں بہت سرگرم تھے۔ لال بخش رند ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ نیپ کی وجہ سے نواز بٹ کے میر بزنجو سے تعلقات بن گئے تھے لیکن کمیونسٹ پارٹی کے حوالے سے وہ 1965ء میں قریب آئے۔

پنجاب سے سیف خالد اور شمیم اشرف ملک بلوچستان سے میر گل خان نصیر اور بزنجو اور صوبہ سرحد (اب خیبر پختونخوا) سے افضل خان کمیونسٹ پارٹی میں بہت فعال رہ چکے تھے۔ سیف خالد کے میجر اسحاق سے تعلقات اچھے نہیں رہے۔ سیف کی سرگرمیاں صرف لائلپور تک محدود نہیں تھیں۔ وہ پورے پنجاب میں نیپ کے اجلاسوں میں بھرپور شرکت کرتے تھے۔ 1965ء میں نازش امروہوی اور جمال نقوی مشرقی پاکستان گئے جہاں مشرقی پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے مونی سنگھ سے ان کی ملاقاتیں رہیں۔

1965ء کی پاک بھارت جنگ

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں آپریشن جبرالٹر کا ذکر کیا جا چکا ہے، جولائی اگست کا یہ آپریشن جس کا نقشہ ایوب خان کے مرکزی وزیر ذوالفقار علی بھٹو نے ترتیب دیا تھا، ستمبر 1965 کی جنگ کا براہ راست ذریعہ بن گیا۔ غوث بخش بزنجو بھٹو کے علاوہ مرکزی وزیر داخلہ عبدالقیوم خان کو بھی اس جنگ کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ بزنجو کے لفظوں میں ان دونوں حضرات کا اندازہ تھا کہ ”قیوم خان کا جمع شدہ اور پاکستان کا باضابطہ افواج کی کمانڈ کے تحت دیا گیا قبائلی لشکر ایک دھاوے میں وادیء کشمیر پر قبضہ کر کے بھارتیوں کو حیرت زدہ کردے گا۔ اس سے پہلے کہ بھارتی افواج آگے بڑھ سکیں، یہ مقصد حاصل ہو جاتا تو پاک فوج وادی کے دفاع کا براہِ راست کنٹرول حاصل کر لیتی۔ تاہم حالات مختلف طور پر سامنے آئے۔ وادی میں داخل ہو جانے کے بعد مسلح قبائلی بے قابو ہو گئے اور پیش قدمی کے دوران مقامی لوگوں کو دل برداشتہ کرتے ہوئے لوٹ مار کرنے لگے۔ دوسری جانب پاکستان کی باضابطہ افواج اور قیوم کے نظم وضبط سے عاری قبائلی لشکر میں سنجیدہ قسم کے

اختلافات سامنے آ گئے۔ بھارتی خود کو چوکنا رکھے ہوئے تھے اور پیش رفتوں کا قریب سے جائزہ لے رہے تھے۔ بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے پہلے ہی انتباہ کر دیا تھا کہ بھارت اپنا میدان جنگ خود منتخب کر کے جواب دے گا۔ اپنے انتباہ پر پورا اترتے ہوئے انہوں نے 6 ستمبر 1965ء کو بھارتی افواج کو بین الاقوامی سرحد عبور کرتے ہوئے مغربی پاکستان میں داخل ہونے کا حکم دے دیا۔ یہ اس سے کہیں زیادہ تھا جس کا مسودہ ایوب خان نے اپنے دو ''خیر خواہوں'' کے مشورے کے تحت مرتب کیا تھا۔

''نیپ کی صفوں میں 1965ء کی جنگ سے متعلق دو مختلف آراء پائی جاتی تھیں۔ ایک اسے باجواز ثابت کرنے کی کوشش کرتا جب کہ دوسرا ناقد تھا۔ نیپ کی پنجاب، سرحد اور سندھ شاخوں میں رائے منقسم تھی۔ بلوچستان کی شاخ جنگ کے مکمل طور پر خلاف تھی اور مشرقی پاکستان کے پارٹی ارکان کی بھاری اکثریت بھی۔ آخر الذکر کے خیال میں یہ ایک بے معنی جنگ تھی جو پاک بھارت تعلقات کو بند گلی میں لا سکتی تھی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ یہ قومی وسائل کا مجرمانہ ضیاع ہو گا اور یہ جنگ بے حد ہلاکت اور تباہی کی وجہ بنے گی۔ انہوں نے متنبہ کیا کہ یہ بھارت اور پاکستان دونوں کو کمزور بناتے ہوئے خطے کو سامراجی ریشہ دوانیوں کے لئے زیادہ اثر پذیر بنا دے گی۔ تاہم پارٹی کے سر براہ مولانا بھاشانی بظاہر اپنے اعلانیہ چین نواز جھکاؤ کے باعث یہ سوچتے ہوئے کہ چین بھارت تعلقات اس وقت اپنی کم ترین سطح پر تھے، اس جنگ پر حکومتی مؤقف کے حامی تھے۔

''جیسا کہ ہم میں سے بیشتر کو پیش آ گہی تھی، جنگ کا نتیجہ سوائے بے پناہ تباہی اور بربادی کے اور کچھ نہ نکلا۔ دونوں ممالک کے مابین تعلقات بد سے بد تر ہو گئے۔ دونوں نے امداد اور اسلحے کے حصول کے لئے امریکہ کی جانب رخ کیا۔ یہ اور بات تھی کہ پاکستان نے ایسا کھلے عام کیا جب کہ بھارت نے در پردہ۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کچھ چھپے ہوئے ہاتھوں نے دونوں ہمسایہ ملکوں کو ایک دوسرے کے خلاف لا کھڑا کرنے کی سازش کی تھی۔ جنگ کے نتیجے میں، امریکہ کے لاتعلق رویے کے برعکس، سوویت یونین نے ایوب خان اور لال بہادر شاستری کو تاشقند میں امن بات چیت کے لئے مدعو کیا، جس کا

نتیجہ 10 جنوری 1966ء کو تاشقند اعلامیے پر دستخط کی صورت میں نکلا، اس میں سوویت وزیر اعظم الیکسی کوسیگن نے مفاہمت کار کا کردار ادا کیا تھا۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ سوویت یونین نے امن کی خاطر ایک جنوبی ایشیائی تنازعے میں براہ راست مداخلت کی تھی۔ اس کے برعکس امریکہ نے جنگ اور تنازعے کے شعلوں کو ہوا دینے کے لئے اکثر و بیشتر مداخلت کی۔

پنجاب میں سیف خالد، شمیم اشرف ملک اور ان کے بیشتر ساتھ، اس جنگ کے مخالف تھے لیکن سیف خالد کی اپنی والدہ اس جنگ کی زبردست حامی تھیں اور اسے کفر و اسلام کی جنگ سمجھتی تھیں اس حوالے سے حسین نقی نے مجھے دلچسپ کہانی سنائی۔ ان کے مطابق:

''ایک مرتبہ سیف کی امی سے ملاقات ہوئی۔ 1965ء کی جنگ کا زمانہ تھا، وہ چوبرجی کے پیچھے راج گڑھ کے ایک بنگلے میں رہتی تھیں۔ مجھ سے کہنے لگیں، بیٹا! سیف تو ہندوستان کا ایجنٹ ہے۔ میں نے پوچھا کیسے؟ تو وہ بولیں، جب ان کے جہاز آتے تھے تو یہ باہر نکل کر سگریٹ پیتا تھا۔ میں نے کہا 'جہاز سے سگریٹ کیسے نظر آسکتا تھا۔ بولیں، اسے پاکستان سے نکالو۔'' اس بات کی تصدیق ندیم خالد کے اس بیان سے ہوسکتی ہے۔:

''میری دادی میرے والد کے اپوزیشن کی طرف جھکاؤ سے خوش نہیں تھیں۔ انہیں یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی کہ میرے والد ایوب، یحییٰ اور ضیاء جنہیں وہ خاص طور پر بہت نیک اور پرہیز گار جانتی تھیں، کے کیوں مخالف ہیں۔ بہت سال بعد ایک دوست نے میرے والد جیسے لوگوں کو دریا سندھ کی پلہ مچھلی سے تشبیہ دی جو ہمیشہ دریا کے بہاؤ کے مخالف سمت میں تیرتی ہیں۔ انہیں سماج میں نا برابری، ظلم اور نا انصافی کے خلاف جدوجہد کے جرم میں متعدد بار گرفتار کیا گیا۔''

23 ستمبر 1965ء کو پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ بندی ہوگئی۔ جنگ

کے چند ماہ بعد سوویت یونین کی مصالحتی کوششوں کے نتیجے جنوری 1966 کے اوائل میں روسی صدر کوسیگن کی دعوت پر پاکستانی صدر ایوب خان اور بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری سوویت مسلم ریاست ازبکستان کے دارالحکومت تاشقند پہنچے۔ صدر ایوب کے ہمراہ وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو، وزیر اطلاعات ونشریات خواجہ شہاب الدین اور وزیر تجارت غلام فاروق سمیت اعلیٰ فوجی اور سول حکام کا 16 رکنی قافلہ 3 جنوری کو تاشقند پہنچا۔ بھار ت کی جانب سے وزیر اعظم لال بہادر شاستری کا ایک بڑا قافلہ مذاکرات کے لئے عازم تاشقند ہوا۔ مذاکرات 7 روز تک جاری رہے اور کئی بار تعطل کا شکار ہونے کے بعد دونوں ملکوں کے سربراہوں نے تاریخی معاہدہ تاشقند پر 10 جنوری 1966ء کو دستخط کر دیئے۔ اس معاہدے میں سوویت یونین کے وزیر اعظم کوسیگن کی کوششوں کا بھی دخل تھا۔ دنوں ملکوں کے سربراہوں کے لئے لازم تھا کہ اپنے اپنے وطن واپس آنے سے پہلے کسی نہ کسی سمجھوتے پر ضرور پہنچیں۔ بدقسمتی سے ذوالفقار علی بھٹو نے، جو جنگ ستمبر کے ذمہ دار تھے اس معاہدے کو متنازعہ بنانے میں بھرپور کوشش کی۔ معاہدے میں طے کیا گیا تھا کہ دونوں ملکوں کی فوجیں 5 اگست سے پہلے والی پوزیشن پر چلی جائیں اور دونوں ملک اقوام متحدہ کے اصولوں کے تحت مسئلہ کشمیر کے مسئلے کو کسی حل کی جانب لے جائیں۔ بھٹو اور پاکستان کے جنگ باز حلقوں نے یہ منفی پراپیگنڈہ کیا کہ میدان میں جیتی ہوئی جنگ تاشقند کی میز پر ہار دی گئی۔ اس سلسلے میں کسی خفیہ شق کا بھی ذکر کیا گیا جسے بھٹو نے اپنے پراپیگنڈے کے لئے خوب استعمال کیا۔ لیکن وہ زندگی بھر اس خفیہ شق کو قوم کے سامنے نہ لا سکے۔ یو ں اقتدار کی ہوس نے دو پڑوسی ملکوں کو لڑانے کی سازش کو آگے بڑھایا گیا اور صرف پانچ سال کے عرصے میں ایک اور جنگ کے بعد پاکستان دولخت ہو گیا۔ جیسا کہ بزنجو صاحب نے بھی لکھا، نیپ میں دو طرح کا ردِعمل سامنے آیا جس نے نیپ کی تقسیم میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ایک طرف محمود الحق عثمانی، محمود علی قصوری، شمیم اشرف ملک اور سیف خالد جیسے اس معاہدے کے حامی عناصر تھے تو ان کے برعکس بھاشانی، سی آر اسلم، میاں محمود احمد قسور گردیزی اور سردار شوکت علی وغیرہ نے معاہدہ ءتاشقند کی مذمت کی۔ نواز بٹ بتاتے ہیں

کہ سیف اس معاہدے پر بے حد خوش تھے اور اپنی والدہ کو سمجھانے سے قاصر کہ یہ معاہدہ کیوں ضروری تھا۔ اگلے ہی سال 1967ء میں وہ سوویت یونین کے قیام کی پچاسویں سالگرہ منا رہے تھے۔

معاہدہ تاشقند کو ایک ماہ بھی پورا نہ ہوا تھا کہ 5 فروری کو لاہور میں حزب اختلاف کی جماعتوں کے دو روزہ سیمینار میں عوامی لیگ کے صدر شیخ مجیب الرحمن نے اپنے مشہور زمانہ چھ نکات کا اعلان کیا۔ یہ ایک بڑا سیاسی قدم تھا جس نے جلد ہی پاکستان کی سیاست پر بہت گہرے اثرات مرتب کئے۔ ایک دلچسپ تبصرہ یہ سامنے آیا کہ 1940ء کی قرارداد پاکستان کی طرح قراردادِ بنگلہ دیش بھی لاہور سے ہی پیش کی گئی جب کہ 26 جنوری 1930ء کو ہندوستان کی کامل آزادی کی قرار داد بھی لاہور سے ہی پیش کی گئی تھی۔

نیپ ابھی تک متحد تھی لیکن 30 جنوری 1966ء کو نیپ لاہور و بہاولپور کی جانب سے معاہدہ تاشقند پر تنقید کی گئی اور کہا گیا کہ یہ معاہدہ توقعات سے کہیں کم تر ہے تاہم یہ بھی کہا گیا کہ اب جب کہ اس معاہدہ پر دستخط ہو چکے ہیں اسے اپنی افادیت کے اظہار کے لئے ایک موقع دیا جانا چاہئے۔

سیف خالد نے جس سیاسی راستے کا انتخاب کیا وہ کانٹوں سے بھرا تھا۔ قیام پاکستان کو قریباً بیس سال گزر چکے تھے۔ عوام اب تک اپنے جمہوری حقوق سے محروم تھے۔ لوگ غربت اور افلاس کی چکی میں پس رہے تھے۔ گرانی اور بیروزگاری نے انہیں بے حال کر رکھا تھا۔ سیف خالد سوچتے کہ حالیہ جنگ نے معاشی حالات کو مزید ابتر کر دیا تھا۔ جنگ کے نتیجے میں دوسرے ملکوں پر محتاجی میں اضافہ ہوا۔ سرحدی علاقوں میں واقع کارخانے تقریباً اجڑ گئے۔ مزدوروں کو بغیر تنخواہ کے تین ماہ کی چھٹیاں دے دی گئی تھیں۔ جنگ سے براہِ راست متاثر ہونے والے علاقوں میں زرعی پیداوار میں کمی واقع ہو گئی اور دیہی آبادیوں کے افلاس میں مزید اضافہ ہوا سیف خالد کے لئے یہ صورت حال کسی طرح قابل قبول نہ تھی۔ اس سے ان کا عزم اور حوصلہ مزید بڑھا۔ چنانچہ اسی سال جون میں نیشنل عوامی پارٹی کی مجلس عاملہ کا اجلاس ڈھاکہ میں ہوا تو اس میں منظور ہونے

والی قرار دادوں نے انہیں نیا حوصلہ بخشا۔ پارٹی کے صدر مولانا بھاشانی نے سیاسی جماعتوں کے لئے کم از کم پروگرام کی تیاری کے حوالے سے مغربی پاکستان نیپ کی مجلس عاملہ کا جو اجلاس 27-26 جولائی کو لاہور میں طلب کیا اس میں منظور ہونے والی قرار دادوں کی مغربی پاکستان نیپ سے بھی منظوری حاصل کی گئی۔

سیف خالد مغربی پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کی مجلس عاملہ کے انتہائی فعال رکن تھے وہ مجلس عاملہ کے ہر اجلاس میں شامل ہوتے اور بھرپور سرگرمی کا مظاہرہ کرتے۔ سامراج سے مکمل آزادی کی تحریک اور ڈالر کی حکمرانی کو دھتکارنے میں وہ پیش پیش تھے۔ دراصل 1964ء میں جب نیشنل عوامی پارٹی کی بحالی کا معاملہ درپیش ہوا تو انہوں نے سب سے آگے بڑھ کر بھرپور سرگرمیوں کا مظاہرہ کیا۔ گزشتہ تین برسوں سے وہ سیاسی فعالیت کے ساتھ پارٹی سرگرمیوں کا حصہ بنے ہوئے تھے۔

اس سے چند روز قبل 19 جولائی کو نیشنل عوامی پارٹی پنجاب و بہاولپور کی مجلس عاملہ کے اجلاس منعقدہ راولپنڈی نے شمالی ویت نام پر امریکی بمباری اور ویت نامی عوام پر امریکی سامراج کے وحشیانہ مظالم کی شدید مذمت کی۔ اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ امریکہ کی جنگجویانہ کارروائیوں کی علی الاعلان مذمت کرے اور ویت نام کی حکومت کو بلا تاخیر تسلیم کرے۔ پارٹی نے ملک کی تمام سیاسی جماعتوں، مزدور و کسان تنظیموں اور طلباء، دانشوروں کی انجمنوں سے پرزور اپیل کی کہ وہ ایشیا کو جنگ کا اکھاڑہ بننے سے روکنے اور تیسری جنگِ عالمگیر کی تباہ کاریوں سے بچانے کے لئے متحد ہو کر امریکی سامراج کی جارحانہ کارروائیوں کے خلاف آواز بلند کریں۔

''پارٹی کی مجلس عاملہ نے اپنے اجلاس میں روز مرہ ضرورت کی اشیاء کی ہولناک گرانی پر سخت تشویش ظاہر کی اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ اشیاء کی تجارت کو فی الفور قومی ملکیت بنایا جائے۔ تمام سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں سستے راشن کے سٹور قائم کئے جائیں اور کارخانہ داروں کے منافعوں پر مؤثر کنٹرول کیا جائے۔

نیشنل عوامی پارٹی پنجاب و بہاولپور کی مجلس عاملہ نے اپنے اجلاس میں متعدد قرار

دادیں منظور کیں۔ یہ اجلاس راولپنڈی میں پارٹی کے صدر سی آر اسلم کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں میاں محمود علی قصوری، سردار شوکت علی، میر غوث بخش بزنجو رکن قومی اسمبلی، میاں عارف افتخار رکن قومی اسمبلی، میاں محمود احمد ایڈووکیٹ، کرنل لطیف افغانی اور مجلس عاملہ کے دیگر ارکان نے شرکت کی۔

پنجاب و بہاولپور نیپ کی مجلس عاملہ نے مذکورہ اجلاس میں ملکی مسائل کی بھی بات کی۔ ان مسائل میں ٹیکسوں کے خاتمے، غیر ملکی امداد کی مخالفت اور شہری آزادیوں کی بحالی کا مطالبہ کیا۔ اجلاس میں زرعی مسائل کی بھی نشاندہی کی گئی اور نئے دارالحکومت اسلام آباد کے سنگین مسائل کی طرف بھی اشارہ کیا گیا۔ متاثرین اسلام آباد کا حوالہ دیتے ہوئے ایک قرارداد میں کہا گیا کہ کیپیٹل ڈیولپمنٹ اتھارٹی نے جو زمینیں حاصل کی ہیں اور اب بھی حاصل کی جا رہی ہیں، انہیں قیمت کے لحاظ سے آٹھ درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان کی قیمتیں 15 روپے فی کنال سے لے کر ڈیڑھ ہزار روپے فی کنال تک مقرر کی گئی ہے۔ اس طرح اوسط قیمت تین سو روپے فی کنال ہے لیکن اس طرح حاصل کردہ زمینوں کو ساڑھے سات ہزار فی کنال زیادہ پر فروخت کیا جا رہا ہے قیمت خرید اور فروخت میں اس قدر بھاری فرق سے ظاہر ہے کہ مالکان کو زمینوں کا معاوضہ نہایت قلیل دیا جا رہا ہے۔ لہٰذا اجلاس نے مطالبہ کیا کہ ہر قسم کی زمین کا ایک ہی نرخ مقرر کیا جائے اور بے دخل لوگوں کو راولپنڈی کے مضافات میں رائج نرخوں کے حساب سے معاوضہ دیا جائے۔ رہائشی مکانات کے معاوضہ کی شرح بڑھائی جائے اور بے دخل لوگوں کو صرف پنجاب میں آباد کیا جائے۔

غوث بخش بزنجو کا انتخابی معرکہ

1966 میں بلوچستان کے حوالے سے ایک اہم پیش رفت ہوئی۔ مئی میں غوث بخش بزنجو نے کراچی سے قومی اسمبلی کے رکن کا انتخاب لڑا اور کامیاب ہوئے۔ نواز بٹ نے تفصیل سے پوری کہانی سنائی۔ ان کے مطابق جب کراچی کے ایک قدیم حلقے لیاری کی نشست خالی ہوئی تو صدر ایوب خان اس حلقے سے خان بہادر حبیب اللہ خان پراچہ کو

کامیاب کروانا چاہتے تھے۔ اس نشست پر بنیادی طور پر حق ہارون خاندان کا تھا لیکن وہ براہِ راست ایوب خان کے مقابلے پر نہیں آنا چاہتا تھا۔ نواب آف کالاباغ کے ایوب خان سے سنگین اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ اس نے یوسف ہارون سے کہا کہ وہ اس حلقے سے انتخاب لڑیں لیکن وہ نہیں مانے۔ اس بحث میں بزنجو کا نام سامنے آیا۔ بزنجو فوری طور پر تیار نہیں ہوئے لیکن پھر مان گئے۔ کراچی نیپ کے صدر انیس ہاشمی بزنجو صاحب کے الیکشن ایجنٹ اور کراچی نیپ کے جنرل سیکرٹری نواز بٹ ڈپٹی الیکشن ایجنٹ مقرر ہوئے۔ نواز بٹ نے بتایا کہ میں اور بزنجو انتخابی سرگرمیوں کے دوران فٹ پاتھ پر بیٹھ کر بیڑی پیتے اور بحث کرتے۔ بزنجو کے اپنے الفاظ میں

> ''قومی اسمبلی کی نشست کا تعلق محمود ہارون سے تھا۔ انہوں نے گزشتہ الیکشن میں متحدہ اپوزیشن کے امید وار کے طور پر عبدالباقی بلوچ کو شکست دے کر یہ نشست جیتی تھی۔ جب ہارون کو مغربی پاکستان کی کابینہ میں وزیر مقرر کیا گیا تو انہوں نے یہ سیٹ خالی کر دی۔ ایوب خان نے کنونشن مسلم لیگ کا ٹکٹ اپنے زیرِحمایت خان بہادر حبیب اللہ کو دے دیا۔ پراچہ اور نواب آف کالا باغ، کالا باغ کے علاقے میں پرانے حریف تھے۔ ایوب ہر قیمت پر پراچہ کی جیت چاہتے تھے لیکن کالا باغ، اس کی جو بھی قیمت یا نتائج ہوتے، ان کی شکست کے خواہاں تھے۔ اس نشست کے تیسرے سٹیک ہولڈر محمود ہارون تھے کہ یہ ان کے خاندان کی روایتی نشست تھی۔ ان کے والد سر عبداللہ ہارون بھی اسی حلقہ انتخاب سے منتخب ہوا کرتے تھے۔ اس لئے اس میں ان کا خاندانی سٹیک تھا اور وہ کسی ایسے شخص کو یہ سیٹ جیتنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ جو طویل مدت میں ان کے خاندان کے لئے مسائل کھڑے کرتا۔ محمود ہارون اور نواب کالا باغ، پراچہ کی فتح کا راستہ روکنے کے لئے اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے ایسے امید وار کی تلاش شروع کر دی، جسے

دولت یا جبر و استبداد کی طاقت سے دھمکایا نہ جا سکتا اور جو ہارون خاندان کے لئے مسائل بھی کھڑے نہ کرتا۔ انہوں نے الیکشن امیدوار کے طور پر میرا انتخاب کیا۔ انہوں نے پہلے سے مجھ سے مشورہ کیا نہ ہی مجھے اس بارے میں پہلے سے کوئی علم تھا۔ میں ابھی ابھی جیل سے باہر نکلا تھا اور اپنے گاؤں نال میں مقیم تھا۔

''پھر انہیں کسی طرح گاؤں سے کراچی بلایا گیا اور تمام کہانی سنائی گئی۔ وہ بڑی مشکل سے مانے۔ انیس ہاشمی اور نواز بٹ نے بزنجو صاحب کے حق میں بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ میں ان دنوں ہارون کالج کا طالب علم تھا جہاں فیض صاحب پرنسپل اور محمد رکن الدین حسان وائس پرنسل تھے اور دونوں بزنجو کی کامیاب چاہتے تھے۔ میرے کلاس فیلو نور محمد شیخ مجھے لے کر لال بخش رند کے پاس گئے اور ہم دونوں نے ان کی رہنمائی میں بزنجو صاحب کے لئے انتخابی کام کیا۔ جس دن ان کی کامیابی کا اعلان ہوا۔ ہم خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے بزنجو اس انتخابی معرکے میں نہیں کودنا چاہتے تھے۔ ان کا فطری خدشہ یہ تھا کہ ایوب خان اپنے امیدوار کے مقابلے میں کسی کو نہیں جیتنے دے گا۔

ان حالات پر بزنجو صاحب نے مزید روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں ایک ایسے فورم تک رسائی کا خواہش مند تھا جس کے ذریعے میں عوام کو بلوچستان کی حالت زار سے آگاہ کرنے اور اپنے ساتھیوں کی آزادی کی کوشش کرنے کیلئے استعمال کر سکتا۔ لیکن مجھے ایسا ہونے کا زیادہ موقع ملتا دکھائی نہ دیتا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ ''اگر نواب کالا باغ، بلوچستان میں مجھے شکست دلوانے کیلئے جوڑ توڑ کر سکتے تھے تو ایوب خان کیلئے تو کراچی میں ریاستی مشینری کو استعمال کرتے

ہوئے مجھے شکست دلونا زیادہ آسان ہو گا۔ جب صدر ایوب خان کی جانب سے دباؤ آئے گا تو محمود ہارون اور نواب کالا باغ دونوں مجھے چھوڑ دیں گے اور آپ میں سے کوئی بھی میری مدد کرنے کے قابل نہ ہو گا۔" لیکن محمود نے ہار نہ مانی۔ وہ مصر رہے کہ میرے اندیشے بے بنیاد تھے۔ میں نے ان سے کہا، "تم ایک میمن ہو۔ تمہارا خاندان کراچی کے سب سے زیادہ باوسائل خاندانوں میں سے ایک ہے اور نواب کالا باغ پنجاب کے جاگیر دار ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پنجابی جاگیردار کی روح پولیس، ڈی ایس پی اور ایس ایچ او کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ اور تم بزنس مینوں کی زندگی فنانس سیکرٹری کی مٹھی میں ہوتی ہے۔ تم ہماری بیش قیمت پرانی دوستی کو تباہ کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟ اگر تم اب بھی مصر ہو تو جاؤ اور میرے اندیشے حرف بہ حرف نواب کالا باغ تک پہنچا دو۔"

محمود اسی روز لاہور کے لئے روانہ ہو گئے اور اگلے روز آ کر بتایا کہ انہوں نے میرا ہر لفظ نواب کالا باغ تک پہنچا دیا تھا اور آخر الذکر کا جواب یہ تھا کہ اس بار وہ مکمل طور پر یقین حاصل کریں گے کہ حکومتی مشینری اس ضمنی الیکشن میں مداخلت نہ کرے۔

"محمود اور دوسرے دوستوں نے اب مجھ پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ درحقیقت اس معاملے میں تینوں افراد کے مفادات سمٹ کر ایک نقطے پر آ گئے تھے۔ کالا باغ پراچہ کی شکست چاہتے تھے کیوں کہ انہیں ڈر تھا کہ اگر وہ الیکشن جیت گئے تو وہ ایوب کے زیادہ قریب آ جائیں گے اور ان (کالا باغ) کے متعلق تمام زہر آلود باتوں سے ایوب کے کان بآسانی بھر لیں گے۔ جس سے ان کی گورنر شپ خطرے میں پڑ جائے گی۔ محمود اپنی روایتی خاندانی سیٹ بچانا چاہتے تھے جو محفوظ رہتی اگر میں الیکشن جیت لیتا۔ میں بھی بلوچستان کی فوری شکایات کو آواز دینے کے لئے کسی فورم کی تلاش میں تھا۔ یوں مختلف وجوہات کی بنا پر ہم اس منصوبے میں ساتھی بن گئے۔

"یہاں میں اس حلقہ انتخاب کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا

جہاں سے مجھے الیکشن لڑنا تھا۔ ان دنوں لسبیلہ کا انتظامی تعلق کراچی سے تھا۔ مجموعی تقریباً 600 بنیادی جمہوری نمائندہ ووٹرز میں سے تقریباً 200 لیاری اور لسبیلہ کے بلوچ تھے۔ کچھ میمن ووٹروں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ پوزیشن بے حد واضح تھی۔ اگر کوئی حکومتی مداخلت نہ ہوتی تو میری فتح یقینی تھی۔ لیکن اندیشہ تھا کہ اگر ایوب خان مداخلت کا فیصلہ کر لیتے تو دشواریاں ہوتیں۔ حبیب اللہ ایک انتہائی خود پسند شخص تھا اس کے پاس روپیہ پیسہ بہت تھا۔ وہ ایوب خان کی سر پرستی میں تھے۔ وہ اس فریب کے تحت زندہ تھے کہ صدر ایوب کے نامزد کردہ ہونے کے باعث فتح بغیر طلب کئے ان کی ہی تھی۔ انہیں کچھ علم نہ تھا کہ ان کے پیٹھ پیچھے کیا کھچڑی پک رہی تھی۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں انتخابی مہم کا آغاز ہوا۔ محمود کے بڑے بھائی یوسف ہارون میری الیکشن مہم کی قیادت کر رہے تھے۔ نیپ کے کارکنوں کا دیگر اپوزیشن پارٹیوں کے کارکنوں اور طلباء و لیاری کے نوجوانوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالنا اور اس قدر بے مثال جوش و جذبے سے انتخابی مہم چلانا دلوں کو گرما دینے والا منظر تھا۔ نیپ کے بائیں بازو کے اور مارکسی اراکین اس حقیقت کے باوجود کہ سرمایہ دار ہارون خاندان میری پشت پناہی کر رہا تھا، لمحے بھر کو بھی انتخابی مہم کے لئے اپنی بہترین کوششیں کرتے میں نہیں ہچکچائے۔ دوسری جانب صنعت کار نواب کے پاس سرمائے کی قلت نہ تھی جو انہوں نے بنیادی جمہوری نمائندوں کو خریدنے اور انتخابی جلسوں کے لئے کرائے پر ہجوم حاصل کرنے کے لئے دل کھول کر خرچ کیا۔"

ان دنوں میں سیف خالد سے متعارف نہیں تھا لیکن اس دوران وہ جب بھی کراچی آئے، اس انتخابی مہم کا حصہ بنتے رہے۔ وہ کیسے اس سے الگ تھلگ رہ سکتے تھے، آخر ان

کی پارٹی یہ انتخاب لڑ رہی تھی۔ بزنجو صاحب کی کامیابی کے بڑے دُور رس سیاسی نتائج مرتب ہوئے۔ ایوب خان نے سنگین ردِعمل کا مظاہرہ کیا۔ اس نے محمود ہارون اور جام صاحب لسبیلہ کو مغربی پاکستان کی کابینہ سے نکال باہر کیا۔ بلکہ پوری کابینہ ہی برطرف کر دی۔ وہ یہیں تک نہیں رکا۔ اس نے 18 ستمبر 1966 کو مغربی پاکستان کے گورنر نواب کالا باغ کو بھی ہٹا دیا۔ جنرل موسیٰ مغربی پاکستان کے نئے گورنر بنے۔نواب کالا باغ نومبر 1967ء کی ایک صبح پراسرار طور پر اپنے کمرے میں مردہ پائے گئے۔ مبینہ طور پر انہیں اس انجام کو اس کے بیٹوں نے پہنچایا۔

بزنجو ان دنوں مغربی پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کے جنرل سیکرٹری تھے۔ اسی دور میں تاشقند اعلامیہ کے مسئلے پر ایوب، بھٹو اختلافات پیدا ہو گئے۔ بھٹو نے ہر جگہ اٹھتے بیٹھتے تاشقند معاہدے پر تنقید شروع کر دی۔ نیپ پاک۔ بھارت مفاہمت اور دوستی کی حامی تھی اسی لئے معاہدہ تاشقند کی حمایت کرتی تھی۔ پہلے بھٹو نے ایوب خان کو کشمیر میں احمقانہ کارروائی کیلئے قائل کیا تھا۔ اب وہ اس معاہدے کے خلاف پراپیگنڈہ کرکے اسے ایک عوامی مسئلہ بنانے کے در پے تھے۔غوث بخش بزنجو نئے نئے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ اسمبلی میں ان کا پہلا دن تھا جب بھٹو سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ایوب خان نے بھٹو کو برطرف کر کے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر اسلام آباد چھوڑ دینے کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ ایک ہفتہ بعد 16 جون کو وزیر اعظم چین چو این لائی پاکستان کے دورے پر پہنچنے والے تھے۔ بھٹو چو این لائی کے دورے کے دنوں میں اسلام آباد میں رُک کے رہنا چاہتے تھے۔ ایوب خان بھٹو کو یہ موقع نہیں دینا چاہتے تھے اسے خدشہ تھا کہ بھٹو چو این لائی کے ذریعے ایوب خان پر اثر انداز ہونے کی کوشش کریں گے۔ بزنجو سے بھٹو نے کہا کہ اگر انہیں نیپ ایک مناسب عہدہ آفر کرے تو وہ فوراً نیپ جوائن کر سکتے ہیں۔ بزنجو صاحب کا خیال تھا کہ بھٹو صدر یا جنرل سیکرٹری سے کم تر کوئی عہدہ قبول کرنے پر تیار نہ ہوتے۔ بزنجو جانتے تھے کہ نیپ کسی قیمت پر اس کے لئے تیار نہ ہو گی۔ پھر بھی انہوں نے ایک بیان میں کہہ دیا کہ بھٹو کیلئے نیپ کے دروازے کھلے

ہیں۔ اس بیان پر نیپ کے صدر مولانا بھاشانی نے بزنجو صاحب سے وضاحت طلب کر لی کہ آٹھ سال تک فوجی حکومت کی خدمات سرانجام دینے والے بھٹو کو نیپ میں شمولیت کی دعوت کیوں دی گئی۔ اس سے پہلے کہ نیپ کوئی فیصلہ کرتی۔ بھٹو 22 جون کو قومی ہیرو بننے کے سفر پر بذریعہ ریل راولپنڈی سے لاہور روانہ ہو گئے۔

ون یونٹ توڑنے والے کرنسی نوٹ

اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے بعد بزنجو کوئٹہ چلے گئے۔ یہاں ایک بار پھر گرفتاری ان کی منتظر تھی ان دنوں کوئٹہ کے بازاروں میں ایسے کرنسی نوٹ گردش کر رہے تھے جن پر ''ون یونٹ توڑ دو'' کی مہر لگی ہوتی تھی۔ پچاس روپے کا مہر والا نوٹ بزنجو صاحب کی جیب سے نکل آیا جس پر انہیں گرفتار کر کے کوئٹہ جیل میں بند کر دیا گیا۔ دو ہفتے بعد جیل میں ہی ان پر مقدمہ چلا۔ ایوب خان کے پاس بزنجو کے ہاتھوں اپنے امیدوار کی شکست کا بدلہ لینے کے لئے یہ بہترین موقع تھا۔ مقدمے کی چند ساعتوں کے بعد انہیں چودہ سال قید با مشقت کی سزا دے کر منٹگمری جیل میں بند کر دیا گیا۔ یہاں ان پر بدترین قسم کا تشدد روا رکھا گیا۔ منٹگمری جیل میں پہلے ہی روز سے انہیں انتقام کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ ہم بھٹو، بے نظیر اور نواز شریف کے ساتھ ہونے والی سختیوں کا بہت ذکر کرتے ہیں لیکن بلوچ رہنماؤں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

بزنجو اکتوبر 1968ء تک سرگودھا جیل میں رہے۔ اکتوبر میں لاہور ہائی کورٹ میں بزنجو صاحب کی رٹ پٹیشن دائر کی گئی جسے جسٹس کنڈی نے منظور کرتے ہوئے، ان کی رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ رہائی کے بعد وہ بذریعہ ریل کراچی روانہ ہوئے۔ جہاں کینٹ سٹیشن پر ان کا تاریخی استقبال ہوا۔ استقبال کرنے والوں کے ہجوم میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔ کراچی کے کینٹ سٹیشن پر جو لوگ موجود تھے ان میں سے چند ایک کے نام ابھی تک میرے ذہن میں نقش ہیں۔ ان میں بزنجو صاحب کے بڑے صاحبزادے بزن

سمیت انیس ہاشمی، نواز بٹ اور خاکسار بھی موجود تھا۔

نیپ سرگرمیاں 1967ـ68ء

اس تمام عرصے 1965-1968 کے دوران سیف خالد نیپ کی سیاسی سرگرمیوں میں پوری طرح شامل رہے تھے۔ لائلپور میں میاں محمود احمد، لاہور میں سی آر اسلم، راؤ مہروز اختر، سردار شوکت علی، عابد حسن منٹو اور ملتان میں قسور گردیزی چین نوازی کی طرف مائل تھے اور ان کی جاری کردہ دستاویزات سے یہ رجحان ظاہر بھی ہوتا تھا۔ داخلی طور پر تنازعہ کا باعث ستمبر 1965ء کی جنگ، مسئلہ کشمیر، تاشقند کا معاملہ اور بھارت دشمنی جیسے مسائل تھے۔ ابھی سوویت یونین کے سوشل سامراج ہونے کی بات شروع نہیں ہوئی تھی۔ سیف خالد کا ذہن ان تمام مسئلوں کے بارے میں کسی ابہام کا شکار نہیں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان معاہدہ تاشقند، ان حالات میں بہترین معاہدہ تھا۔ بھارت سے جنگ بندی نہ ہوتی تو پاکستان تباہی کی راہ پر چل پڑتا۔ مسئلہ کشمیر کے بارے میں وہ پارٹی کے مؤقف کے حامی تھے کہ اس مسئلے کا حل حقِ خود ارادیت کے اصول کی بنیاد پر طے کیا جائے۔ بھارت سے جنگ کسی طرح اس مسئلے کا حل نہیں تھی جب کہ پارٹی کا چین نواز دھڑا اس مؤقف کا مخالف تھا اور معاہدہ تاشقند پر کھل کر تنقید کرتا تھا۔ بعد ازاں سرحد نیپ کے جنرل سیکرٹری افضل بنگش بھی چین نواز ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود پشتونوں کے قومی حقوق کے حامی تھے۔

اسی سال 31 جنوری اور یکم فروری کی درمیانی شب مغربی پاکستان ریلوے کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی جس میں دیگر ساتھیوں کے علاوہ شمیم اشرف ملک اور سیف خالد بھی پیش پیش تھے۔ 14 فروری کو مغربی پاکستان نیپ کے ایک سرکلر میں بتایا گیا کہ ہڑتال ایک ہفتے تک جاری رہی۔ اس اثناء میں ریلوے ٹریفک مکمل طور پر معطل رہی۔ ریلوے انتظامیہ نے ورکشاپوں میں خود تالہ بندی کر دی۔ اگرچہ 2 فروری کو رات گئے ریلوے انتظامیہ اور مزدور رہنماؤں کے درمیان تصفیہ ہو گیا لیکن تصفیہ کے دو گھنٹوں کے

اندر اندر انتظامیہ نیپ اور ریلوے کے مزدور رہنماؤں کی گرفتاری کے لئے حرکت میں آ گئی۔ گرفتار شدگان میں پنجاب و بہاولپور نیشنل عوامی پارٹی کے صدر سی آر اسلم، گڑھی شاہو لاہور کے سیکرٹری اسلم راحیل مرزا، لاہور نیپ کی مجلس عاملہ کے رکن اور ٹریڈ یونین رہنما فضل الٰہی قربان، مجلس عاملہ کے ایک اور رکن ضیاالدین شامل تھے جنہیں ان کے گھروں سے گرفتار کر کے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت نظر بند کیا گیا۔ معاملہ ان گرفتاریوں تک نہیں رُکا بلکہ اگلے روز پنجاب نیپ کے جوائنٹ سیکرٹری سردار شوکت علی مغلپورہ گنج لاہور کے سیکرٹری بشیر احمد، ٹریڈ یونین رہنما عبدالغفور اور مرزا ابراہیم کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔ سندھ سے بھی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ مغربی پاکستان کی مجلس عاملہ کے رکن اور مزدور رہنما ڈاکٹر اعزاز نذیر، مغربی پاکستان نیپ کی کونسل کے اراکین جمعہ خان اور حسن حمیدی کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ لاہور میں ریلوے مزدوروں پر لاٹھی چارج اور فائرنگ بھی ہوئی۔

6فروری 1967ء کو تمام صورت حال پر غور کرنے کے بعد مغربی پاکستان نیپ کے رہنماؤں میاں محمود علی قصوری، سید قسور گردیزی، افضل بنگش، میجر اسحاق محمد، میاں عارف افتخار ا، انیس ہاشمی، شیخ رفیق احمد، رؤف طاہر، چوہدری انور اور خالد محمود نے مذمتی بیان جاری کیا۔ لائلپور میں سیف خالد اور دیگر ساتھیوں نے گرفتار شدگان کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا۔

پاکستان نیشنل عوامی پارٹی مغربی پاکستان کی مجلس عاملہ کا اجلاس 18-19 مارچ 1967ء بروز ہفتہ و اتوار، لاہور میں منعقد ہوا۔ اجلاس کی صدارت پارٹی کے صدر میاں محمود علی قصوری نے کی۔ اجلاس میں محمود الحق عثمانی، ارباب سکندر خان، محمد افضل بنگش، سائیں عزیز اللہ، سید محمد باقر شاہ، انیس ہاشمی، سید محمد قسور گردیزی، میاں عارف افتخار، ایم این اے میاں محمود اختر، شیخ رفیق احمد، راؤ بہروز اختر خان، شیخ ظہیر الدین، چودھری فتح محمد، رؤف طاہر، چودھری روز داد خان، سیف خالد، خالد محمود نے شرکت کی۔ اجلاس کی پہلی نشست 18 مارچ کو صبح دس بجے سے اڑھائی بجے تک اور دوسری نشست شام کے ساڑھے پانچ بجے سے رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک ہوئی۔

تیسری نشست 19 مارچ صبح دس بجے سے چار بجے بعد دوپہر تک جاری رہی۔ اس میں ملک کے سیاسی اور معاشی حالات، پارٹی کی تنظیم، خوراک کی قلت اور مہنگائی، کسانوں کی حالت بہتر بنانے، نہروں میں پانی کی کمی، بجلی کی ناقص و کم سپلائی، ریلوے ہڑتال، مزدوروں کے مسائل اور کراچی پورٹ ٹرسٹ نیز دیگر صنعتی اداروں میں بے چینی۔ طلباء کے مسائل، حیدر آباد یونیورسٹی کے طلباء پر تشدد اور پارٹی کے مقتدر رہنماؤں اور کارکنوں کی کثیر تعداد میں نظر بندی اور پارٹی لٹریچر کی درجن کے قریب کتابوں اور کتابچوں کی ضبطی، سے پیدا شدہ حالات پر غور کیا گیا۔

اسی سال نیپ کی جنرل کونسل کا اجلاس ڈھاکہ میں منعقد ہوا جس کی روداد بی ایم کٹی اور نواز بٹ نے تحریر کی۔ نواز بٹ کے مطابق اس میں سیف خالد، انیس ہاشمی اور مغربی پاکستان نیپ کے متعدد رہنماؤں اور کارکنوں نے شرکت کی۔

سیف خالد کے مشرقی پاکستان نیپ کے صدر پروفیسر مظفر احمد سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ پروفیسر مظفر کو بنگالی اور انگریزی زبان آتی تھی، وہ نیپ اور کمیونسٹ پارٹی کے اجلاسوں میں شرکت کرنے کیلئے متعدد بار مغربی پاکستان آئے۔

نیشنل عوامی پارٹی پنجاب و بہاولپور نے 26 اپریل 1967ء کو انٹی امپیرلزم ڈے منایا۔ دفعہ 144 کی وجہ سے چار چار کے گروپوں میں امریکی سامراج مردہ باد اور پاکستان زندہ باد کے پوسٹر اٹھا کر پارٹی کے کارکنوں نے پر رونق بازاروں اور شاہراہوں پر خاموش مظاہرہ کیا۔ جہاں جہاں دفعہ 144 نافذ نہیں تھی، ان مقامات پر ورکرز کے اجلاس منعقد کئے گئے۔ ان اجلاسوں میں امریکی سامراج کے خلاف قرار دادیں منظور کر کے اخباری نمائندوں اور پارٹی کے مرکزی دفتر کو ارسال کی گئیں۔ مرکز کی طرف سے ارسال کئے گئے پوسٹر اور پمفلٹ مختلف شہروں میں تقسیم کئے گئے۔ اس احتجاج کو پنجاب نیپ کے صدر سی آر اسلم اور جنرل سیکرٹری سید قسور گردیزی کی طرف سے منظم کیا گیا۔

پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کی مرکزی مجلس عامہ کے رکن میاں محمود احمد نے 2 مئی کو لائلپور سے سرکلر جاری کیا جس میں کہا گیا کہ پاکستان کے خلاف امریکی عزائم واضح ہو

چکے ہیں اور پاکستان کے سابقہ حکمران اور موجودہ حکومت نیشنل عوامی پارٹی کے خلاف منفی پراپیگنڈہ کر رہے ہیں اس ضمن میں محمد علی، دولتانہ اور مودودی کا عوام دشمن گٹھ جوڑ سامنے کی بات ہے۔ نیپ ماضی میں بھی دائیں بازو کے اس عوام دشمن ٹولے کا مقابلہ کرتی رہی ہے اور آئندہ بھی کرتی رہے گی۔ نیپ، پاکستان کے ایماندار اور بہادر عوام کی حمایت چاہتی ہے تاکہ ملک کو آگے لے جانے کے لئے مثبت خطوط پر ایک متحدہ محاذ تشکیل دیا جائے۔

19 تا 21 مئی 1967ء کو ڈھاکہ میں پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کی مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس کی روداد مغربی پاکستان نیشنل عوامی پارٹی نے لاہور سے شائع کی۔ اس کے پیش لفظ میں مرکزی مجلس عاملہ کے رکن شیخ رفیق احمد نے لکھا:

''موجودہ قرارداد میں پارٹی کے مؤقف میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ پارٹی ہمیشہ کی طرح آج بھی آمریت کے خاتمہ اور پارلیمانی جمہوریت کی بحالی کے لئے پروگرام کی بنیاد پر دوسری اپوزیشن پارٹیوں کے ساتھ اتحاد کی حامی ہے

پارٹی یہ سمجھتی ہے کہ ملک میں سماجی تبدیلیاں لانے اور سامراج دشمن خارجہ پالیسی کے لئے پالیمانی جمہوریت کی بحالی لازمی شرط ہے۔ پارٹی کے سیکڑوں رہنما اور کارکن جیلوں میں بند ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ سیاسی قیدیوں کی رہائی اور کالے قوانین کے خلاف جدوجہد کریں۔ اس طرح عوامی مطالبات کی بنیاد پر جمہوری عناصر کو اس جدوجہد میں اپنے ساتھ لائیں۔ پاکستان ابھی تک اینگلو امریکی بلاک کے فوجی معاہدوں اور مشروط امریکی امداد یا قرضوں کی زنجیر میں بندھا ہوا ہے جب تک مغرب کی معاشی محتاجی قائم ہے اور پاکستان کے حکمران امداد کے لئے بھیک مانگتے رہیں گے اس وقت تک آزاد خارجہ پالیسی کا تصور ممکن نہیں۔''

اجلاس میں منظور ہونے والی قرارداد میں سب سے پہلے مشرقی اور مغربی پاکستان میں سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں کی رہائی کا پُرزور مطالبہ کیا گیا۔ شہری آزادیوں اور بنیادی حقوق سلب کرنے پر گہری تشویش ظاہر کی گئی۔ اجتماع کرنے، اظہار بیان اور تنظیم بنانے کی آزادیوں سے مسلسل حکومتی انکار پر تنقید کی گئی۔ بتایا گیا کہ ملک کے دونوں حصوں سے

پارٹی کے کم و بیش دو درجن پمفلٹ ضبط کئے گئے۔ مزدور اور کسان رہنماؤں کی نقل و حرکت پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ گرفتار شدگان کے حوالے سے کہا گیا کہ پارٹی کے بعض نامور رہنما جن میں شہزادہ عبدالکریم، عبدالصمد خان اچکزئی، نمی چودھری، اور اکل سین شامل ہیں، مسلسل قید و بند کا شکار ہیں۔

یہ اجلاس پارٹی کے دوسرے رہنماؤں کی نظر بندی پر بھی سخت احتجاج کرتا ہے، حکومت نے بلاوجہ مشرقی پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کے جائنٹ سیکرٹری جناب عبدالحلیم، جناب حانی خان (نرائن گنج) جناب رمیش مترا (پبنہ) جناب ویلیا لہری رتن سین (کھلنا) جناب وشنو چیٹر جی (کھلنا) جناب دُرگا داس بکری (پبنہ)، جناب چتراجن بھٹا چاریہ (پبنہ) اور جناب امجد حسین (رنگ پور) کو 1968 سے گرفتار کر رکھا ہے۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ امتناعی نظربندی کے قوانین کا استعمال اندھا دھند کیا جا رہا ہے اور ان کے تحت نیشنل عوامی پارٹی اور دیگر سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کے علاوہ ٹریڈ یونین کارکنوں کو بھی گرفتار کیا گیا ہے۔ مرزا محمد ابراہیم، ملک فضل الٰہی قربان۔ میر رسول بخش تالپور، جناب سراج الحسن خان۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جناب شفیق الرحمن، وائس پرنسپل عبدالحیٔ جناب پرتاپ الدین جناب عبدالاسلام خان، جناب شمس الحق خان ناب عبدالحسین، پروفیسر غازی لطف الرحمن۔ پروفیسر اظہر الدین، جناب امین الاسلام، جناب اجامت علی اور اسی طرح پچاس سے زائد ٹریڈ یونین کارکن اور طلبا حکومت کی غیر جمہوری کارروائی کے تحت نظر بند کئے گئے ہیں

اسی طرح عوامی لیگ کے بیشتر رہنما جن یں جناب شیخ مجیب الرحمن، جناب تاج الدین، جناب میزان الرحمن اور منورنجن دھر اور کئی دیگر رہنما شامل ہیں، کافی عرصہ سے نظر بند ہیں۔

یہ اجلاس اس امر پر بھی اظہار تشویش کرتا ہے کہ ویسٹ پاکستان کریمنل لاء امنڈمنٹ ایکٹ سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے اور جناب اعزاز نذیر جناب حسن حمیدی ایڈووکیٹ اور جناب جمعہ خان کے علاوہ 39 ٹریڈ یونین کارکنوں اور ریلوے

ملازمین کے مقدمات کو جرگہ سپرد کیا گیا ہے۔ پارٹی کا یہ اجلاس حکومت کی اس کارروائی کے خلاف شدید احتجاج کرتا ہے۔

''یہ اجلاس مزید تشویش کا اظہار کرتا ہے کہ پارٹی کے کئی رہنما جن میں شیخ عبدالمجید سندھی، جناب محمود الحق عثمانی، میاں محمود علی قصوری، جناب عبدالجبار، سردار عطا اللہ خان مینگل، جناب حبیب جالب اور مرزا عجاز بیگ ایڈووکیٹ شامل ہیں کے خلاف سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر مقدمات چلائے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ریلوے، جوٹ ملز، واپڈا وغیرہ محکموں کے سیکڑوں ملازمین کے خلاف ہڑتال میں حصہ لینے کی وجہ سے مقدمات چل رہے ہیں۔ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کیلئے یہ امر بھی تشویش کا باعث ہے کہ حکومت طلباء کے مطالبات کو منظور کرنے کی بجائے تشدد اور گرفتاریوں کے ذریعہ انہیں کچلنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ مزید برآں جناب ارشد حسین، جناب محمد رشید، جناب نور السلام، جناب شوکھنداد ستیار، چودھری ہارون الرشید، جناب عبدالستار اور جناب شوچین بوس کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے ہیں۔

''لہٰذا مجلس عاملہ کا یہ اجلاس حکومت سے پر زور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تمام نظر بندوں کو رہا کرے۔ سیاسی ٹریڈ یونین اور کسان رہنماؤں کے خلاف مقدمات واپس لے۔ گرفتاری کے تمام وارنٹ منسوخ کرے اور سیاسی مقدمات میں ضبط شدہ املاک واپس کرے۔''

قرارداد میں پارلیمانی جمہوریت اور عوامی حقوق کے لئے جدو جہد کی بات کرتے ہوئے کہا گیا کہ پارٹی نے ہمیشہ عوام کی صحیح رہنمائی کی ہے۔ سامراجی ریشہ دوانیوں اور مشرق وسطیٰ میں سامراج دشمن جدو جہد کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا کہ ان حالات میں نیپ پر ملک میں جمہوریت کے لئے اور سامراج کے خلاف لڑنے والے ایک ہراول دستے کی حیثیت سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ سامراجی منصوبوں اور سرگرمیوں کے خلاف لڑنے کے لئے پاکستانی جمہوریت کی بحالی، حق بالغ رائے دہی کی بنیاد پر مجالس قانون ساز کے براہِ راست انتخابات، مشرقی پاکستان کی علاقائی خود مختاری، مغربی پاکستان میں صوبائی خود

مختاری اور شہری آزادیوں کے لئے حزبِ اختلاف کی جماعتوں میں باہمی اتحاد و تعاون کے لئے جدو جہد کرے اور یہ کہ جمہوریت کے حصول کی جدو جہد سامراجی غلبے کے خلاف جدوجہد سے عبارت ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مندرجہ ذیل دس نکاتی پروگرام کا اعلان کیا گیا۔:

1۔ حق بالغ رائے دہی اور براہِ راست انتخاب
2۔ تمام فوجی معاہدوں کی منسوخی
3۔ پاکستان کے دونوں بازوؤں کی مکمل علاقائی خود مختاری
4۔ آزاد اور غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی اور سوشلسٹ ملکوں سے قریبی تعلقات
5۔ خوراک میں خود کفالت
6۔ صنعتی مزدوروں کے ٹریڈ یونین حقوق کے تحفظ کی ضمانت
7۔ بنکوں، بیمہ کمپنیوں، غیر ملکی تجارتی و اقتصادی اداروں اور اہم ملکی صنعتوں کو قومیانے کے اقدامات۔
8۔ ہنگامی حالات کے خاتمے کا اعلان
9۔ غیر ملکی سامراجی سرمائے کی ضبطی۔
10۔ جموں و کشمیر کے عوام کے لئے حقِ خود ارادیت کی حمایت اس پروگرام کی کامیابی کے لئے متحد و منظم لائحہ عمل کے لئے عوام سے غور وفکر کی اپیل کی۔

نیپ میں دھڑے بندی

پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کی مرکزی مجلسِ عاملہ کے اس اجلاس کے دور رس نتائج سیف خالد کے سیاسی مؤقف کے لئے اہم تھے۔ نیپ کے اندر جن مسائل پر اختلافی مباحث چل رہے تھے، ان میں اہم ترین پارلیمانی جمہوریت اور عوامی جمہوریت کا معاملہ تھا۔ اب عالمی سطح پر سوویت یونین اور عوامی جمہوریہ چین کے درمیان اختلافات کھل کر سامنے آچکے تھے اور یہ پاکستان سمیت مختلف ملکوں کی کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹیوں تک

پہنچنے لگے تھے۔ سیف خالد کا تعلق کمیونسٹ پارٹی سے بھی تھا اور وہ نیشنل عوامی پارٹی کے رہنما بھی تھے۔ 67-1966ء کے دوران مغربی پاکستان نیپ اور نیپ پنجاب و بہاولپور میں ہونے والے مباحث اور ان کے اجلاسوں میں منظور ہونے والی قرار دادوں سے پارٹی میں دھڑے بندی کھل کر سامنے آ رہی تھی۔ سیف خالد اس نئی صف بندی میں روس نواز دھڑے کا حصہ نظر آئے۔ نیشنل عوامی پارٹی لائلپور میں سیف خالد اور میاں محمود احمد کے درمیان اختلافات کھل کر سامنے آ چکے تھے۔ چنانچہ 7 جون 1967ء کو نیشنل عوامی پارٹی لائلپور کے زیر اہتمام جو جلسہ عام منعقد ہوا، اس میں سیف خالد کہیں نظر نہیں آئے۔ اس جلسہ عام کی صدارت سٹی نیشنل عوامی پارٹی لائلپور کے صدر چودھری سردار علی ایڈووکیٹ نے کی۔ یہ جلسہ عام متحدہ عرب جمہوریہ پر اسرائیلی جارحیت کی مذمت اور عرب عوام کی حمایت کے لئے منعقد ہوا جس میں نیپ پنجاب و بہاولپور کے صدر سی آر اسلم، نائب صدر راؤ مہروز اختر، جوائنٹ سیکرٹری سردار شوکت علی، نیپ لائلپور کے نائب صدر میاں محمود احمد، نیپ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے جنرل سیکرٹری غیاث الدین جانباز اور دیگر مقامی رہنماؤں نے تقریریں کیں دوسرے روز منظور ہونے والی قرار داد میں یہ بھی کہا گیا کہ امریکی امداد کے بل پر بھارت نے کشمیری عوام کی آزادی اور حقوق غصب کر رکھے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ متحدہ عرب جمہوریہ پر اسرائیل کے دوسری مرتبہ جارحانہ حملے سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ ستمبر 1965ء میں پاکستان کی مقدس سرزمین پر توسیع پسند بھارت کا جارحانہ حملہ بھی امریکی سامران کے ایما اور اشارے پر کیا گیا تھا۔ ان حالات میں پاکستانی عوام کو اپنے فرائض کے بارے میں ہر گھڑی چوکنا رہنے اور ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے امریکی سامراج کے پروردہ ایجنٹوں کی حرکات وسکنات پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت سے ہرگز غافل نہیں ہونا چاہئے۔

دھوبی گھاٹ کے اس جلسہء عام میں زرعی یونیورسٹی لائلپور میں زیر تعلیم، شام، اردن، فلسطین اور سعودی عرب کے طلبا کا لائلپور کے شہریوں کے نام پیغام بھی پڑھ کر سنایا گیا۔ عرب طلباء نے آزمائش کی گھڑی میں حمایت کرنے پر پاکستانی عوام کا شکریہ ادا کیا

اور اس یقین کا اظہار کیا کہ بہت جلد ہم فلسطین اور کشمیر کو حاصل کر کے رہیں گے۔

1967ء میں ہی ملک بھر میں نیشنل عوامی پارٹی کے ہر سطح پر انتخابات کے شیڈیول کا اعلان کیا گیا۔ 24 جولائی کو مغربی پاکستان نیپ کے قائم مقام جنرل سیکرٹری انیس ہاشمی نے اس سلسلے میں ایک سرکلر جاری کیا جس میں ملک بھر میں رکنیت سازی اور کارکنان کے جلسے کرنے کی تاریخیں دی گئیں۔ اگست کے پہلے ہفتے میں کراچی، تیسرے ہفتے میں پنجاب و بہاولپور اور ستمبر میں سندھ میں جلسوں کا اعلان کیا گیا۔

نیپ میں دھڑے بندی کا واضح اشارہ، نیشنل عوامی پارٹی لائلپور کے اجلاس سے ملتا ہے۔ اس اجلاس میں بھی سیف خالد کہیں نظر نہیں آئے۔ اجلاس سے جن رہنماؤں نے خطاب کیا، ان میں سی آر اسلم، سید محمد قسور گردیزی، میاں عارف افتخار، سردار شوکت علی، راؤ مہروز اختر، چودھری فتح محمد، غلام محمد ہاشمی، سائیں عمر دین اور جمال خان بلوچ شامل تھے۔ اجلاس میں ضلع لائلپور کے دو سو چالیس کونسلروں اور تین سو مبصرین نے شرکت کی۔

اجلاس کے اختتام پر آئندہ دو سال کے لئے نیشنل عوامی پارٹی لائلپور کے لئے جن عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا، اس میں بھی سیف خالد کا نام شامل نہیں تھا۔ وہ 20 رکنی مجلس عاملہ سے بھی باہر تھے۔

عملاً نہ صرف لائلپور بلکہ تمام پنجاب میں چین نوازی پوری طرح سرایت کر چکی تھی۔ بی ایم کٹی اپنی خودنوشت سوانح عمری میں اس کا تفصیلی تجزیہ کرتے ہیں:

''مشرقی پاکستان کے کمیونسٹ حضرات جو کم و بیش سب کے سب روس نواز تھے، وہ بھی مغربی پاکستان کے نظر انداز انہ برتاؤ پر شکوہ کناں تھے۔ وہ دراصل مغربی پاکستان کمیونسٹ پارٹی میں موجود پنجابی ٹولہ کے رویئے سے نالاں تھے وہ دعویٰ تو آل پاکستان پارٹی کا کر رہے تھے لیکن تھے گویا پنجاب پارٹی۔ 1965ء کی جنگ کے بعد پنجاب کے کمیونسٹ چین نواز ہو گئے لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے مشرقی پاکستان کی کمیونسٹ لابی سے بھی ناتا جوڑے رکھا اور یوں پنجاب لیڈر شپ کہلانے کی بجائے مغربی پاکستان لیڈر شپ کا نام اپنے لئے بحال رکھنا چاہا۔ اسی دوران کمیونسٹ پارٹی آف سندھ اور مشرقی

پاکستان کے درمیان ایک معاہدہ ہوگیا۔ اس عمل میں جمال نقوی، نازش امروہی اور سندھ کے دیگر کمیونسٹ حضرات قومی سطح پر مشرقی پاکستان پارٹی کے تعاون سے ابھر کر سامنے آگئے۔

تقریباً پنجاب کی پوری کمیونسٹ پارٹی کی قیادت چین نواز ہو چکی تھی جس کی وجہ سے وہاں روس نواز پارٹی عملاً ختم ہو کر رہ گئی۔

مشرقی پاکستان کی پارٹی قیادت بشمول مونی سنگھ اور پروفیسر مظفر احمد نے سندھ یونٹ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے آپ کو مغربی پاکستان کمیونسٹ آرگنائزنگ کمیٹی میں تبدیل کریں۔

اس کوشش میں سندھ کی کمیونسٹ پارٹی نے عزیز سلام بخاری کی قربانی دے کر جو چین نواز تھے، امام علی نازش کو آرگنائزنگ کمیٹی کا جنرل سیکرٹری بنالیا۔

اس وقت مونی سنگھ نے سندھ یونٹ سے کہا کہ وہ میر غوث بخش بزنجو کو جو تقسیم ہند سے پہلے کمیونسٹ پارٹی میں رہ چکے تھے اور بعد میں اسے چھوڑ کر قلات کی قوم پرست تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان کو اور میر گل خان نصیر کو نئی آرگنائزنگ کمیٹی میں شامل کرلیں۔ اس طرح یہ دونوں حضرات بلوچستان کے نمائندوں کی حیثیت سے کمیٹی میں شامل کئے گئے۔

پنجاب میں شمیم اشرف ملک ہی ایک قابل ذکر معروف شخص تھے جو ابھی تک پکے روس نواز تھے۔ اس دوران نیپ روس نواز اور چین نواز گروپوں میں تقسیم ہو گئی۔ پنجاب کے چین نواز کمیونسٹ بھاشانی نیپ میں شامل ہوگئے۔ پنجاب سے شمیم ملک اور کمیونسٹ پارٹی کا سندھ یونٹ ولی خان کی نیپ میں چلا گیا۔

سندھ سے سائیں عزیز اللہ اور ڈاکٹر اعزاز نذیر نے پنجاب کے شمیم اشرف ملک کو حیدر آباد آنے کی دعوت دی جہاں ایک میٹنگ میں نازش اور جمال نقوی نے مشرقی پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کا پارٹی تھیسس شمیم اشرف ملک پر واضح کیا جس کی بنا پر وہ مغربی پاکستان کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم نو کرنا چاہتے تھے۔

1966ء میں قائم کردہ آرگنائزنگ کمیٹی میں پنجاب سے شمیم اشرف ملک، سندھ

سے امام علی نازش اور جمال نقوی، بلوچستان سے میر بزنجو اور گل خان نصیر اور صوبہ سرحد سے اجمل خان خٹک شامل تھے صفِ اول کی سیکرٹریٹ نازش، جمال نقوی اور شمیم ملک پر مشتمل تھی۔

''نازش زیرِزمین رہے تو اصل طاقت جمال نقوی کے پاس رہی جو پارٹی کے تمام امور از خود انجام دیتے تھے۔ جمال نقوی کے غلط رویے کے باعث پارٹی کے تمام فعال کارکن خصوصاً نوجوان نسل نے 1967ء میں پارٹی سے کنارہ کشی اختیار کر لی، ان میں ڈاکٹر شیر افضل ملک جو کراچی کی طلبا تحریک کے سرخیل تھے، اس کے علاوہ انور احسن صدیقی، بی۔ ایم۔ کٹی، ہادی نقوی، فیصل دُرانی اور دیگر کئی احباب شامل تھے لیکن مرحوم ڈاکٹر رُکن الدین حسان، انیس ہاشمی اور کچھ اور لوگ کچھ عرصے رکے رہے اور پھر انہی وجوہات کی بنا پر انہوں نے بھی پارٹی کو خیر باد کہہ دیا۔ وہ شہری اور صوبائی سطح پر پارٹی کے اکابرین میں تھے۔

1967ء میں نیپ کی تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان (کمیونسٹ پارٹی) کے ارکان جو پشاور میں ولی خان (نیپ) کنونشن میں شرکت کے لئے آئے تھے وہ پارٹی کے حکمران انداز سے از حد مایوس ہوئے، اس کنونشن میں انہیں شمیم ملک اور بزنجو وغیرہ سے پتا چلا کہ جمال نقوی کس طرح سندھ یونٹ پر اپنی من مانی کر رہے ہیں۔

''نازش کی بے چارگی اور جمال نقوی کی غاصبانہ پالیسیوں کے باعث شمیم ملک اور اس کے پنجاب کے دیگر ساتھیوں نے نازش کو تجویز پیش کی کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کی سیکر ٹریٹ کو لاہور شفٹ کر دیں لیکن جمال نقوی پارٹی کو اپنے زیرِ تسلط رکھنے کے حامی تھے۔ اگلے سات سال کمیونسٹوں نے نیپ میں رہ کر اپنا کام جاری رکھا جب کہ اپنی انڈر گراؤنڈ تنظیم کے جنرل سیکرٹری نازش ہی رہے لیکن جمال نقوی سدِّ راہ بنے رہے۔''

پیپلز پارٹی کا قیام

30 نومبر 1967ء کو پاکستان میں ایک بڑی سیاسی پیش رفت دیکھنے میں آئی جس کے نتیجے میں اس روز لاہور میں پاکستان پیپلز پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ نیپ میں کسی ممتاز عہدے پر فائز نہ ہو سکنے پر ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی الگ جماعت بنانے کا فیصلہ کیا۔

اس دو روزہ تاسیسی اجلاس نے اگلی کئی دہائیوں کے لئے پاکستان کی سیاسی تاریخ پر انمٹ نقوش ثبت کئے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے تاسیسی اجلاس میں پچیس قرار دادیں منظور ہوئیں اور دس بنیادی دستاویزات جاری کی گئیں۔ قرار داوں میں مسلح افواج اور مادرِ ملت کو خراج عقیدت، کنونشن کے انعقاد میں رکاوٹ ڈالنے والوں کی مذمت، کشمیر، آسام، فوجی معاہدات، ملکی دفاع، زمینداری اور جاگیرداری کے مسائل، صنعتی کارکنوں کے لئے مطالبات، عوامی حقوق کی بازیابی کے لئے اپوزیشن جماعتوں، تعلیمی آزادی، ویت نام، مشرقِ وسطیٰ، تیسری دنیا کے استحکام، قبرص، پریس ٹرسٹ کے خاتمے، اقلیتوں کے حقوق اور پناہ گزینوں کی آباد کاری جیسے اہم مطالبات سے عبارت تھیں۔ بنیادی دستاویزوں میں پارٹی کے نام اور پرچم کے علاوہ ایک نئی پارٹی کیوں؟ پاکستان مں سوشلزم کیوں؟، بنیادی اصول، معیشت کے ارتقاء، اتحادِ عوام کے اعلان، جموں و کشمیر، آسام سے خصوصی تعلقات رکھنے کی ضرورت اور شیخ مجیب الرحمن کے چھ نکاتی فارمولے کے جواب جیسے موضوع شامل کئے گئے تھے۔

پاکستان نیشنل عوامی پارٹی۔ ولی گروپ

سیف خالد دیکھ رہے تھے کہ نیپ تیزی سے تقسیم کی جانب بڑھ رہی ہے، جلد ہی اس کا نتیجہ سامنے آ گیا۔ 24 ستمبر کو لیاقت آباد کراچی میں کراچی نیپ کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں 200 نومنتخب کونسلروں اور پارٹی ارکان نے شرکت کی۔ پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کے نائب صدر سید قسور گردیزی نے اجلاس کی صدارت کی۔ کراچی نیپ کے کونسلروں میں

سے عہدیداروں کا انتخاب ہوا۔ علاؤالدین احمد عباسی صدر، عبدالوحید صدیقی جنرل سیکرٹری، کنیز فاطمہ اور عزیز اللہ ابوالخیری نائب صدور، فاروق فہیم اور ظفر اختر جوائنٹ سیکرٹری اور شیخ گلزار احمد کو خزانچی کا عہدہ ملا۔ 20 رکنی مجلس عاملہ کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔ یہ انتخاب آئندہ دو سال کے لئے تھا۔ کراچی نیپ کے مختلف وارڈوں کے وفود کی شرکت کے علاوہ نیشنل عوامی پارٹی کی مرکزی مجلس عاملہ کے تین ارکان سی آر اسلم، میاں محمود احمد اور سردار شوکت علی بھی اجلاس میں شریک تھے۔

اس اجلاس کی خاص بات یہ تھی کہ ایک قرارداد کے ذریعے محمود الحق عثمانی، محمود علی قصوری اور میجر اسحاق کی پارٹی مخالف سرگرمیوں کی مذمت کی گئی اور پارٹی کے صدر مولانا عبدالحمید خان بھاشانی اور سی آر اسلم پر اعتماد کا اظہار کیا گیا۔ نیشنل عوامی پارٹی کے نائب صدر سید قسور گردیزی نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ پارٹی میں داخلی تناؤ اور محمود الحق عثمانی، محمود علی قصوری اور میجر اسحاق کے پارٹی کی جانب بے رحمانہ سلوک سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیسے ان تینوں ساتھیوں نے پارٹی کے خلاف سازش کی اور پارٹی مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہوئے اور پارٹی کے سامراج دشمن کردار کو بدلنے کی سرتوڑ کوششیں کیں۔ قسور گردیزی نے انکشاف کیا کہ ان تینوں نے پارٹی آئین میں سوشلزم کے بارے میں ترامیم قبول کرلیں کیونکہ وہ پارٹی کارکنوں کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ انہوں نے پارٹی نصب العین کے خلاف سازش کی اور ہر وقت الزامات لگانے میں مصروف رہے۔ نواز بٹ کا کہنا ہے کہ یہ اجلاس دراصل زین الدین گروپ کا اجلاس تھا۔ ان کے مقابل کراچی نیپ کے روس نواز گروپ کے صدر انیس ہاشمی تھے اور جنرل سیکرٹری نواز بٹ۔ گویا دسمبر 1967 تک کراچی میں پارٹی دو دھڑوں میں بٹ چکی تھی۔ نیپ کی تقسیم کے معاملے پر غوث بخش بزنجو نے تفصیل سے روشنی ڈالی۔ حقائق کی صحت کے لئے ان کے بیان سے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں:

''مولانا بھاشانی اور پارٹی میں ان کے چند ہم خیال حامیوں کی جانب سے صدارتی الیکشن میں ایوب خان کی حمایت اور بھارت کے ساتھ 1965ء کی جنگ میں

انہوں نے ایوب خان کی جو پشت پناہی کی تھی، اس کے باعث نیپ میں تناؤ پھوٹ پڑا تھا۔ اپنے ایوب نواز مؤقف پر بحث کے لیے سینٹرل ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بلانے سے مولانا کے انکار اور اس کے بعد آئینی طور پر جس قدر اراکین کی ضرورت تھی اس سے زیادہ تعداد میں اراکین کے مطالبے کے باوجود نیشنل کونسل کا اجلاس بلانے سے انکار، گویا اونٹ کی کمر پر لادا جانے والا آخری تنکہ ثابت ہوا۔ نومبر 1967ء میں نیشنل کونسل اور سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے ساتھ پارٹی کے کئی وہ سینئر اراکین، جو مولانا بھاشانی کی جانب سے اختیار کیے گئے غلط سیاسی مؤقف پر ان سے متفق نہ تھے اور ان کے غیر جمہوری رویے پر برہم تھے، انہوں نے ڈھاکہ میں ملاقات کی اور الگ ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ مولانا کا نیپ کے بنیادی سیاسی مؤقف سے انحراف پارٹی میں اس بدقسمت تقسیم کا باعث تھا۔ جس قدر جلد ممکن ہو پایا، پشاور میں نیپ کی قومی کونسل کا اجلاس منعقد کروانے پر اتفاق کیا گیا اور مغربی پاکستان کی قیادت سے کسی تاخیر کے بغیر تاریخوں اور جائے مقام کا فیصلہ کرنے کو کہا گیا۔

''پارٹی کو اب مولانا بھاشانی کی جگہ نئے صدر کا انتخاب کرنا تھا۔ اگلے ہفتوں میں دو امیدواروں کے نام سامنے آئے: میاں محمود علی قصوری اور محمود الحق عثمانی۔ جب یہ معلوم ہوا کہ مغربی پاکستان کے تقریباً تمام اراکین قصوری کو جب کہ مشرقی پاکستان کے تمام اراکین عثمانی کو صدر بنانا چاہتے تھے تو ایک بے قاعدہ صورتِ حال سامنے آ گئی! جب کہ دونوں امیدواروں کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا!

میں ان دونوں سرگودھا جیل میں قید تھا۔ قصوری اور عثمانی دونوں نے جیل میں مجھ سے الگ الگ ملاقات کی۔ ہم نے نئی پارٹی کی تشکیل سے متعلق معاملات اور اس ایشو پر بھی بات چیت کی کہ پارٹی کا صدر کسے ہونا چاہیے۔ میرا انہیں ذاتی مشورہ یہ تھا کہ اگر وہ آپس میں یہ مسئلہ حل نہیں کر سکتے تھے تو بہترین بات یہ تھی کہ وہ متفقہ انتخاب کے طور پر خان عبدالولی خان پر اتفاق کر لیتے۔ میری رائے میں ولی خان ایک غیر متنازع شخصیت تھے۔ تب تک وہ نیپ میں قومی سطح پر زیادہ نمایاں نہ ہوئے تھے۔ تاہم صوبائی سطح پر وہ کلیدی حیثیت اور رتبے کے حامل تھے۔

”پارٹی کی قومی کونسل کا اجلاس 30 جون سے یکم جولائی 1968ء تک رائل ہوٹل پشاور میں ہوا، جہاں پہلے اجلاس کی صدارت نیپ کی مشرقی پاکستان کی شاخ کے صدر پروفیسر مظفر احمد نے کی۔ عبدالولی خان کو متفقہ طور پر پارٹی کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ یہ کریڈٹ مشرقی پاکستان کے کامریڈز کو جاتا ہے کہ ولی خان کے صدر منتخب کر لئے جانے کے بعد بھی وہ اس قدر فراخ دل تھے کہ انہوں نے جنرل سیکرٹری کے عہدے کے لئے ایک اور مغربی پاکستانی محمود الحق عثمانی کی حمایت کی۔“

یوں جون 1968ء میں نیشنل عوامی پارٹی (ولی گروپ) کا جنم ہوا۔

خان عبدالولی خان متفقہ طور پر صدر منتخب ہوئے۔ مشرقی پاکستان نیپ کے دبیر الدین احمد اور مغربی پاکستان نیپ کے امیر حسین شاہ نائب صدور منتخب ہوئے۔ محمود الحق عثمانی کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا جب کہ مشرقی پاکستان نیپ کے دیوان محبوب علی اور مغربی پاکستان نیپ کے اجمل خٹک جوائنٹ سیکرٹری بنے۔ خزانچی کا عہدہ مشرقی پاکستان نیپ کے محی الدین احمد کے حصے میں آیا۔

پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کی 20 رکنی مجلس عاملہ میں سیف خالد کا نام بھی شامل تھا۔ باقی 19 ارکان میں مشرقی پاکستان نیپ کے صدر پروفیسر مظفر احمد، پیر حبیب الرحمان، مونی سنگھ، حاتم علی خان، سید الطاف حسین، احمد الکبیر، مسز سلینہ بانو، عبدالراتجک، عزیز الحق، مولانا احمد الرحمان عزمی اور مغربی پاکستان نیپ کے امیر زادہ خان، ارباب سکندر خان، محمود علی قصوری، شیخ رفیق احمد، انور چودھری، رؤف طاہر، شیخ عبدالمجید سندھی اور ڈاکٹر اعزاز نذیر شامل تھے۔

بقول بزنجو،

”تقریباً دس ہزار افراد کا جلوس جس کی سرکردگی مشرقی پاکستانی کونسلرز کر رہے تھے، نعرے لگاتے، پشاور کی گلیوں میں مارچ کرتے ہوئے چوک یادگار پہنچا، جہاں تقریباً 50 ہزار افراد نے بھرپور توجہ کے ساتھ قومی اور بین الاقوامی معاملات پر نیشنل عوامی پارٹی کے رہنماؤں کو خطاب کرتے سنا۔ شروع میں میڈیا میں دونوں نیپ پارٹیوں کی شناخت

نیپ (چین نواز) اور نیپ (سوویت نواز) کے طور پر کی گئی لیکن جب ''سوویت نواز'' کے صدر خان عبدالولی خان بن گئے تو انہیں بالترتیب نیپ (بھاشانی) اور نیپ (ولی خان) پکارا جانے لگا۔

نابھہ میں سیف خالد کے آبائی گھر کے قریب واقع ہیرا سنگھ پارک

نابھہ میں سیف خالد کا آبائی گھر جہاں 1928 میں اُن کی پیدائش ہوئی۔
(یہ تصویر 2019 میں لی گئی ہے)

سنگرور کا بنارس باغ جس کا ڈیزائن سیف خالد کے پردادا سوندے خان نے کیا تھا

سنگرور میں سیف خالد کا کالج

بائیں سے دائیں: سیف کے چچا چوہدری غوث محمد، ایک دوست اور والد چوہدری نیاز محمد

سیف خالد کے والد چوہدری نیاز محمد

سیف خالد کے نانا چوہدری فتح محمد
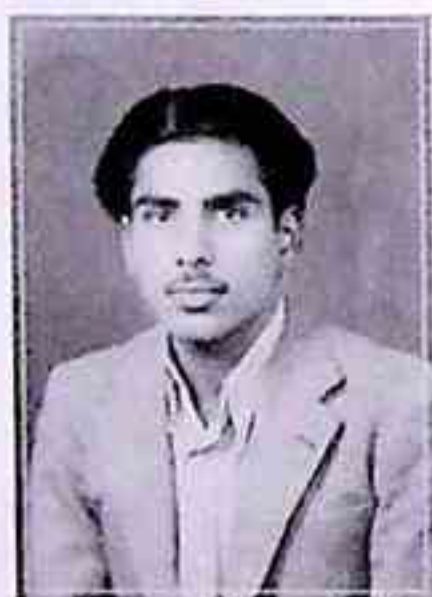
سیف خالد جوانی کے ایام میں

نوجوان سیف خالد شمالی علاقہ جات میں
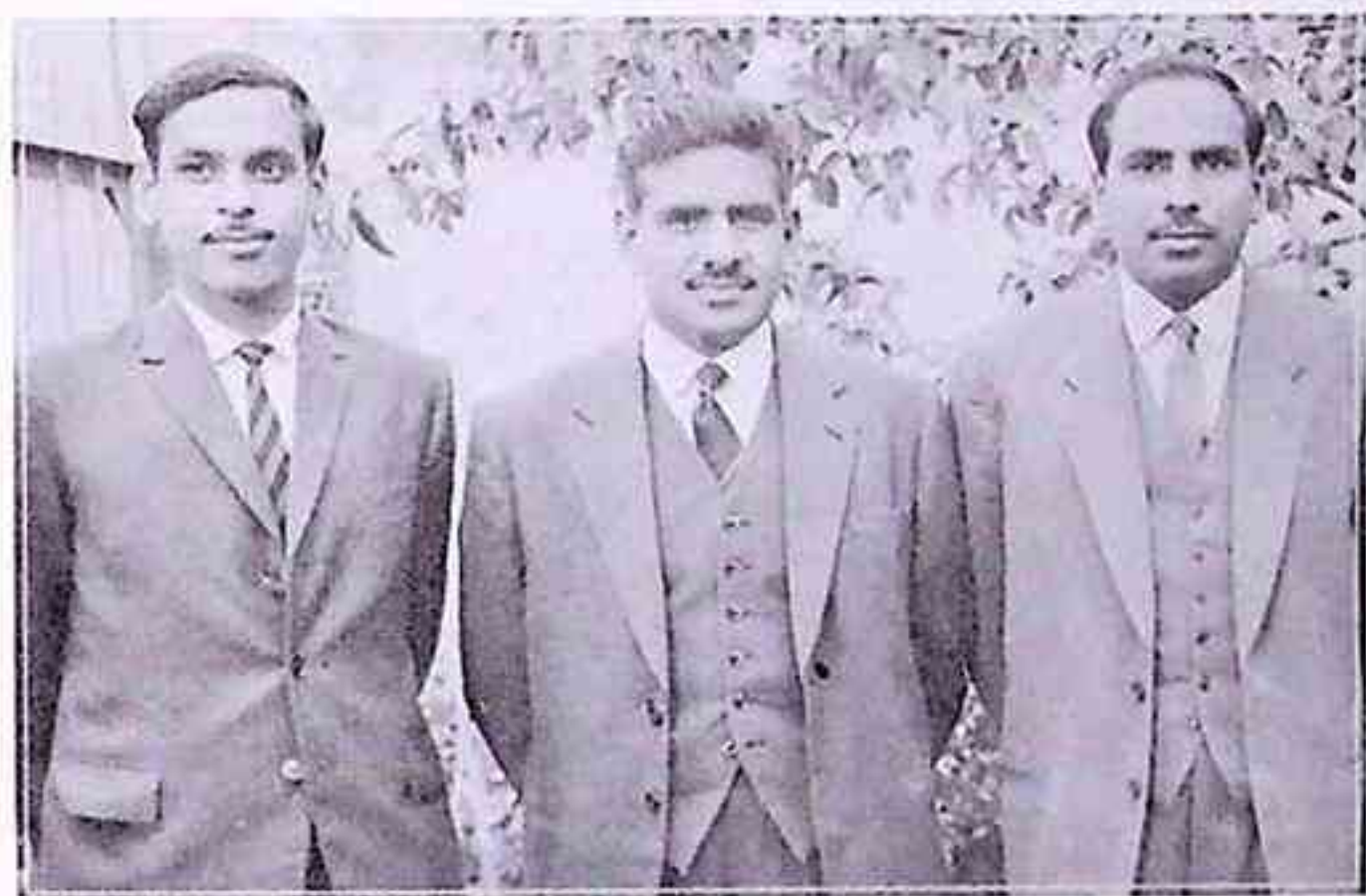
سیف خالد اپنے بھائیوں محمد اقبال اور امتیاز خالد کے ہمراہ
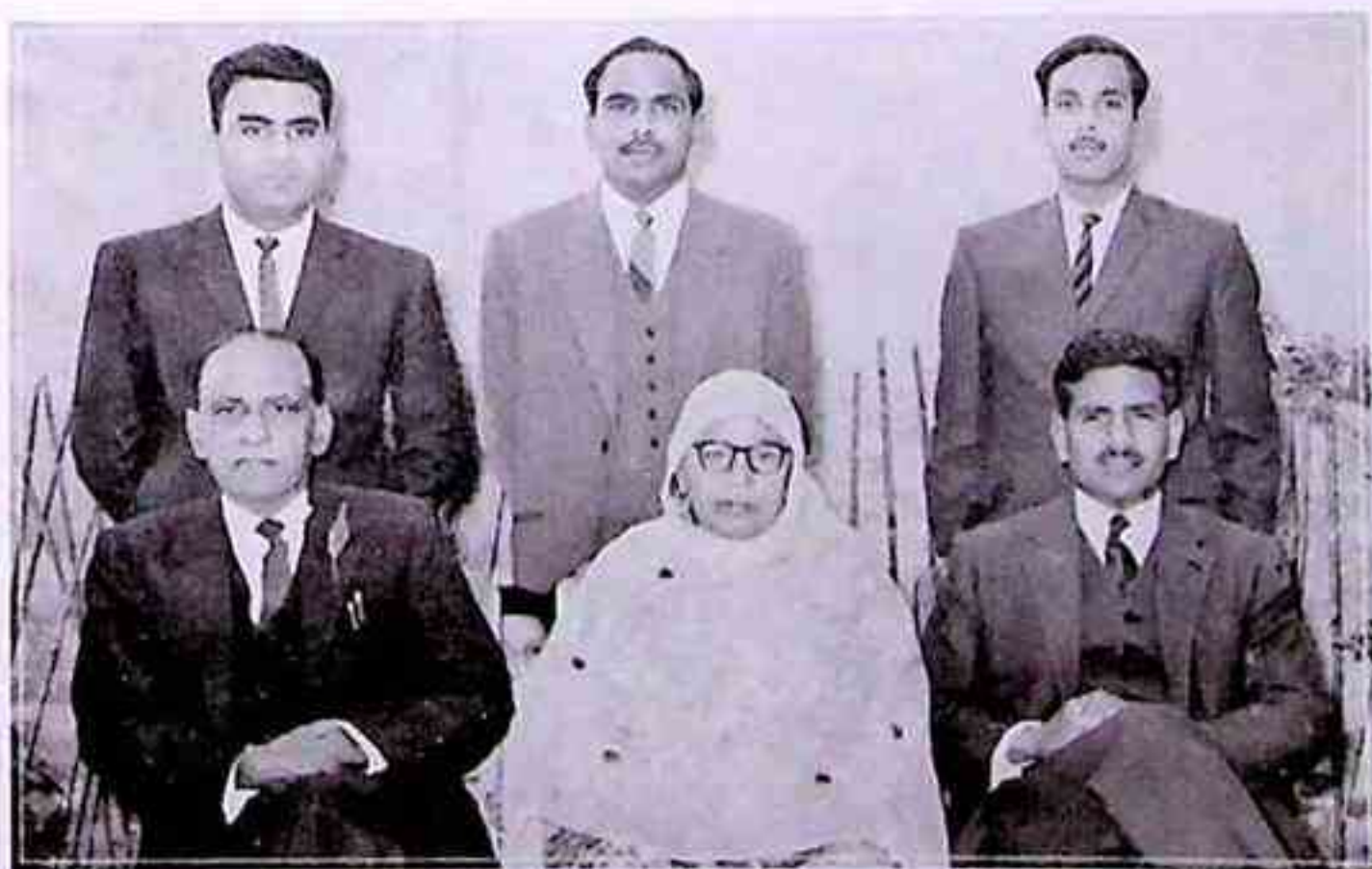
سیف خالد اپنے بھائیوں امتیاز، اقبال، کزن حفیظ اور والدین کے ساتھ

بیٹھے ہوئے: (بائیں سے دائیں) والد، والدہ، بہن اختری، بھائی اقبال۔ کھڑے ہوئے:
(بائیں سے دائیں) کزن حفیظ، سیف، بہن زبیدہ، اہلیہ شمیم، بھائی امتیاز

کھڑے ہوئے: (بائیں سے دائیں) کزن حفیظ، بہن زبیدہ اہلیہ شمیم، سیف، بھائی امتیاز۔ بیٹھے ہوئے:
(بائیں سے دائیں) بھتیجا شاہین، بہن اختری، بھائی اقبال، والد (گود میں بیٹا ندیم) والدہ، بھتیجا شہباز۔
زمین پر: (بائیں سے دائیں) بھانجی نوید، بھانجا آصف، بھانجی لالہ رخ، بھانجا خالد، بھانجی نوشابہ

بائیں سے دائیں: سیف، بہنوئی شریف، بھائی اقبال، بھتیجا شہباز، بہنوئی سعید
کزن اور دوست جمیل
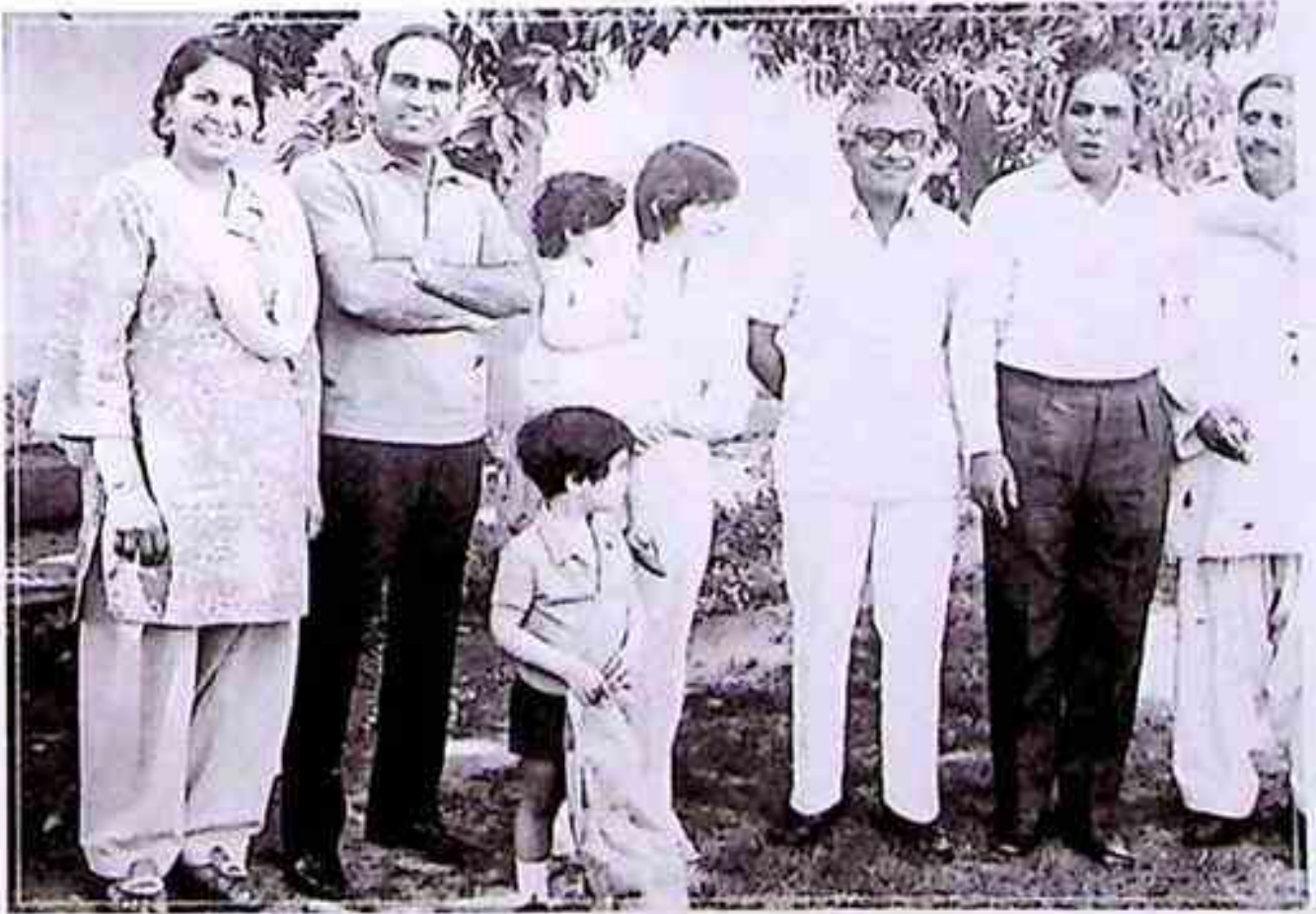
بائیں سے دائیں: بھابھی اصغری، کزن حفیظ، حفیظ کی اہلیہ ڈائنا اور بچے، بھائی اقبال سیف، کزن خورشید
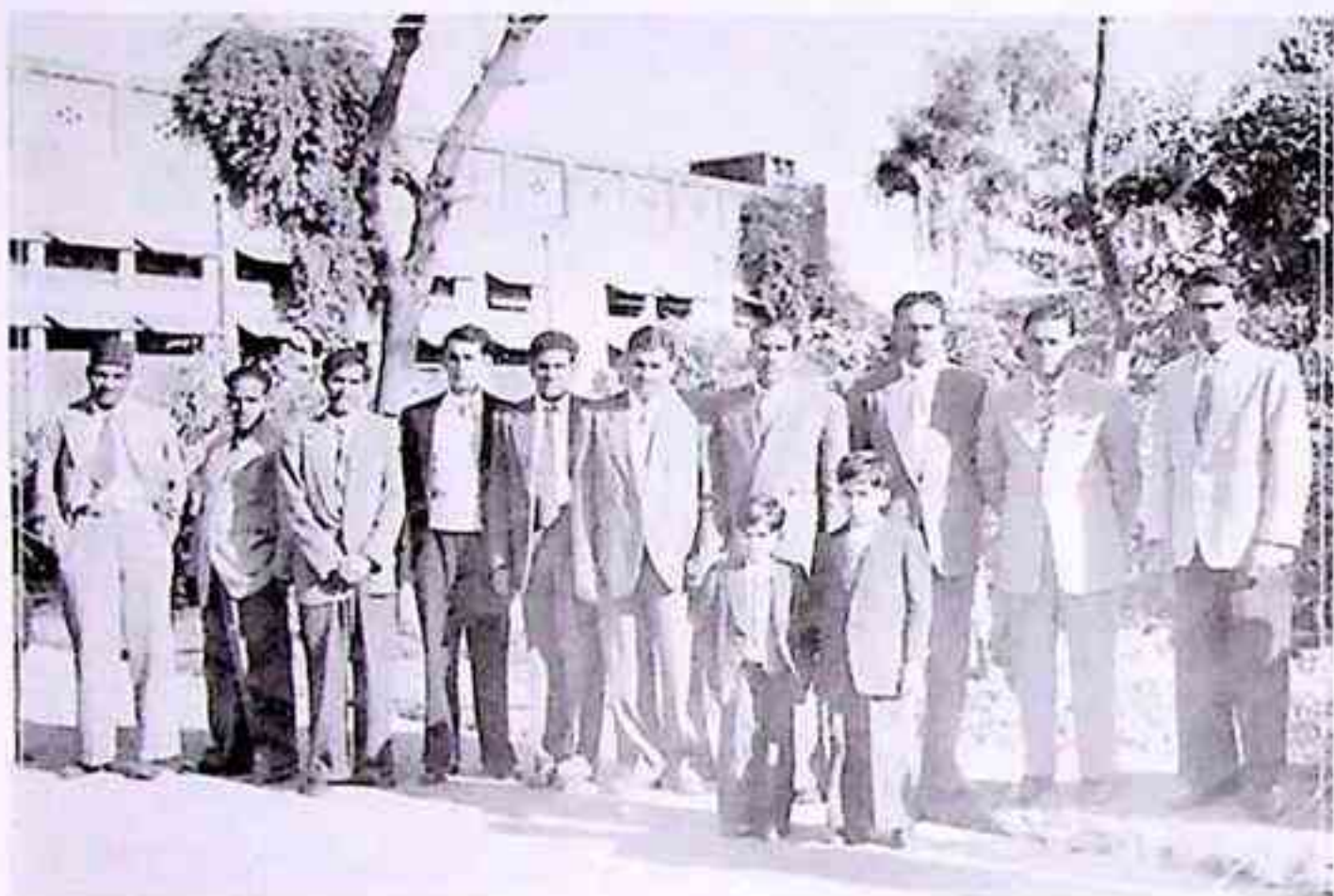
بائیں سے دائیں: کزن خلیل، بھائی اقبال، دوست کمال، سیف، بہنوئی سعید، کزن احسن، بھتیجے شاہین اور شہباز

بائیں سے دائیں: سیف، کزن انیس، بھائی امتیاز، برادر نسبتی ظفر، کزن خورشید، کزن خلیل

بائیں سے دائیں: والدہ، بھائی امتیاز، اہلیہ شمیم، بہن انوری، بہن اختری (بیٹھے ہوئے) بہن بلقیس، بہن زبیدہ۔

کھڑے ہوئے: (بائیں سے دائیں) بھانجی رخسانہ، بہن اشرف، بھانجی رضوانہ، بھانجی غزالہ، بھانجی نوشابہ، بھائی امتیاز، بہن بلقیس، بہن زبیدہ، بھانجی طاہرہ، بہن انوری، بھانجی ریحانہ، بھانجی نوید۔
بیٹھے ہوئے: (بائیں سے دائیں) بہن اختری، کزن مریم، والدہ زینب النساء، کزن، اہلیہ شمیم، بھابھی اصغری۔ نیچے بیٹھے ہوئے۔ (بائیں سے دائیں) بھانجا خالد، نواسہ کاشف، بھانجی لالہ رخ، بھانجی ارم، بیٹا ندیم، بھانجا آصف، بیٹی صبوحی، بیٹا نیاز، بیٹا خرم

سیف اور شمیم

شمیم

سیف

کھڑے ہوئے (بائیں سے دائیں) بیٹی صبوحی، سیف، بھائی امتیاز، بھانجا عامر، بیٹا نیاز۔
بیٹھے ہوئے: (بائیں سے دائیں) بھتیجا عمر، بھابھی کیرولین، اہلیہ شمیم

بائیں سے دائیں: بیٹا ندیم، بیٹا نیاز، فیض احمد فیض، بیٹی صبوحی

سیف ، اہلیہ شمیم اور بیٹا نیاز، ایوب آمریت کے خلاف جلوس کی قیادت کرتے ہوئے
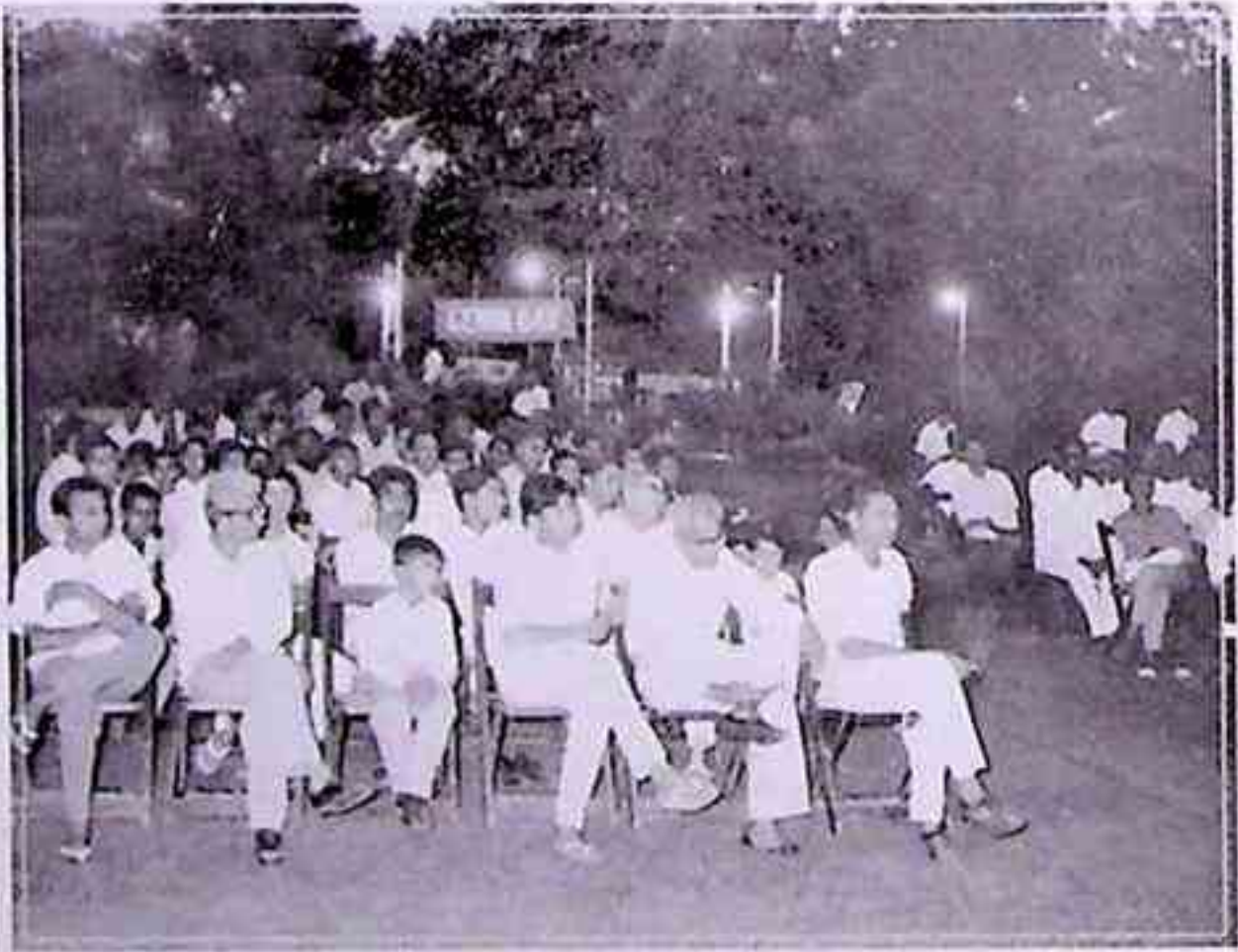
لائل پور آرٹس کونسل میں لینن ڈے کی تقریب: بیٹا ندیم پہلی Row میں

سیف دوستوں کے ساتھ

مصنف احمد سلیم خطاب کرتے ہوئے، سیف انہماک سے سنتے ہوئے

پاک سوویت فرینڈ شپ سوسائٹی لینن کی سالگرہ کا دن مناتے ہوئے۔ میاں یوسف، سوویت سفیر اور سیف

سیف سوویت مہمانوں کے ساتھ

سیف اور اُن کے بچے ندیم، صبوحی، نیاز اور خرم سوویت مہمان کے ساتھ

سیف 70ء کے اوائل میں لندن کے شہر میں

سیف 70ء کے اوائل میں لندن کے ایک پارک میں

پراگ میں اپنے دوست جان مارک اور اُن کی اہلیہ کے ساتھ

چیکوسلوواکیہ میں دریاء Tepla کے کنارے چہل قدمی کرتے ہوئے۔ پس منظر میں ThermalSprings کی عمارت نظر آرہی ہے

بائیں سے دائیں: سیف، فیض احمد فیض، بھائی اقبال

بائیں سے دائیں: میاں اقبال، رانا سخاوت، سیف، بھائی اقبال، میاں محمود، فیض اور دیگر دوست

حمید اختر اور فیض احمد فیض کے ہمراہ
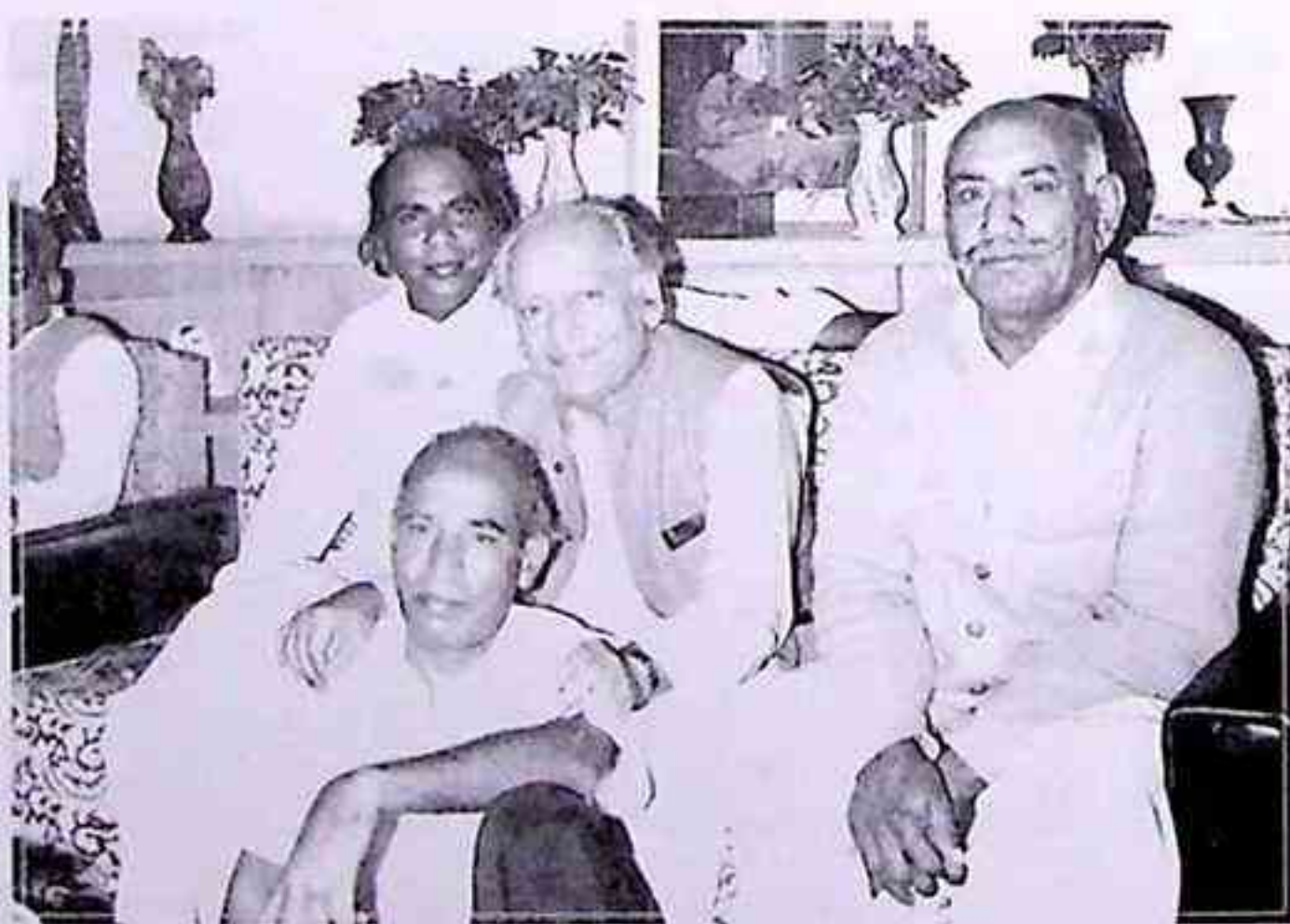
فیض اور ساقی صاحب کے ہمراہ

بھائی امتیاز کے ساتھ لاہور میں
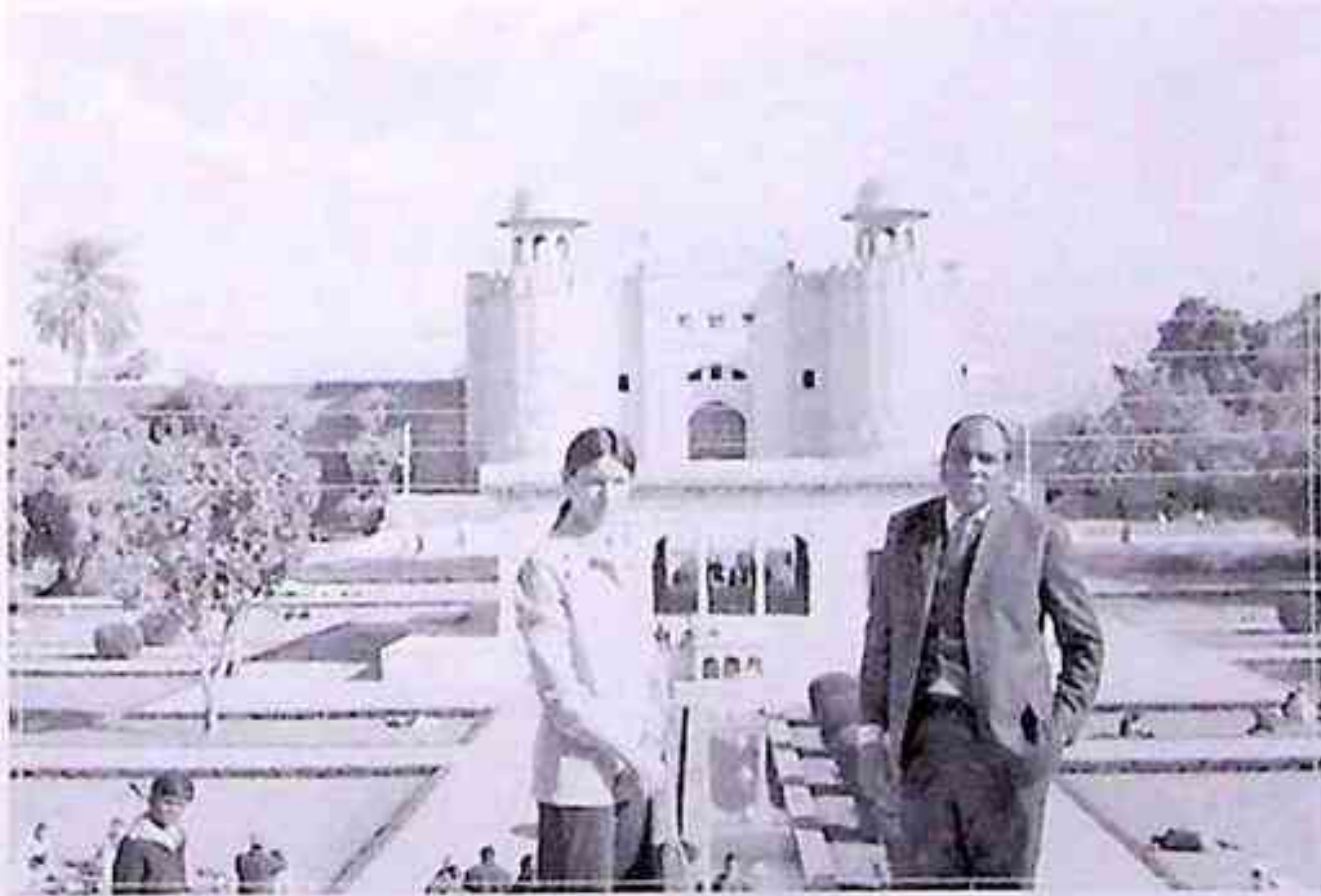
بھابھی کیرولین کے ساتھ لاہور میں

کھڑے ہوئے (بائیں سے دائیں): بیٹی صبوحی، بھانجا وحید، بھانجا رشید، صحافی اقبال جعفری، بیٹا نیاز، پارٹنر اور دوست رزاق، دوست ملک نورانی۔ بیٹھے ہوئے (بائیں سے دائیں): دوست ممتاز نورانی، بیٹا ندیم، بہو حوری، سیف، بھائی اقبال اور دوست رحمان مولوی

کھڑے ہوئے (بائیں سے دائیں): نگہت رزاق، بیٹی صبوحی، بھانجا وحید، بھانجا رشید، صحافی دوست اقبال جعفری، بیٹا نیاز۔ بیٹھے ہوئے (بائیں سے دائیں): دوست ممتاز نورانی، بیٹا ندیم، بہو حوری، سیف، دوست ملک نورانی، بھائی اقبال

صوفے پر (بائیں سے دائیں): دوست رحمان مولوی، سیف، بہو حوری، بیٹا ندیم، بھائی اقبال

زمین پر (بائیں سے دائیں): بیٹا نیاز، بیٹی صبوحی، بیٹا خرم

پانچواں باب

آمریت سے آمریت تک

25 مارچ 1969ء کو ایوب خان نے اقتدار یحییٰ خان کے سپرد کیا۔ 26 مارچ کو یحییٰ خان نے قوم سے اپنے پہلے خطاب میں حقِ بالغ رائے دہی اور عوام کے منتخب نمائندوں کو اقتدار کی پر امن منتقلی کا وعدہ کیا۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل یحییٰ خان نے 31 مارچ 1969ء کو صدر مملکت کا عہدہ سنبھال لیا۔ اس سلسلے میں جو پریس نوٹ وزارتِ اطلاعات ونشریات نے جاری کیا اس کا مَتن یہ ہے کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو مملکت اور انتظامیہ کے سربراہ کی حیثیت سے جو گوناں گوں فرائض انجام دینے پڑتے ہیں۔ ان کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ انہیں کچھ ایسا عہدہ حاصل ہو جس کے ذریعے وہ ان فرائض کو ملک کے مروجہ قوانین اور بین الاقوامی طریقوں اور روایات کے مطابق انجام دے سکیں۔

بین الاقوامی امور میں صرف صدر اس امر کا مجاز ہوتا ہے کہ وہ بعض دستاویزات وصول کرے یا جاری کرے اور غیر مما لک سے ہونے والے سمجھوتوں اور معاہدوں کی توثیق نیز غیر مما لک کے سفارتی نمائندوں کے کاغذات بھی صدر ہی وصول کر سکتا ہے۔ ملکی اور بین الاقوامی امور کے ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جو پاکستان میں سربراہ مملکت اور انتظامیہ کے سربراہ کی حیثیت سے فرائض سرانجام دے۔ اس وقت تک جب تک عوام کے منتخب نمائندے ملک کا

دستور تیار کریں۔

صدر یحییٰ نے بنیادی حقوق کی دفعات کے سوا 1962ء کے آئین پر عمل درآمد کا حکم جاری کیا۔ اس نے مارشل لاء کے کئی ضابطے بھی جاری کئے۔ جن کا مقصد، اقرباء پروری، ناجائز طور پر زر مبادلہ اور املاک حاصل کرنے والوں کو سزائیں دینا مقصود تھا۔

28 جولائی کو حکومت نے سوات، دیر اور چترال کی ریاستوں کو مغربی پاکستان میں ضم کرنے کے ساتھ ساتھ اکتوبر 1970 میں عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کیا۔ صدر مملکت نے 25 جولائی 1969ء کو ملک میں نئے انتخابات منعقد کرانے کی غرض سے جسٹس عبدالستار کو چیف الیکشن کمشنر مقرر کیا۔ اسی روز صدر مملکت نے قوم کے نام اپنی نشری تقریر میں کہا کہ وہ ڈیڑھ سال کے اندر اندر انتخابات کرائیں گے۔ اس کے بعد صدر یحییٰ خان نے ملک بھر میں سیاست دانوں اور رائے عامہ کے دوسرے رہنماؤں کے ساتھ تبادلہ خیال کیا۔ اور 28 نومبر 1969ء کو عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''ملک میں عام انتخابات ایک آدمی ایک ووٹ کی بنیاد پر 5 اکتوبر 1970ء کو ہوں گے۔ قومی اسمبلی جب دستور سازی کا کام مکمل کرے گی تو اس کے بعد صوبائی اسمبلی کے انتخابات ہوں گے۔ اسمبلی کو اپنے پہلے اجلاس سے 120 دن کے اندر اندر دستور سازی کا کام مکمل کرنا ہوگا۔ اگر وہ یہ کام مقررہ مدت تک سرانجام نہ دے سکی تو اسے توڑ دیا جائے گا۔ اپنی نشری تقریر میں صدر یحییٰ خان نے کہا کہ یکم جنوری 1970ء سے سیاسی سرگرمیوں پر سے پابندی اٹھالی اور تمام سیاسی جماعتیں میدان عمل میں اتر آئیں انہوں نے ملکی سطح پر اپنے اپنے پروگراموں کی تشہیر کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس موقع پر صدر نے تمام سیاسی پارٹیوں سے اپیل کی کہ وہ علاقائی مفادات کو نظر انداز کر دیں اور ذاتی اور مقامی نوعیت کی مصلحتوں کو خاطر میں نہ لائیں۔

مارشل لاء کے ایک اور ضابطے کے تحت قائد اعظم اور پاکستان پر تنقید کو قابل سزا جرم قرار دے دیا گیا۔ یہ حالات تھے جب سیف خالد نے وکالت کا پیشہ ترک کر دیا۔

کاروبار میں ناکامی

سیف خالد نے کامیاب سیاسی زندگی کے ساتھ ساتھ ناکام کاروباری زندگی بھی گزاری۔ اس سے قبل انہوں نے خود کو ایک کامیاب وکیل ثابت کیا تھا۔ لیکن پھر اچانک انہوں نے وکالت چھوڑ دی۔ اس زمانے میں سیف خالد کے مالی حالات خراب ہو گئے۔ بقول نواز بٹ، ''انہوں نے مجھے خود بتایا کہ ایک کیس میں ایک لاکھ روپے فیس لی تھی۔ جو کھا چکا ہوں۔ اب حالت پتلی ہے''۔ پھر انہوں نے سوویت یونین کے ساتھ کاروبار کیا۔ میں ان کے ساتھ سوویت ٹریڈ سنٹر گیا۔ سیف خالد نے سوویت یونین سے جوتے بنانے کا ٹھیکہ لیا۔ اس کام کے لئے انہیں کسی آدمی کی ضرورت تھی۔ سیف خالد نے رزاق کو اپنا پارٹنر بنا لیا۔ انہوں نے ناظم آباد نمبر ایک میں جوتے بنانے کا کارخانہ قائم کیا۔ کراچی میں جوتوں کا کارخانہ لگانے کے بعد انہوں نے سوویٹ یونین کو دو تین کنسائنمنٹس بھجوائیں جس سے ان کے معاشی حالات کافی بہتر ہو گئے۔

سیف خالد نے لائلپور میں روسی ٹیلی ویژن بیچنے کا کاروبار بھی کیا۔ یہ کام ان کی بیگم نے سنبھال لیا۔ 1968ء میں نواز بٹ کی شادی ہوئی تو سیف اس میں شریک ہوئے۔ بزنجو، فیض اور سبط حسن بھی آئے۔ اس سے نواز بٹ کے دل میں سیف کے مقام و مرتبے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

شروع میں کاروبار خوب جما۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے اور اس کی تصدیق ان کے کئی دوستوں نے بھی کی کہ بنیادی طور پر وہ کاروباری آدمی نہ تھے۔ حسین نقی اور افضل احسن رندھاوا کی بات ہم پہلے کر چکے ہیں۔ سیف خالد کے پارٹنر رزاق قدرے تفصیل سے کہانی سناتے ہیں:۔

> ''سیف خالد نے اسی دوران بزنس کا فیصلہ کیا۔ اپنے سالے کے ساتھ مل کر 1965ء میں جوتے بنانے کا کام شروع کیا۔ گھر میں فیکٹری لگائی اور رہائش اوپر والے حصے میں رکھی۔ انہی دنوں روسی

پاکستان سے شوز خرید رہے تھے۔ انہوں نے ایکسپورٹ کرنے کا سوچا۔ سیف خالد کی روسی سفارتخانے تک رسائی تھی۔ سوویت ٹریڈ آفس کراچی میں تھا۔ میں ان دنوں کراچی میں تھا۔ سیف خالد کراچی آئے اور میرے پاس رہے۔ میں لاء کر چکا تھا۔ فیصل آباد میں پریکٹس کی مگر والد انتقال کر گئے جن کی خواہش تھی کہ فیصل آباد میں پریکٹس کرنی ہے۔ میرا دل نہ لگا تو واپس کراچی آ گیا۔ فیصل آباد میں سیف خالد سے ملاقاتیں رہیں وہ میرے رہنما بن گئے تھے۔

1966ء میں سیف خالد کراچی آئے۔ آگرہ کی ایک فیملی تھی جو کراچی منتقل ہوئی تھی ان سے رابطہ کر کے روسیوں کے لئے شوز کے نمونے بنوائے۔ روس سے تجارت کرنے کی ایجنسی نصرت ایجنسیز کے پاس تھی۔ نصرت ایجنسیز پورے پاکستان کو ڈیل کرتی تھی۔ وہی روس سے کنٹریکٹ منظور کراتی تھی۔ سیف خالد نے مجھے کہا کہ تم کراچی میں ہو، تمہی معاملات دیکھ لو، کہاں روز روز کراچی آتا پھروں۔ بہر حال میں نے نصرت ایجنسی والوں سے معاملات طے کیئے۔ میں نے کہا کہ میں کیا کروں، تو سیف خالد نے کہا کہ تم رزاق اینڈ کمپنی کے نام سے آرڈر لے لو۔ میں نے درخواست کر دی۔ میں بڑے بھائی کی شادی پر گیا ہوا تھا کہ نصرت ایجنسیز کا خط سیف خالد کے گھر خط آگیا کہ کچھ ہزار شوز بھجوانے ہیں۔

سیف خالد نے کہا فیصل آباد آؤ، میں نے کہا کہ میرا کیا تعلق ہے آپ کا آرڈر ہے۔ میں سوشل سیکورٹی میں نوکری کر چکا تھا۔ سیف خالد نے کہا تم میرے حصہ دار ہو۔

میں فیصل آباد گیا تو پتہ چلا کہ ان کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کچھ تم گھر والوں سے لو کچھ میں کرتا ہوں۔ میرے پاس

بھی پیسے نہیں تھے۔ نئی نئی نوکری تھی۔ بہر حال ففٹی ففٹی پارٹنر شپ ہو گئی۔ میں نے بھائی سے کہا تو اس نے جواب دیا کہ ابھی شادی سے فارغ ہوئے ہیں کہاں سے پیسے لاؤں۔ میرے بڑے بھائی ایک کواپریٹو بنک میں ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے اپنی گارنٹی پر قرضہ دلوادیا۔ سیف خالد کے بڑے بھائی کوہ نور میں سپننگ ماسٹر تھے۔ انہوں نے کچھ پیسے دے دیئے۔ حساب کیا تو پتہ چلا کہ پچیس ہزار سے گزارہ نہیں ہوگا۔ پھر زاہد سرفراز سے رابطہ ہوا تو اس نے کہا ساڑھے بارہ ہزار میں ڈالوں گا ایک تہائی کا حصہ دار ہوں گا۔ مگر نیشنل بنک سے 35ہزار قرضہ لے لیں گے۔ طے ہوا کہ سیف خالد فیکٹری چلائیں گے۔

میں ایکسپورٹ کے ڈاکومنٹس بنا دیتا تھا یوں کام چلتا رہا۔ پھر لاہور میں ٹی وی سٹیشن کھلا۔ تو اس کے سگنل فیصل آباد نہیں آتے تھے۔ سکیسر میں بوسٹر لگا تو فیصل آباد سگنل آنے لگے۔ نصرت ایجنسیز والے روسی ٹی وی بھی امپورٹ کرتے تھے۔ سیف خالد نے بتایا کہ ٹی وی کی ایجنسی لے لی ہے۔ میں، سیف خالد اور زاہد پارٹنر تھے۔

''ٹی وی کی ایجنسی مل گئی تو انہوں نے کہا کہ پیسے دیں ٹی وی لیں۔ انہوں نے مہربانی کی اور تین سو ٹی وی دے دیئے۔ یہ بنک کے پاس گروی ہیں۔ اس کے لئے سٹور لیا۔ تھوڑے ٹی وی بکے کیونکہ سگنل ٹھیک نہیں تھے۔ صاف تصویر نہیں آتی تھی تو شوروم کا کرایہ پڑنے لگا۔ جس پر زاہد سرفراز نے الگ ہونے کا کہا۔ میاں زاہد سرفراز ٹی وی ایجنسی اور شوز فیکٹری سے نکل گیا۔

''ان دنوں سیف خالد کراچی آتے رہے، کاروبار چلتا رہا۔ وہ سیاست کرتے رہے۔ پاک سوویت فرینڈ شپ سوسائٹی میں آنا جانا رکھا۔ فیض احمد فیض ان دنوں کراچی میں رہائش پذیر تھے۔ شاہراہِ فیصل

پر سوویت یونین کا فرینڈ شپ ہاؤس تھا وہاں تقاریب ہوتی تھیں۔ سلیمہ ہاشمی کی شادی کا دعوت نامہ مجھے فیض صاحب نے بھیجا تو میں شریک ہوا یہ شادی بھی اسی فرینڈ شپ سینٹر میں ہوئی تھی۔ بعد میں ضیاالحق نے اس مکان کے مالک پر دباؤ ڈال کر پاک سوویت فرینڈ شپ والوں سے خالی کروالیا۔ ''1970'' ء میں یہ ہوا کہ جب شوز کا آرڈر آیا تو سیف خالد ہی سب کام سنبھالتے تھے ہم نے ایک اور کمپنی بنالی تھی۔ یہ طے ہوا کہ تم حیدر آباد فیکٹری بناؤ اور میں نوکری چھوڑ دوں گا۔ میں نے بیوی کو بتایا تو اس نے شور مچادیا۔ میرے بھائی منظور جو لاڑکانہ میں پیپلز پارٹی کے صدر تھے وہ کراچی آکر بیٹھ گئے۔ میں اٹھارویں گریڈ کا افسر تھا۔ ایک طرف بھائی اور گھر والوں کا نوکری نہ چھوڑنے پر اصرار اور دوسری طرف سیف خالد کا نوکری چھوڑنے پر دباؤ۔ ایک دن جا کر میں نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔

اس دوران سیف خالد سیاسی سرگرمیاں کرتے رہے۔ تب وہ میرے گھر میں رہتے تھے۔ یہیں گھر میں محفلیں ہوتی تھیں۔ پھر لیاقت ہاؤس بنا لیا۔ ایک روسی ڈپٹی قونصلر میرے اور سیف کے دوست بن گئے۔ میرے گھر آجاتے تھے۔ بغیر اطلاع آجاتے۔ تیتر کھلانے کا کہتے تھے۔ ٹریڈ سنٹر اور سوویت فرینڈ شپ ہاؤس جانا ہوتا۔ میری بیوی نگہت بھی تقریریں کرتی تھی۔ وہ بیچاری مارکسزم پڑھتی تھی۔ انٹیلی جنس والے پیچھے پڑے رہتے تھے۔''

یہ ماننا پڑے گا کہ سیف خالد کاروبار کے لئے نہیں بنے تھے۔ ان کے جتنے عزیزوں، دوستوں اور ملنے والوں سے بات ہوئی سب کا یہی کہنا تھا کہ کاروباری طور پر وہ ناکام رہے۔ ان کی کاروباری سرگرمیاں ایک طرح سے گناہ بے لذت تھیں۔ پارٹی میں بھی انہیں ہدف تنقید بننا پڑا۔ تنویر شیخ بتاتے ہیں کہ لائلپور میں سیف خالد سے عزیز کی

کبھی نہیں بنی۔ یہ لوگ کہتے تھے یہ جو کارخانہ چلاتے ہیں یہ بورژوا سرگرمی ہے۔ سیف خالد نے جوتوں کی سپلائی کا کنٹریکٹ روسیوں سے لیا تو ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔ انہوں نے میاں زاہد سرفراز اور رزاق صاحب سے پارٹنر شپ کی جسے رزاق صاحب چلاتے تھے۔ جب پھر بھی معاملہ نہ چلا تو 1971ء میں رزاق فیکٹری اٹھا کر حیدرآباد لے گئے۔ اس زمانے میں سیاسی حالات کافی خراب تھے۔ سیف بہت عرصہ جیل میں رہے۔ سیف خالد کی اہلیہ نے نصرت عظیم سے بات کی جن کا بائیں بازو سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انہوں نے لائل پور کے لئے روسی ٹی وی کی ایجنسی حاصل کی۔ وہ دو تین سال تک اس بزنس کو چلاتی رہیں۔

اسی دوران سیف خالد کا بھانجا وحید ماسکو سے تعلیم حاصل کر کے آیا تو رزاق اور سیف خالد نے شراکت سے تولیہ بنانے کی ایک فیکٹری لگائی۔

انجمن محبان ویٹ نام

1968ء پاکستان اور دنیا بھر میں مزاحمتی تحریکوں اور تبدیلیوں کا ساتھ تھا۔ اسی سال ویت نام پر امریکی بمباری نے دنیا بھر کے ضمیر کو جگا دیا۔ خود امریکی عوام اس بمباری کے خلاف سڑکوں پر نکلے۔ پورے یورپ میں امریکی اقدام کی مخالفت ہوئی۔ پاکستان بھی اس میں پیچھے نہ رہا۔ لاہور میں انجمن محبان ویت نام کے نام سے ایک تنظیم قائم ہوئی۔ ادیبوں، صحافیوں اور دانشوروں نے ایک زبردست جلوس نکالا۔ امین مغل انجمن محبان ویت نام کے مرکزی رہنماؤں میں شامل تھے، انہی دنوں سیف خالد لاہور آئے تو میں انہیں پاک ٹی ہاؤس لے کر گیا۔ وہاں ان کی ملاقات ٹی ہاؤس کے ایک بیرے الٰہی بخش سے کروائی جو انجمن محبان ویت نام کا سیکرٹری تھا۔ شاعروں، ادیبوں کی صحبت میں شاعر بن چکا تھا۔ اور بعد ازاں اس کا نثری نظموں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا۔ سیف خالد الٰہی بخش سے مل کر بہت خوش ہوئے۔

27 مارچ 2017ء کو میں نے امین مغل سے لندن میں ان کی رہائش گاہ پر ملاقات

کی۔ انہوں نے انجمن کے حوالے سے کئی کہانیاں سنائیں۔ اس تنظیم کے نوجوان گروپ میں راقم الحروف کو شامل ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ جو پنجابی شاعر کے طور پر مجلس شاہ حسین کے شفقت تنویر مرزا کے حلقہ اثر میں تھے۔ شفقت تنویر انجمن کے کرتا دھرتا تھے۔ ان کے علاوہ امین مغل، مسعود اللہ خان، زاہد ڈار، عباس رضوی، اشفاق سلیم مرزا، اظہر مرزا مبارک حیدر کے بہنوئی شوکت علی نے اس جلوس کو منظم کیا تھا۔ جلوس سے جمود ٹوٹا تو سینئیر کامریڈ عبداللہ ملک اور دیگر بزرگ بھی نکل آئے۔ جلوس کے علاوہ انجمن نے ''ویت نام کی نظمیں'' کے عنوان سے ایک مختصر سا مجموعہ بھی شائع کیا جسے بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔

اس کے علاوہ ویت نام کی جدو جہد کے موضوع پر ایک تصویری نمائش بھی لگی۔ یہ تصویریں اخباروں سے کاٹ کر لگائی گئی تھیں۔ ان سرگرمیوں نے اس قدر شہرت پائی کہ چند دنوں بعد ملک معراج خالد نے انجمن محبان ویت نام سے رابطہ کیا کہ ناگا ساکی سے ایک جاپانی آیا ہے جو وہاں کی ہولناکی کے بارے میں ایک تصویری نمائش کرنا چاہتا ہے۔ امین مغل بتاتے ہیں کہ وہ جو کچھ عرصہ قبل چین نواز سے روس نواز بن چکے تھے۔ اب پوری طرح امن کے پرچارک اور جنگ مخالف بن گئے۔ سندھ کمیونسٹ پارٹی نے پہل کاری کرتے ہوئے پورے ملک میں پارٹی منظم کرنے کی کوشش کی جس میں سیف خالد اور امین مغل پیش پیش تھے۔

اس زمانے میں سیف خالد کا ولولہ اور جوش پورے عروج پر تھا۔ ان کی سرگرمیوں کے نتیجے میں لائل پور مزاحمتی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا خصوصاً ایوب خان کے خلاف تحریک اپنے جوبن پر تھی۔ پنجاب میں سیف خالد، امین مغل، انور چوہدری اور درجنوں نوجوان اس تحریک کی جان تھے۔ حبیب جالب اپنی شاعری اور تقریروں کے ذریعے ایوب دشمنی کی علامت بن گئے تھے۔ ان کی نظمیں گھر گھر، گلی گلی گونج رہی تھیں۔ ان کی نظم ''دستور'' خصوصیت سے قابل ذکر تھی۔

''برگ آوارہ'' کے بعد ان کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ضبط ہو گیا اور ان کا جیل آنا جانا لگا رہتا تھا۔

لائل پور بھی ایوب مخالف تحریک میں کسی سے پیچھے نہ تھا یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ صرف نیپ ولی گروپ ایوب مخالف تحریک میں آگے آگے تھی۔ نیپ بھاشانی گروپ چین کے زیر اثر ایوب کی حمایت کرتا تھا۔ تنویر شیخ بتاتے ہیں کہ چین نواز ایوب خان کی بی ڈی سسٹم یا بنیادی جمہورتیوں کو کیمون کے قریب سمجھتے تھے۔ در اصل پنجاب میں کمیونسٹوں کے دو گروپ تھے۔ ایک گروپ سوویت یونین کا حامی تھا اور دوسرا چین کا۔ وہ چین کے ثقافتی انقلاب کے زیر اثر کافی متشدد تھے۔ لیکن دونوں گروپوں میں دوستیاں بھی تھیں اور روز جھگڑے بھی ہوتے۔ ایک گروپ میاں محمود احمد کا حلقہ بگوش تھا تو دوسرا سیف خالد کا۔ کچہری بازار میں ایک چائے خانہ میاں محمود والوں کا گڑھ تھا تو دوسرا کیفے سیف خالد کے حلقے میں شامل لوگوں کا مرکز تھا۔ جب سندھ کے کیمونسٹوں نے پنجاب میں رابطے شروع کئے تو پنجاب میں دو گروپ تھے جو کیمونسٹ پارٹی سے جڑنا چاہتے تھے۔ سندھ کے کیمونسٹوں نے لاہور میں دو افراد سے رابطہ کیا۔ انور چوہدری اور شمیم اشرف ملک۔ ان دونوں نے پنجاب میں کیمونسٹوں سے رابطے کئے۔ انور چوہدری نے لائل پور میں اپنا گروپ بنایا، جس میں دادا لطیف، عزیز، غلام رسول، عاصم جمال، فیصل جمال وغیرہ شامل تھے۔ شمیم اشرف ملک نے سیف خالد کے ساتھ مل کر دوسرا گروپ بنایا۔ بائیں بازو سے سیف خالد کا تعلق 48-1947ء سے تھا اور اس کی کافی گہری جڑیں تھیں، اس لئے ان کا گروپ زیادہ با اثر اور بڑا تھا۔ سیف خالد کے گروپ میں ایک کارپوریشن کے اکاؤنٹینٹ شرافت اللہ بھی شامل تھے۔

نیپ بھاشانی اور نیپ ولی خان کی الگ الگ پالیسیاں تھیں ماسکو نواز ہندوستان سے اچھے تعلقات کی بات کرتے تھے جب کہ ماؤئسٹ دو قومی نظریہ اور بھارت دشمنی کے حامی تھے۔ انور چوہدری یا سیف خالد کے درمیان مسئلہ صرف شخصی اختلافات کا تھا۔ سیف کے شمیم اشرف ملک سے پرانے تعلقات تھے۔ ان کا مضبوط تنظیمی ڈھانچہ بھی تھا۔ شمیم اشرف اکثر وہاں آتے۔ سیف کا تعلق ایک تو شمیم اشرف ملک سے تھا اور دوسرا نیپ (ولی گروپ) کے پولیٹکل فریکشن سے تھا تنویر شیخ کے بقول سیف خالد فریکشن میں آتے تو

ملاقات ہوتی رہتی۔

نیپ ولی گروپ ایوب مخالف تحریک میں پیش پیش تھی سیف خلد نے لائل پور میں نیپ کے پلیٹ فارم سے اس تحریک میں بھر پور حصہ لیا۔ ان کے صاحبزادے ندیم خالد ان دنوں کی یادوں کو کھنگالتے ہوئے بتاتے ہیں:

''میری ایک یاد ان دنوں کی ہے جب ایوب خان کے خلاف تحریک عروج پر تھی۔ میرے والد ایک جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ پولیس نے جلوس کو منتشر کرنے کے لئے لاٹھی چارج کیا اور میرے والد سمیت سیکڑوں لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ میری عمر اس وقت دس سال تھی اور میں بھی تماشہ دیکھنے کی غرض سے والد کے علم کے بغیر ہی جلوس میں شامل ہو گیا۔ لاٹھی چارج کے دوران ایک سپاہی نے مجھے گردن سے دبوچ لیا اور مجھے پولیس کی لاری کی طرف دھکیلنے لگا جو کہ گرفتار شدہ مظاہرین سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے سپاہی کو بتانے کی کوشش کی کہ میں سکول سے آرہا ہوں اور میرا مظاہرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سپاہی نے جواباً مجھے چپت رسید کی اور کہا مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ آج سارے سکول ہنگاموں کی وجہ سے بند ہیں ایک لمحے کے لئے اسکی توجہ مجھ سے ہٹی او ر جیسے ہی اس کی گرفت کمزور پڑی میں سر پٹ بھاگ کھڑا ہوا اور گھر پہنچ کر ہی دم لیا۔

اگلے دن تمام اخبارات نے میرے والد کے ساتھیوں کی گرفتاری کی خبر جلی سرخیوں میں شائع کی۔ ان کی بہادری پر میرا سینہ تن گیا۔ جہاں تک اپنی بزدلی کی بات تھی، وہ میں نے کسی کو نہیں بتائی۔

''ایوب مخالف تحریک کے دوران طارق علی نے بھی لائل پور کا دورہ کیا۔ جب بائیں بازو کے کارکن ان کے استقبال کے لئے ریلوے سٹیشن پہنچے تو وہاں پولیس اور جماعت اسلامی کے لاٹھی بردار غنڈوں نے

ان پر حملہ کر دیا۔ اس کے باوجود طارق علی کو جلوس کی شکل میں کچہری بازار لایا گیا جہاں انہوں نے لوگوں سے پر جوش خطاب کیا۔ اور انہیں ایوب آمریت کے خاتمے کے لئے جدو جہد تیز کرنے کو کہا۔ طارق علی جو ان دنوں یورپ میں بائیں بازو کے طلبا اور نوجوان تحریک کے نمایاں رہنما تھے اور یورپی ممالک میں نوجوانوں کی جمہوری آزادیوں اور ویت نام جنگ کی مخالفت کر رہے تھے،عوام کو یورپ میں چلنے والی تحریک کی کامیابوں سے بھی آگاہ کیا۔

ایک دفعہ ولی خان ایک بڑے جلوس کی قیادت کرتے ہوئے لائل پور آئے جہاں ان کے جلوس کا اختتام ہمارے گھر پر ہوا۔ ہم بچے اس سیاسی گہما گہمی پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ اس واقعہ نے بعد میں محلے میں ہمارے بہت سے مخالف بھی پیدا کئے۔ جو میرے والد کو غدار اور باچا خان کا پیرو کار کہتے تھے۔ ہمارے ہمسائے میں دو ریٹائرڈ ایس ایچ او رہا کرتے تھے۔لگتا تھا کہ اس عرصے میں انہیں میرے والد کی نگرانی پر لگایا گیا تھا اور بعد میں میرے والد کی جتنی گرفتاریاں ہوئیں۔ گھر میں ان کی موجودگی کی اطلاع وہیں سے جاتی تھی۔"

سیف خالد کے بھانجوں عبدالوحید اور نجم الحسن نے بھی اپنی گفتگو میں ولی خان کی لائل پور آمد کا ذکر کیا ہے یہ سفر ڈرامائی اور تہلکہ خیز تھا۔ انہوں نے ایوب مخالف تحریک میں ان کے سرگرم ہونے کی بات بھی کی ہے ان کے مطابق:

"1968-69ء میں جب ولی خان اپنے بیٹے اسفندیار کے ساتھ لائل پور آئے تو سیف خالد کے گھر قیام پذیر ہوئے۔ اس دور میں ولی خان کا بڑا نام تھا۔ پورے شہر میں بڑا چرچا رہا کہ ولی خان آیا ہے۔ ولی خان پنجاب کے دورے پر تھے اور اسفندیار اپنے والد کا گارڈ تھا۔ بندوق اٹھائے ساتھ ہوتا دبلا پتلا تھا۔

''ایوب مخالف تحریک میں سیف خالد اور ان کی اہلیہ بھی بچوں سمیت سرگرم رہیں ایک تصویر ہے جس میں سیف خالد اور ان کی اہلیہ جھنڈا اٹھائے ایوب مخالف جلوس میں شریک ہیں۔

یہ بہت ہنگامہ خیز دن تھے۔ ایوب مخالف تحریک پورے مغربی اور مشرقی پاکستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی تھی۔ بڑے پیمانے پر سیاسی گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔ سیاسی جبر و تشدد عروج پر تھا۔ اس دوران مشرقی پاکستان سے نیپ بھاشانی گروپ کے صدر مغربی پاکستان آئے تو 15 مارچ 1969ء کو ساہیوال ریلوے اسٹیشن پر مولانا بھاشانی پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ جس میں وہ بال بال بچ گئے لیکن مشرقی پاکستان میں اس کا شدید ردعمل ہوا۔ نیپ ولی خان وسیع جمہوری پروگرام کے ساتھ مجلس عمل (ڈیک) کا حصہ تھی اور ایوب خان کو ملک میں جمہوری عمل کی بحالی کے لئے مجبور کر رہی تھی ان کے برعکس مولانا بھاشانی، ذوالفقار علی بھٹو، ایئر مارشل اصغر خان اور ان کی ہم خیال سیاسی قوتیں گول میز کانفرنس کی مخالفت کر رہی تھیں۔ 5 مارچ 1969ء کو لائل پور کاٹن ملز میں آگ لگانے کی کوشش کی گئی۔ پولیس نے مزدوروں پر لاٹھی چارج کیا۔ سیف خالد نے اس کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ 7 مارچ کو مجلس عمل نے ایک آئینی کمیٹی تشکیل دی جس نے ون یونٹ توڑنے اور پارلیمانی نظام کی بحالی پر زور دیا۔ 9 مارچ کو مولانا بھاشانی نے لاہور کے موچی دروازے میں جلسہء عام سے خطاب کیا۔ رجعت پسند جماعتوں کے ایک ٹولے نے جلسے کو درہم برہم کرنے اور ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کی۔ 10 مارچ کو سیاسی افراتفری کے عالم میں گول میز کانفرنس کا آغاز ہوا۔

چنانچہ 10 مارچ 1969ء کو گول میز کانفرنس شروع ہوئی تو کانفرنس کی عام فضاء کچھ زیادہ خوشگوار اور حوصلہ افزا نہ تھی اور اپوزیشن ارکان کے چہروں پر تذبذب اور بددلی کے آثار نمایاں تھے۔ صدر ایوب کے چہرے پر بھی افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بوجھل قدموں کے ساتھ کانفرنس روم میں داخل ہوئے۔ اس کانفرنس میں سب سے دلچسپ وہ مکالمہ تھا جو صدر ایوب اور شیخ مجیب الرحمان کے درمیان ہوا۔ یہ مکالمہ حسب ذیل تھا۔

صدر ایوب: مشرقی پاکستان میں ایک غیر ملک سے شرارت پسند لوگ ہزاروں کی تعداد میں داخل ہو رہے ہیں اور وہاں رائفلیں سستے داموں فروخت کی جا رہی ہیں۔

شیخ مجیب: میں اس بات کی تردید کرتا ہوں کہ مشرقی پاکستان میں غیر ملکی داخل ہوئے ہیں۔ اور وہاں اسلحہ تقسیم کیا جا رہا ہے۔

صدر ایوب: میرے ذرائع اطلاعات مصدقہ ہیں اور حقائق پر مبنی ہیں۔

شیخ مجیب: میں نے کل ڈھاکہ ٹیلیفون کیا تھا اور وہاں سے مجھے پتہ چلا تھا کہ آپ کی جماعت کنونشن لیگ کے لوگ یہ پراپیگنڈہ کر رہے ہیں اور آپ کو غلط اطلاعات پہنچا رہے ہیں۔

صدر ایوب: ڈھاکہ میں کنونشن لیگ کے لیڈروں کے مکانات کو جلایا جا رہا ہے تو کیا وہ خود ہی یہ آگ لگا رہے ہیں؟

نواب زادہ نصر اللہ خان نے اردو میں کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مندرجہ ذیل مطالبات پیش کیے۔

1۔ وفاقی پارلیمانی نظام کی بحالی

2۔ براہ راست اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات

3۔ صوبائی خود مختاری

نواب زادہ نصر اللہ خان کے بعد شیخ مجیب الرحمان کو اجلاس سے خطاب کرنا تھا۔ انہوں نے اپنی لکھی ہوئی تقریر کی نقول ممبروں میں تقسیم کیں۔ ان کی تقریر کی خاص باتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

الف: وفاقی پارلیمانی جمہوریت کا قیام

ب: بلا واسطہ، بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات

انہوں نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مندرجہ ذیل امور پر بھی کمیٹی کے ارکان کے درمیان اتفاق رائے موجود ہے۔

الف: ون یونٹ کا خاتمہ اوور مغربی پاکستان میں سب فیڈریشن کا قیام

ب: صوبوں کو مکمل علاقائی خودمختاری کی ضمانت دی جائے۔

انہوں نے آبادی کی بنیاد پر نمائندگی اور علیحدہ کرنسی کے حق میں دلائل دیئے۔ جب شیخ مجیب الرحمان اپنی تقریر میں علیحدہ کرنسی کے مسئلے پر پہنچے اور کہا کہ سرمایہ کی منتقلی روکنے کیلئے دو علیحدہ کرنسی ازبس ضروری ہے یا دو فیڈرل بنک ہونا چاہئیں تو فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے مندرجہ ذیل سوالات پوچھے۔

محمد ایوب خان: کیا اس نوعیت کا وفاق، وفاق کہلائے گا یا یہ کنفیڈریشن ہو گا

مجیب الرحمان: میں اسے کنفیڈریشن کہوں گا۔

محمد ایوب خان: ٹیکسوں کے بارے میں کیا ہوگا؟

مجیب الرحمان: وفاقی حکومتیں، صوبائی حکومت کو احکامات صادر کریں گی کہ وہ روپے بھیجے۔

محمد ایوب خان: اس کا تو مطلب امداد ہوگا۔

اس کے بعد شیخ مجیب الرحمان نے اپنی تقریر مکمل کی اور چودھری محمد علی نے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا گول میز کانفرنس میں صرف دو متفقہ مطالبات اور پارلیمانی جمہوریت کی بحالی کے لئے شروع ہوئی تھی۔ جو صدارتی نظام کی نسبت ملک کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ اس وقت ملک میں دو صوبے ہیں اور اسے وفاقی طرز حکومت کے ماتحت ہونا چاہئے۔ اس نے بلاواسطہ، بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات کے ساتھ موجودہ دستور کو وفاقی پارلیمانی نظام میں تبدیل کر دینا چاہئے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان نے ان سے مندرجہ ذیل سوالات پوچھے۔

محمد ایوب خان: کیا پارلیمانی طرز حکومت متزلزل نہیں رہا اور کیا آپ نے اس پر غور و فکر نہیں کیا کہ پاکستان میں یہ مستقل ناپائیدار اور غیر مستحکم ثابت ہوا۔

چودھری محمد علی: سیاسی پارٹیوں کا قانون، قانون سازی کا ایک کارآمد حصہ ہے اس میں مزید قانونی دفعات شامل کی جاسکتی ہیں۔ جس کے بعد ایک مرتبہ جمہوری

طور پر منتخب ہونے والی مجلس عاملہ کو دوبارہ ہٹانا ایک انتہائی مشکل کام ہو گا۔ مثال کے طور پر مغربی جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے دستور میں اس قسم کی قانونی دفعات موجود ہیں۔ جن کے مطابق وزیر اعظم کو ہٹانے سے قبل اس کے قائم مقام کی نشاندہی ضروری ہے اور عدم اعتماد کی تحریک قائم مقام وزیر اعظم کا نام ظاہر کرنے کے بعد ہی ایوان میں پیش کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر سوئٹزر لینڈ میں منتخب شدہ مجلس کو دو تہائی اکثریت کے ووٹوں کے بغیر نہیں ہٹایا جا سکتا۔

چودھری محمد علی کے بعد نیپ کے ولی خان نے بڑی احتیاط اور اعتدال کے ساتھ اپنی تقریر شروع کی اور اپنے مقصد کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا۔

ولی خان: میرا طریق استدلال خالصتاً سیاسی ہے۔ مشرقی پاکستان میں یہ عام تاثر ہے کہ انہیں ان کے حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ سندھ، بلوچستان اور سرحد میں بھی یہ بات محسوس کی جاتی ہے کہ پنجاب ان کا استحصال کر رہا ہے۔ ہمیں عوام کے اندر اشتراک عمل کا احساس پیدا کرنا ہو گا۔ ہمیں ایک ایسا دستور بنانا ہو گا جو عوام میں یکجہتی کا شعور بیدار کر دے۔ ہم لوگ خانہ جنگی کی جانب گامزن ہیں۔ ایسے عناصر موجود ہیں جو انتشار برپا کر کے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتے ہیں۔ میں اس بات پر زور دے کر کہوں گا کہ ون یونٹ کو فوری طور پر ختم کیا جائے ساتھ ہی ایسے تمام مسائل بشمول آبادی کی بنیاد پر نمائندگی کے سوال پر فوراً اور مستقل فیصلہ کیا جائے۔ اگر ہم نے ان مسائل کو آئندہ انتخابات پر چھوڑ دیا تو اس سے ہمیں نقصان کا خطرہ ہے۔

مفتی محمود نے اردو میں کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مندرجہ ذیل وجوہ سے ملک کے حالات خراب ہوئے ہیں۔

(I۔ کچھ لوگ اس بات سے برہم ہیں کہ انہیں بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے۔

(II۔ طلباء کے مطالبات جائز ہیں اور وہ تکلیف دہ حالات کا شکار ہیں

(III۔ اقتصادی مسائل سنگین ہو چکے ہیں۔

(IV۔ مذہبی جذبات ''مسلم فیملی لاء آرڈیننس'' جیسے قوانین کی وجہ سے مجروح ہو رہے ہیں۔ ہم نے ابھی تک اس کا فیصلہ نہیں کیا ہے کہ یہ ملک اسلامی ہو یا سیکولر، ہمیں عوام کو یقین دہانی کرانی ہو گی کہ یہ ملک ایک اسلامی ملک ہو گا اور اس کے لئے دستور کو 22 نکات (1955ء میں تمام مکاتب فکر کے علماء نے مل کر ایک دستور تیار کیا تھا) کی بنیاد پر تیار کرنا ہو گا۔ ایک مسلمان کی تعریف بھی پیش کرنی ہو گی۔

ٹرسٹ کے اخباروں سے شکایات

مفتی محمود کے بعد مولوی فرید احمد نمودار ہوئے، وہ جذباتی نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے گلے میں تبرک لپیٹ رکھا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ سیہون شریف سے آئے ہیں۔انہوں نے کہا کہ غفلت اور لا پرواہی کی وجہ سے گول میز کانفرنس کا مقدمہ پانی میں ڈوبنے کے قریب ہے۔ آپ کے اخبارات مسٹر بھٹو کو زیادہ پبلسٹی دے رہے ہیں جب کہ وہ آپ سے استعفیٰ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو کیا حالات پیدا ہوں گے۔ اس کا مطلب ہو گا کہ تین ماہ کے اندر اندر ''انتخابات'' اور یہ کس طرح ممکن ہو گا۔ ان دنوں جب کہ ہم لوگ دستوری مسائل سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اخبارات ہم سے تعاون نہیں کر رہے ہیں اور وہ کچھ اس قسم کے تاثرات پیش کر رہے ہیں۔ کہ اگر گول میز کانفرنس جاری رہی تو اس سے نقصان ہو گا۔

مشرقی پاکستان نیپ کے صدر پروفیسر مظفر احمد نے اپنی تقریر میں کہا:

پروفیسر مظفر: شیخ مجیب الرحمان مشرقی پاکستان کے لیڈر ہیں۔ ہر ملک کی کچھ اپنی خصوصیات ہوتی ہیں اور ہمارے پاکستان کی بھی کچھ خصوصیات ہیں۔ شیخ مجیب الرحمان نے مشرقی پاکستان کی نمائندگی کی ہے ان کے بیان میں اضافہ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل

تجاویز پیش کر رہا ہوں۔

(I)۔ سیاسی کارکنوں کے خلاف جاری کردہ وارنٹ منسوخ کئے جائیں

(II)۔ کالے قوانین ختم کئے جائیں۔

(III)۔ پریس ٹرسٹ توڑ دیا جائے

(IV)۔ پاکستان ٹائمز کو اس کے اصل مالک کے حوالے کیا جائے۔

اصغر خان : لاء اینڈ آرڈر کی حالت خطرناک ہے اور میں اس سے پریشان ہوں۔ آپ (صدر ایوب) کا انتخاب نہ لڑنے کا فیصلہ صحیح ہے۔ عوام میں یہ تاثر پایا جاتا ہے۔ کہ آپ کے گرد کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو آپ کو صدارت پر قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ میری تجویز ہے کہ ایک نئی حکومت بنائی جائے جس میں ایسے افراد شامل کئے جائیں جنہیں عوام کا اعتماد حاصل ہو۔ گورنروں کو تبدیل کیا جائے۔ خاص طور پر مشرقی پاکستان کے گورنر کو ہٹایا جائے کیونکہ وہ موجودہ خلفشار کے ذمہ دار ہیں۔

محمد ایوب خان: یہ غلط ہے۔ ہم تو حتی الامکان اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ گول میز کانفرنس کی کاروائی میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہونے پائے۔

مجیب الرحمان: نہیں جناب، آپ کی مشینری انتشار کر ہوا دے رہی ہے۔

محمد ایوب خان: اس صورت حال میں چند چیزیں میں تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ملک دشمن عناصر بڑی تعداد میں مشرقی پاکستان میں گھس آئے ہیں۔

جسٹس مرشد: شیخ مجیب الرحمان مشرقی پاکستان کے عوام کی آواز ہیں۔ شیخ مجیب الرحمان اور ولی خان نے جو کچھ کہا ہمیں اس پر انتہائی سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔

گول میز کانفرنس اگلے روز بھی جاری رہی اور بے نتیجہ ثابت ہوئی۔

13 مارچ کو ایوب خان نے پارلیمانی طرز حکومت کا اصول تسلیم کر لیا البتہ ون یونٹ توڑنے اور مشرقی پاکستان کو صوبائی خود مختاری دینے سے انکار کر دیا۔ اسی روز شیخ

مجیب مجلس عمل سے الگ ہو گئے۔ 13 مارچ کو ہی جمہوری مجلس عمل توڑ دی گئی کیونکہ بقول نوابزادہ نصراللہ خان مجلس عمل اپنا مشن پورا کر چکی تھی۔ حالات بتدریج ابتر ہوتے چلے گئے اور 25 مارچ کو ایوب خان اقتدار جنرل یحییٰ خان کے سپرد کر کے اقتدار سے الگ ہو گئے۔ ایوب خان کی اقتدار سے علیحدگی کی کہانی بڑی دلچسپ ہے جس طرح جنرل ایوب نے سکندر مرزا کو گن پوائنٹ پر اقتدار سے بے دخل کیا تھا اسی طرح ایوب خان کو جنرل یحییٰ خان کے ہاتھوں اقتدار سے بے دخل ہونا پڑا۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے اس کہانی کے چند اقتباسات یہاں پیش کئے جاتے ہیں:

کمانڈر انچیف یحییٰ خان اپنے دو جرنیلوں کے ساتھ داخل ہوتے ہیں، ایوب خان اپنے دفتر میں موجود ہیں اور یحییٰ کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ اقتدار سے جانے کی آخری گھڑی آ گئی۔ ایوب خان پوچھتے ہیں

یحییٰ کیا چاہتے ہو؟

''یحییٰ کھڑے کھڑے اپنی بھاری آواز میں کہتا ہے۔ ''مارشل لا لگانے کا وقت آ گیا ہے اور مارشل لاء چند علاقوں میں نہیں پورے ملک میں لگے گا۔''

ایوب خان نے گفتگو کا سہارا لینے کی کوشش کی۔

''کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ۔ اپنے ساتھیوں سے بھی کہو بیٹھ جائیں۔''

لیکن یحییٰ خان اس کی بات نہیں سنتا۔ وہ پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھتا ہے اور آگے بڑھ کر اسے بند کر دیتا ہے۔ دروازہ بند کر کے وہ ایوب خان کی طرف پلٹتا ہے تو وہ نہایت افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ کہتا ہے۔

''دروازہ بند کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم جو چاہتے ہو وہی ہو گا۔ مجھے تمہاری تجویز منظور ہے۔''

ایک اور روایت! حالات ایوب خان کے قابو سے باہر جا رہے ہیں۔ وہ اپنے مشیروں کو پنجاب کے بعض علاقوں اور پورے مشرقی پاکستان میں مارشل لاء نافذ کرنے کی ہدایت جاری کرتے ہیں۔ یہ ایوب کابینہ کا آخری اجلاس ہے۔ ایوب خان کے منہ سے

مارشل لاء کی بات سن کر سب کی نگاہیں یحییٰ خان کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ یحییٰ کہتا ہے کہ وہ صدر ایوب سے الگ بات کرے گا کہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ دیا جائے۔ صوبائی گورنروں کو ان کی کابینہ سمیت برطرف کردیا جائے۔ اور 1962ء کا آئین منسوخ کردیا جائے۔ اس کا سادہ زبان میں مطلب یہ تھا کہ ایوب خان یحییٰ کے لئے گدی خالی کردیں ایوان صدر کے بند کمرے میں ایوب خان اپنے پروردہ جنرل یحییٰ خان کی شرائط منظور کرلیتے ہیں۔

20مارچ1969ء (الطاف گوہر کی ڈائری سے ایک ورق)

ایوب خان نے کہا: ''ہمیں مارشل لاء نافذ کردینا چاہیے۔ اب یہ ماہرین پر موقوف ہے کہ ایسا کب اور کیسے کیا جائے۔ وقت روح رواں ہے۔ عوام کو واپس ہوش میں لانے کی ضرورت ہے میں اپنی بہترین کوشش کرچکا ہوں کہ مارشل لاء (1958ء)

کے نفاذ کے بعد ملک نے زبردست پیش رفت کی ہے۔ اخبارات سے معلوم ہوا کہ احتجاجی تحریک مدھم پڑ رہی ہے۔'' ایوب خان انتہائی مایوسی کے عالم میں اپنے سیاسی حل کی طرف پلٹا اس نے اپنے بعض رفقاء سے کہا کہ وہ یحییٰ خان کے پاس جائیں اور اسے کہیں کہ مارشل لاء کے نفاذ کو فی الحال ملتوی کردیا جائے۔

ایوب خان کی کابینہ کے دو وزراء ایڈمرل اے آر خان، مسٹر ایس ایم ظفر، ڈیفنس سیکرٹری غیاث الدین احمد اور ان سطور کا راقم (الطاف گوہر) یحییٰ خان سے اس کے دفتر میں ملے۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''کیا یہ غیر فوجی انقلاب ہے؟''

اسے فوجی مداخلت کے قانونی اور آئینی مضمرات ایسے وقت میں جب کہ سول حکومت کا حالات پر قابو تھا، سمجھائے گئے۔ اس نے تجویز کو مسترد کردیا اور کہا کہ ایک سول حکومت کی جگہ لینا اس کے فرائض میں شامل نہیں۔۔'' مجھے قانونی موشگافیوں کی پروا

نہیں۔ ملک جل رہا ہے۔'' اس نے کہا کہ اگر مارشل لاء فوری طور پر نافذ نہ کیا گیا تو مسلح افواج کی دیانت کو سخت دھچکہ لگے گا۔ صدر کو الگ ہو جانا چاہئے تا کہ مارشل لاء کے وقت اور مرحلہ بندی کا تعین کیا جا سکے۔ اس نے انتباہ کیا کہ اگر تاخیر کی گئی تو ممکن ہے ''فوج کا کوئی دیوانہ'' صورتِ حال کا استحصال کر لے''

پھر 25 مارچ 1969ء۔ یہ ایوب خان کے اقتدار کا آخری دن تھا۔ انہوں نے قوم کے نام اپنے آخری خطاب اور کمانڈر انچیف یحییٰ خان کے نام اپنے خط پر دوبارہ نظر ڈالی۔ انہوں نے کہا ''میری زبان میں کوئی ہلکا پن نہیں ہونا چاہئے۔ اسے محکم و مضبوط ہونا چاہئے'' انہوں نے تبدیلی اور اضافے کے بعد دو مسودے منظور کئے۔ کرسی سے اُٹھ کر کھڑے ہوئے اور جیبوں میں ہاتھ ڈال کر سبزہ زار میں ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔

یحییٰ خان نے صدر بنتے ہی قوم سے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی انتخابات کروا کے اقتدار منتخب نمائندوں کے سپرد کر دے گا۔ مارشل لاء کے بعد سیاسی سرگرمیاں اس طرح متاثر نہ ہوئیں جس طرح 1958ء کے مارشل لاء کے بعد ہوئی تھیں۔ سیف خالد سمیت اگرچہ جمہوری اور ترقی پسند عناصر مارشل لاء کے نفاذ پر خوش نہیں تھے لیکن ان کی مزاحمت جاری تھی۔ لائل پور بھرپور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔ ایک لائل پور کیا پورے پاکستان بشمول مشرقی پاکستان نے ایوب خان کے خالف زبردست تحریک چلائی تھی اور یحییٰ خان کے مارشل لاء سے یہ سلسلہ رکا نہیں تھا۔

سندھ نیپ کا اجتماع

مارشل لاء کے کچھ ہی عرصہ بعد سندھ نیشنل عوامی پارٹی نے طلباء، مزدوروں، کسانوں اور دانشوروں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ محاذ تشکیل دیا تا کہ انتخابات کے بعد عوام کے منتخب نمائندوں کو اقتدار کی منتقلی اور مستقبل کے آئین کے نفاذ کو یقینی بنایا جا سکے۔ 6 جولائی 1963ء کو کراچی میں نیشنل عوامی پارٹی کے سیکرٹری جنرل محمود الحق عثمانی کی قیام

گاہ پر سیاسی کارکنوں، مزدوروں، طلباء، کسانوں، دانشوروں اور خواتین کی انجمنوں کا ایک اجتماع ہوا جس میں مارشل لاء کے بعد کی صورت حال کا تفصیلی جائزہ لیا اور ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا۔ اجتماع کی اہم تقاریر میں نیپ کے سیکرٹری جنرل محمود الحق عثمانی، مشرقی پاکستان نیپ کے صدر پروفیسر مظفر احمد، نیپ کے دیگر رہنماؤں سیف خالد، اجمل خٹک اور ممتاز چوہدری، ہاری رہنما حیدر بخش جتوئی، مزدور رہنما شمیم واسطی، انجمن جمہوریت پسند خواتین کی رہنما بیگم نسیم شمیم اشرف اور سندھ کے طالب علم لیڈر ندیم اختر کی تقاریر شامل تھیں۔ سیف خالد نے اپنی تقریر میں پنجاب کے سیاسی کردار کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اجتماع کے حوالے سے ڈاکٹر اعزاز نذیر نے اس عزم کا اعادہ کیا کہ عوام اپنے حقوق سے کسی طرح دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں اور وہ رجعت پسندوں اور نوکر شاہی کے مذموم اور گمراہ کن ہتھکنڈوں کا شکار نہیں ہوں گے۔

اجتماع کی دو اہم ترین تقریریں نیشنل عوامی پارٹی کے مرکزی سیکرٹری جنرل محمود الحق عثمانی اور مشرقی پاکستان نیپ کے صدر پروفیسر مظفر کی تقریریں تھیں جن کے چند اقتباسات یہاں پیش خدمت ہیں۔ محمود الحق عثمانی نے کہا:

> ’’ملک کی آبادی کا 95 فی صد حصہ کسانوں، مزدوروں، طالب علموں اور درمیانہ طبقہ پر مشتمل ہے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ آج کے دور میں ان ہی طبقات کا بول بالا ہے اور جن طاقتوں نے بھی ان طبقات سے ٹکر لی، پاش پاش ہوگئیں۔ کل ہی کی بات ہے کہ ہمارے ملک پر ایک جابر آمر نوکر شاہی، اجارہ دار، سرمایہ دار اور بڑے بڑے جاگیرداروں، زمین داروں کے بل بوتے پر قابض تھا۔ اور عام تاثر یہ تھا کہ یہ ایک مستحکم اور مضبوط حکومت ہے۔ لیکن جبر اور مظالم کی انتہا نے جس وقت عوام کے پیمانہ کو لبریز کیا تو وہ ظلم اور آمریت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے نیز جن کی صرف پانچ ماہ کی عوامی تحریک کے سیلاب نے ظلم اور آمریت کو تنکوں کی حیثیت دے ڈالی۔ آمریت کے خلاف

اور جمہوریت کے حصول کے سلسلہ میں عوامی امنگوں اور خواہشات کی صحیح طور پر نباضی کرتے ہوئے نیشنل عوامی پارٹی نے ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے میں پہل کی اور اس طرح جمہوری مجلس عمل کے قیام کے ذریعہ جمہوری تحریک کا آغاز کیا۔

''گذشتہ دنوں حکمران گروہ کے خلاف جو سیاسی ابھار پیدا ہوا اس کی تہہ میں کارفرما عوامی معاشی، سیاسی عوامل کا جائزہ لئے بغیر صحیح صورت حال کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ چونکہ عوامی حاکمیت کا خواب اس وقت تک شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان عوامل کی بیخ کنی نہ کی جائے۔ بحیثیت مجموعی ہمیں ایک ایسا نصب العین متعین کرنا ہو گا جو سماج کے ان اداروں کو متاثر کرے اور ان ذہنی روّیوں کو بدل ڈالے جو عوام کی ترقی کی راہ میں مزاحم ہیں۔''

معاشی ترقی اپنے جلو میں ہمیشہ دور رس معاشرتی تبدیلیاں رکھتی ہے۔ جن کی رفتار کا تعین اس پر منحصر ہوتا ہے کہ جماعت اور اسکے رہبروں کا تغیر کے معاملے میں کیا انداز فکر ہے۔تبدیلی (معاشی و سیاسی) یا تو ایک انقلابی عمل کے ذریعہ لائی جا سکتی ہے یا بتدریج ارتقاء اس کا راستہ ہوتا ہے۔ پاکستان میں تبدیلی کے عمل کے لئے انقلابی عمل کی بجائے بتدریج ارتقاء کا راستہ منتخب کیا گیا۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عوام تو بتدریج ارتقاء کے فلسفے کی پیروی کرتے رہے لیکن حکمران ٹولہ نے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے اس کے برعکس طریقہ کار اپنایا۔ جن کی بناء پر 22 سال گزر جانے کے باوجود ملک میں کوئی سماجی نظام پروان نہیں چڑھ سکا۔''

اپنے طویل خطاب میں کسانوں، مزدوروں، طلباء، ون یونٹ، حق بالغ رائے دہی، جمہوریت کی بحالی اور فوری انتخابات کا مطالبہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ 35ء، 47ء، 56ء، 62ء کے دستور کے نفاذ کے مطالبات انتخابات کو پیچھے کر دیں گے۔ لہٰذا بالغ رائے دہی کی بنیاد پر دستور ساز اسمبلی کا نیا انتخاب کروایا جائے جو بیک وقت دستور سازی اور

پارلیمنٹ کے فرائض انجام دے۔“

محمود الحق عثمانی نے متحدہ محاذ بنانے کی ضرورت پر زور دیا تاکہ مستقبل میں اپنے مقاصد کے حصول کی راہ میں حائل ہونے والی طاقتوں کا مل کر مقابلہ کیا جا سکے۔

دوسری اہم تقریر مشرقی پاکستان نیپ کے صدر پروفیسر مظفر کی تھی انہوں نے کہا:

”22 سال گزرنے کے بعد بھی جو دو بنیادی مسائل ہمارے عوام کو درپیش ہیں وہ ہیں:

اول: عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھوں میں اختیارات کی منتقلی اور

دوئم: دستور سازی

انہی مسائل کے پیش نظر میں اپنے ہم وطنوں سے التجا کرتا ہوں کہ وہ ان دونوں اہم مسائل پر پوری توجہ دیں، اور اس ضمن میں سازشی عناصر کی سازشوں سے پوری طرح خبردار رہیں۔

جہاں تک میری جماعت کا تعلق ہے وہ مکمل طور پر جمہوریت میں یقین رکھتی ہے اور مجھے یہ اعلان کرنے میں کوئی باک نہیں کہ عوام ان مسائل پر پورے غور فکر کے بعد جو فیصلہ دیں گے، میری جماعت ان کے فیصلہ کو تسلیم کرے گی۔

پاکستان میں بسنے والا ہر شہری یہ محسوس کرتا ہے کہ اختیارات عوام کے منتخب نمائندوں کو ملنا چاہئیں۔ اس ضمن میں ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کے درمیان کوئی اختلاف رائے نہیں ہے۔

طاقت کے حصول کے بعد صدر یحییٰ نے یہ اعلان کیا تھا کہ۔۔۔

”فوج سیاسی مقاصد نہیں رکھتی، بلکہ وہ تو جلد از جلد قوم کے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب نمائندوں کے ہاتھ میں اختیارات کا انتقال کرنا چاہتی ہے۔“

انہوں نے اس ضمن میں صرف ایک شرط عائد کی تھی، اور وہ تھی کہ انتخابات کے انعقاد سے پہلے ملک میں امن و امان بحال ہونا چاہئے۔ اور انتخابات کے لئے سازگار ماحول پیدا ہوتے ہی انتخابات کروا کر انتقال اختیارات عوام کے منتخب نمائندوں کو سونپ دیئے جائیں گے۔ اس لئے میرا کہنا بالکل درست ہے کہ عوام کے منتخب نمائندوں کو

انتقال اختیارات پر ملک میں کوئی دو رائے نہیں پائی جاتیں۔ جہاں تک امن و امان اور سازگار ماحول کا تعلق ہے تو ملک کی تمام سیاسی جماعتیں اس بات پر متفق ہیں کہ:

اس قسم کا سازگار ماحول ملک میں قائم ہو چکا ہے۔

اس لئے ہماری رائے میں حکومت کو فوراً انتخابات کے انعقاد کی تاریخوں کا اعلان کر دینا چاہئے۔

تقریر کے اختتام پر مشرقی پاکستان نیپ کے صدر نے کہا کہ پاکستانی عوام 1956ء کے آئین کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

تقریروں کے بعد متفقہ اعلامیہ منظور اور جاری کیا گیا جس پر سیف خالد سمیت مزدوروں، کسانوں دانشوروں، طلباء خواتین اور نیپ رہنماؤں نے دستخط کئے۔ نیشنل عوامی پارٹی کی طرف سے محمود الحق عثمانی، پروفیسر مظفر احمد، اجمل خٹک، چوہدری ممتاز علی، سیف خالد، گل خان نصیر، غلام محمد لغاری اور سید علی نقوی، کسان نمائندے حیدر بخش جتوئی، عبداللطیف افغانی، عبدالقادر اندھر، حافظ نائک محمد فضلی، مزدور نمائندوں شمیم واسطی، ڈاکٹر اعزاز نذیر اور محمد احمد، طلباء نمائندوں عبدالحئی بلوچ، (بی ایس او) امیر حیدر کاظمی (این ایس ایف) ندیم اختر (سندھ این ایس ایف) مشتاق علی حیدری (سندھی سٹوڈنٹس فیڈریشن)، محمد امین (بی ایس ایف) اور محمد اشرف (پنجسو)، خواتین نمائندوں نسیم شمیم اشرف، ثریا لطیف افغانی، الطاف افضل اور صالحہ اطہر اور دانشور نمائندوں حسن حمیدی، اقبال احمد، منیر سندھی، سلیم راز اور صوبیدار معینوی کے علاوہ بلوچستان کے دو قومی رہنماؤں سردار عطاءاللہ مینگل اور سردار اکبر خان بگٹی نے دستخط کئے مکمل اعلامیہ کا متن حسب ذیل تھا۔

''ہم دستخط کنندگان کے نزدیک یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ آزادی کے 22 سال بعد بھی ہمارا ملک آئین اور جمہوریت سے محروم ہے۔

اس طویل عرصہ میں مخصوص مفادات کے حامل حکمران گروہ نے جس کا غیر ملکی سامراج سے گہرا ربط ہے ملک میں جمہوریت کو عمل پذیر ہونے اور عوامی خواہشات کو عملی جامہ پہننے کا موقع نہیں دیا۔

گذشتہ چند ماہ کی بہادرانہ جدو جہد سے اس ملک کے عوام نے اجارہ دار، سرمایہ دار اور اس کے جاگیر دار اور سامراجی اتحادیوں کے نمائندہ ایوب خان کی سرکردگی میں عوامی حقوق کے منکر اور غاصب حکمران گروہ کو جس کی پشت پناہی نوکر شاہی کر رہی تھی، گھٹنے ٹیکنے اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب دستور ساز اسمبلی اور مقتدر وفاقی پارلیمنٹ کے مطالبے کو ماننے پر مجبور کر دیا۔

لیکن جیسے ہی عوامی جدو جہد کے کامیابی سے ہمکنار ہونے کا موقع آیا، حکمران طبقے نے انتہاپسندوں کے تعاون سے عوام کے ہاتھوں میں اقتدار منتقل ہونے سے روکنے کی سازش کی اور نظم ونسق اور انتظامیہ کی اصلاح کے نام پر ملک بھر میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔

ہمیں اس امر کا یقین ہے کہ۔۔۔ ملک کو درپیش سماجی معاشی اور سیاسی مسائل نیز مختلف قومیتوں اور علاقوں کے درمیان تعلقات میں عدم اعتماد کے بحران کو اس وقت تک حل نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ہمارا ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے جب تک جمہوریت کو صحیح معنوں میں ملکی سیاست کے اندر پنپنے کا موقع نہیں دیا جاتا اور عوام کو جمہوری طرز پر اپنی خواہشات کے مطابق اپنے مستقبل کی تعمیر کا موقع اور مختلف علاقوں کے عوام کو مکمل اور مساوی حقوق نہیں دیئے جاتے۔

ہم اس بات کا واضح اعلان کرتے ہیں کہ:

ہمارے ملک کے عوام ان تمام کامیابیوں اور کامرانیوں سے جو انہوں نے بے پناہ قربانیاں دے کر حاصل کی ہیں۔ دستبردار ہونے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں اور ہماری رائے میں عام انتخابات کے انعقاد کے لئے جس سازگار ماحول کا ذکر صدر یحییٰ نے کیا تھا موجود ہے۔۔۔

اس لئے ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ۔۔۔

مارشل لاء بلا تاخیر ختم کیا جائے اور جلد از جلد عام انتخابات منعقد کرنے کا اعلان کیا جائے۔ تاکہ اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو سکے۔

مختلف حلقوں کی جانب سے پیش کردہ تجاویز پر غور کرنے کے بعد ماضی کے تلخ

تجربات کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بلا تاخیر براہ راست بالغ رائے دہی اور آبادی کے تناسب سے نمائندگی کی بنیادوں پر عام انتخابات منعقد کئے جائیں تا کہ اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو منتقل ہو اور ملک کے لئے آئین تیار کیا جا سکے۔

یہ منتخب اسمبلی بیک وقت دستور ساز اسمبلی اور مقتدر پارلیمنٹ کے فرائض انجام دے۔ اس اسمبلی کو معینہ مدت میں سادہ اکثریت کی بنیاد پر مک کا آئین تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی جائے کیونکہ یہی جمہوریت کا بین الاقوامی طور پر مسلمہ واحد اصول ہے۔ جس کے تحت انتخابات منعقد ہوتے ہیں اور آئین تیار کئے جاتے ہیں۔ قوم کے لئے آئین سازی کی ذمہ داری پورے اعتماد کے ساتھ عوام کے منتخب نمائندوں کو سونپی جائے کیونکہ عوام ہی ملک کے اقتدار اعلیٰ کے مالک ہیں۔

ہم یہ بات واضح کرنا چاہتے ہیں کہ:

پاکستان میں آئین سازی کے مسائل اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے جب تک کہ مشرقی پاکستان کی علاقائی خود مختاری، مغربی پاکستان میں ون یونٹ کا خاتمہ اور لسانی و ثقافتی بنیادوں پر مکمل صوبائی خود مختاریٔ کے ساتھ صوبوں کی دوبارہ تشکیل (ریاستیں اور قبائلی علاقے جو ابھی تک صوبہ میں مدغم نہیں کئے گئے ہیں ان کا ملحقہ صوبے میں ادغام جیسے بنیادی مسائل حل نہیں کئے جاتے۔

ہم اعلان کرتے ہیں کہ:

طلباء مزدور، کسان، شہری مفلوک الحال عوام دانشوروں، خواتین، نوجوانوں اور عوام کے تمام حصوں کے مطالبات تسلیم کئے جائیں۔

- میٹرک تک لازمی اور مفت تعلیم
- زرعی زمین کی حد ملکیت کا تقرز
- بیراجوں، پٹ فیڈر اور سندھ، بلوچستان، پنجاب اور سرحد کی سرکاری زمینوں کی مقامی بے زمین کسانوں میں تقسیم
- کسانوں کے مفاد میں زرعی اصلاحات

- عوام پر ٹیکس کے بوجھ میں کمی
- سماجی، معاشی اور سیاسی میدان میں عورتوں کے مساوی حقوق
- اشیاء صرف کی قیمتوں میں اضافے کی مطابقت سے مزدور طبقہ کی اجرتوں میں اضافہ

اور سابق گورنر یوسف ہارون کے تسلیم کردہ مزدوروں کے حقوق پر فوری عمل، قوم کے لئے ضروری حقوق کی حیثیت رکھتے ہیں

ہم مزدور طبقہ کے لئے غیر مشروط ہڑتال کا حق، انجمن سازی نیز مزدور طبقہ اور عوام کے تمام حصوں کو منظم ہونے اور تحریک چلانے کی آزادی، طلبا، مزدور، اور سیاسی کارکنوں اور لیڈروں کی غیر مشروط رہائی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

ہم طالب علموں کے لئے بلا کسی پابندی اور بیرونی مداخلت سے آزاد یونینیں بنانے اور کام کرنے کی اجازت اور مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے، تعلیمی اداروں کی مکمل خود مختاری، تعلیم کی تکمیل کے بعد روز گار کی ضمانت، اساتذہ کے لئے ملازمت کا تحفظ، بلوچستان میں ثانوی بورڈ، یونیورسٹی، میڈیکل اور انجینئرنگ کالج اور ملک کے ہر حصہ میں مزید فنی پیشہ ورانہ اور طبی کالجوں کے قیام کا مطالبہ کرتے ہیں۔

ہم مزید مطالبہ کرتے ہیں کہ بلوچی، پنجابی، پشتو اور سندھی زبانوں کو مساوی حیثیت دی جائے اور خصوصاً اعلیٰ تعلیم اور مقابلے کے امتحانوں کے ذریعہ کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔

ہم جیالے طالب علموں، مزدوروں، کسانوں، خواتین، نوجوانوں اور عوام کے دیگر جمہوری حصوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ متحد اور منظم رہیں۔

کیونکہ ان کی متحدہ و مربوط جدو جہد ہی مطالبات کے حصول اور عوام دشمن قوتوں کی شکست کی واحد ضمانت ہے۔

ہم عوام سے مزید اپیل کرتے ہیں کہ وہ ایسے تمام عناصر کی ریشہ دوانیوں سے ہوشیار رہیں جو عوام کے اتحاد کو توڑنے اور ان کی صفوں میں پھوٹ ڈال کر ان کی جدو جہد کو ناکام بنانا چاہتے ہیں۔

ہم سیاسی پارٹیوں، عوام کے مختلف حصوں اور عوامی تنظیموں پر زور دیتے ہیں کہ وہ سچے جمہوری ماحول میں ملک کے پہلے عام انتخابات کے انعقاد کے لئے عبوری انتظامیہ کے قیام کے سوال پر غور کریں۔

ہم جمہوریت، جمہوری اقدار اور خود مختاری کے تمام علم برداروں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ماضی قریب کے تلخ اور افسوسناک تجربات کو ذہن نشین کریں۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں ہم ان پر زور دیتے ہیں کہ وہ عوام کو درپیش فوری سیاسی مسائل مثلاً بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ اصولوں کے مطابق انتخابات کے انعقاد، عوام کے منتخب نمائندوں کو اختیارات کی منتقلی اور ملک کے لئے آئین کی تیاری کے مسائل کی بنیادوں پر متحد ہو جائیں۔

ہم ان پر مزید زور دیتے ہیں کہ وہ:

ملک کے وقار کو بلند کرنے اور عوام کے جمہوری حقوق کے خلاف سازشوں کو ناکام بنانے کے لئے متحد ہو کر مستقل مزاجی سے کام کریں۔"

سوشلزم کے خلاف فتویٰ

24فروری کو ملک کے ایک سو تیرہ مذہبی راہنماؤں اور مستند علمائے دین نے ایک فتویٰ شائع کیا جس میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ موجودہ نازک وقت میں ملک کے لئے سوشلزم سے بڑا خطرہ کوئی نہیں۔ اس لئے ہر مسلمان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی طاقت اور استطاعت کے مطابق اس لعنت کے خلاف جہاد کرے۔ پندرہ سو الفاظ پر مشتمل اس فتویٰ میں کہا گیا کہ کمیونزم اور سوشلزم کی علم بردار سیاسی جماعتیں اور افراد خواہ وہ اسلام کے داعی بھی ہوں قطعاً مسلمان نہیں۔ فی الحقیقت وہ قرآن کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں۔ اس لئے سوشلزم کی جماعتوں اور راہنماؤں سے تعاون کرنا، انہیں ووٹ دینا، ان کی مالی امداد کرنا یا کسی اور طریقے سے ان کی حمایت کرنا اعانت کفر کے مترادف ہے لہٰذا حرام ہے جو سیاسی جماعتیں یا گروہ محض زبان سے اسلامی نظام کی سربلندی کے دعوے کر رہے

ہیں ان کا عمل سوشلسٹ عناصر سے ہم آہنگ ہے اور وہ ملک میں سوشلسٹ طاقتوں کی حوصلہ افزائی کا موجب ہیں۔ چنانچہ ان جماعتوں کو ووٹ دینا، انہیں مالی یا کسی دوسری نوعیت کی امداد مہیا کرنا، سوشلزم کی حمایت کے مترادف ہے۔

اس فتوے کا شدید ردِعمل ہوا۔ سوشلزم کے خلاف علماء کے فتوے کے جواب میں بھٹو نے 25 فروری 1970ء کو مردان کے ایک جلسہ میں لوگوں کو بتایا کہ میری پارٹی ایسا کوئی آئین تسلیم نہیں کرے گی جو قرآن اور سنت پر مبنی نہ ہوگا اور عوام کو خلافت کی مساوات مہیا نہیں کرے گا۔ میرے سیاسی حریف میری پارٹی کی مقبولیت کو ختم کرنے کے لئے اس پر اسلام دشمنی کا الزام لگاتے ہیں۔ میں لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ میری پارٹی اسلام اور اسلامی اصولوں کی سربلندی کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دے گی۔''

ٹوبہ ٹیک سنگھ کسان کانفرنس

لیکن اس سے کہیں زیادہ بڑھ کر ردِعمل سامنے آیا۔ ان دنوں سیف خالد کا زیادہ وقت لاہور میں گزرتا تھا۔ ن کا ردعمل بہت شدید تھا اور جب میں نے ہفت روزہ ''لیل و نہار'' کا فتویٰ نمبر ان کے ہاتھ میں دیکھا تو وہ بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ وہ فیض اور سبطِ حسن کی اس کاوش پر بہت خوش تھے۔ یہ انتخابات کا سال تھا اور سیف خالد لاہ[illegible] ڈیرے جمائے بے چینی سے انتظار کر رہے تھے کہ نیپ پنجاب سے اپنے [illegible]ون سے امید وار سامنے لاتی ہے۔

انہی دنوں 24 مارچ کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں تاریخی کسان کانفرنس منعقد ہوئی جس میں سیف خالد سمیت نیپ ولی کے کارکنوں اور رہنماؤں نے شرکت نہیں کی۔ فیض اس کانفرنس میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ انہوں نے ''لیل و نہار'' میں اس کو بھرپور کوریج دی۔ ان کا اپنا لکھا ہوا اداریہ بہت مشہور ہوا۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی چند سطور پر ایک نظر ڈال لی جائے:

''مغربی پاکستان میں پہلی بار کسی مقام پر کسانوں کا اتنا عظیم اجتماع ہوا۔

پہلی بار اتنے بڑے اجتماع کی تنظیم، ترتیب اور میز بانی کسی متمول سیاسی جماعت کے بجائے مقامی کسان کارکنوں اور ان کے ہمدردوں نے کی۔ پہلی بار مقامی کسانوں نے اس مقصد کے لئے ہزاروں کی تعداد میں رضا کاروں کی جماعت منظم کی۔

پہلی بار کسانوں، مزدوروں، دانشوروں، طلبہ، ادیبوں، صحافیوں، فن کاروں اور سیاسی جماعتوں کے سر برآوردہ ترجمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے۔

ایک زمانے کے بعد ان سیاسی جماعتوں نے ایک کسان تنظیم کی دعوت پر اشتراک عمل اور تعاون کا ثبوت دیا جو باہمی اختلافات کے باوجود پسماندہ طبقوں کے حقوق اور خوش حالی کے لئے کوشاں ہیں۔ چنانچہ اس اجتماع میں نیشنل عوامی پارٹی کے دونوں بازو پیپلز پارٹی، جمیعت العلمائے اسلام، لیبر پارٹی، اسلام لیگ اور طلبہ کی مختلف جماعتیں شامل تھیں اور مندوبین خیبر سے لے کر چٹا گانگ تک ملک کے ہر حصے سے تشریف لائے تھے۔

کانفرنس کی کارروائی بیشتر اردو میں تھی اور تقاریر کا سلسلہ آٹھ گھنٹے تک مسلسل جاری رہا۔ اس کے باوجود ایک لاکھ سے زائد کسان نہایت توجہ سکون اور دل جمعی سے کانفرنس کی کارروائی سنتے رہے، گانے بجانے کے رسیا اگر محض میلہ گھومنے آئے تھے تو دن بھر وہ کس خوشی میں ہلکان ہوتے رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ اس کانفرنس کی عدیم المثال کامیابی میں کلام کی کوئی گنجائش ہے، نہ اس کے منتظمین کے حسن کار، مقررین کے خلوص یا سامعین کے جوش و خروش میں۔''

اداریے میں فیض نے بعض تنقیدی سوالات بھی اٹھائے۔ اختتامی سطور میں انہوں نے کہا:

''آخری بات یہ ہے کہ کوئی کانفرنس یا ایک اجتماع خواہ وہ کیسا ہی عظیم الشان اور کامیاب کیوں نہ ہو کسی مستقل تحریک یا تنظیم کا بدل نہیں ہوسکتا۔ اگر اس اجتماع کے نتیجے میں کوئی تحریک منظم نہیں ہوتی نہ کوئی تنظیم مرتب ہوتی ہے تو اس کی اہمیت گفتند و برخاستند سے زیادہ نہیں۔ کسی سیاسی محفل کی کامیابی کا معیار، رنگ محفل نہیں اس کے عملی نتائج ہیں۔

ہماری ملکی سیاست کے ٹھہرے ہوئے پانیوں میں جو لہریں بیدار ہوئی ہیں تو ٹوبہ ٹیک سنگھ کی کانفرنس سے ان کے خروش میں ضرور اضافہ ہونا چاہئے۔ بشرطیکہ یہ اجتماع ایک دھارے کے بجائے محض حباب ثابت نہ ہو۔

لیگل فریم ورک آرڈر کا اجراء

30مارچ 1970ء کو جنرل یحییٰ نے ایک آئینی ڈھانچے کا اعلان کیا جس پر سیف خالد اور نیپ سمیت تمام سیاسی جماعتوں خصوصاً مشرقی پاکستان کے سیاسی حلقوں نے سخت مایوسی کا اظہار کیا۔ اس کے مطابق اسمبلی کے قائم مقام کا طریقہ کار، ارکان کی تعداد اور یگر امور واضح کئے گئے۔ علاوہ ازیں آئندہ مرتب کئے جانے والے آئین کی بعض اساسی ضرورتوں کو بھی واضح کر دیا گیا۔ قانونی ڈھانچے کے حکم میں 5اصول بیان کئے گئے۔ جو درج ذیل ہیں:

1۔ دستور میں پاکستان کی اسلامی بنیاد کی حفاظت کی جائے گی

2۔ وفاقی اور جمہوری بنیاد کا قیام اور استحکام

3۔ آزاد عدلیہ اور بنیادی حقوق کا تحفظ

4۔ صوبوں کو قانون بنانے اور انتظام کرنے کے لئے وسیع اختیارات دیئے جائیں۔

5۔ اسلامی نظریہ کا تحفظ اور سربراہ مملکت کا مسلمان ہونا۔

اس بارے میں بھی وضاحت کر دی گئی کہ نئے آئین کے دیباچے میں یہ تحریر کیا جائے گا کہ ملک کے مسلمان اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گزاریں گے اور اقلیتوں کو اپنے مذہب پر آزادی سے کاربند رہنے کا اختیار ہوگا اور انہیں دوسرے شہریوں کے برابر حقوق و مراعات حاصل ہوں گی۔ نیشنل اسمبلی ایک مسودہ کی صورت میں دستور تیار کرے گی جسے قومی اسمبلی کے دن سے یعنی پہلے اجلاس کے روز سے 120یوم میں بنانا ہوگا اور اگر نیشنل اسمبلی اس عرصے میں دستور مرتب نہ کر سکی تو اسے توڑ دیا جائے گا۔ اور اگر اس نے دستور پاس کر دیا تو صدر کی اس پر منظوری ضروری ہوگی۔ اگر یہ منظوری دینے سے

انکار کر دیا گیا تو نیشنل اسمبلی ٹوٹ جائی گی۔ جہاں تک صوبائی اسمبلی کا تعلق ہے جب تک دستوری مسودہ پر صدر مملکت کی منظوری حاصل نہ ہوگی اس کا نفاذ نہیں ہو سکے گا۔

اس آئینی ڈھانچے پر سیف خالد کا ردعمل یہ تھا کہ اگر جنرل یحییٰ نے، ایوب خان کی طرح ملک اور عوام پر اپنا شخصی آئین مسلط کرنے کی کوشش کی تو اس کا انجام 1962ء کے ایوبی آئین سے مختلف نہ ہوگا۔لیکن در اصل اس سے بھی برا ہوا۔ شخصی آئین کو مسلط کرنے کے چکر میں عوام کے منتخب نمائندوں کو آئین مرتب نہ کرنے دیا گیا اور اس کے نتیجے میں ملک دو لخت ہو گیا۔ مجھے یاد ہے، لاہور میں نیپ کے کئی کارکنوں کی موجودگی میں سیف خالد نے بجا طور پر اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ اگر آئین اسمبلی کی بجائے کہیں اور سے آیا تو ملک ٹوٹ جائے گا۔

صحافیوں کی ہڑتال

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے فیصلے کے مطابق ملک کے تمام اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں میں کام کرنے والے صحافی 15اپریل 1970ء کو غیر معینہ مدت کے لئے ہڑتال پر چلے گئے۔ 3 مئی 1970ء کے ہفت روزہ لیل ونہار میں شائع شدہ ''ایک صحافی'' کی رپورٹ کے مطابق:

''24اپریل 1970ء کی شام کو وفاقی انجمن صحافیان اور خوش نویس اور پروف ریڈرز یونین کی مشترکہ مجلس عمل نے اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں میں ہڑتال جزوی طور پر ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ جزوی اس لئے کہ صرف ان اداروں میں ہڑتال ختم کی گئی جہاں پی ایف یو جے کے مطالبات تسلیم کر لئے گئے تے اور جہاں یہ مطالبات نہیں مانے گئے تھے وہاں ہڑتال جاری رہی۔

جن اخبارات میں ہڑتال 24مئی کی رات کو ختم نہیں کی گئی ان میں پاکستان آبزرور، آزاد، اتفاق، ویک پاکستان، مارننگ نیوز (ڈھاکہ)، سنگباد، پوربودیش، پاکستان ٹائمز، نوائے وقت اور امروز شامل تھے ان اخبارات میں سے اتفاق نے سب سے پہلے

اس مضمون کا معاہدہ کیا کہ ہڑتالی کارکنان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ہڑتال کے دنوں کی پوری تنخواہ ادا کی جائے گی۔ اور انتظامیہ کی طرف سے دائر کردہ مقدمات واپس لے لئے جائیں گے۔"

سکرنڈ ہاری کانفرنس

ٹوبہ ٹیک سنگھ کانفرنس کے بعد نیپ ولی خان کی طرف سے سندھ میں اتنے ہی بڑے پیمانے پر ایک کسان کانفرنس کے انعقاد کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس سلسلے میں سندھ ہاری کمیٹی اور جام ساقی سرگرم تھے وہ بیمار ہاری رہنما حیدر بخش جتوئی سے رابطے میں تھے۔ پنجاب میں زور و شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سیف خالد اور بیگم نسیم شمیم اشرف ملک ان تیاریوں کا حصہ تھے۔ سیف خالد لاہور میں تھے اور ان سے ہونے والی ملاقاتوں میں میرے ذمے بھی کام لگائے گئے۔ سیف خالد اور باجی نسیم کی خواہش تھی کہ پنجاب کے طلباء کی ایک بڑی تعداد کانفرنس میں شرکت کرے۔ بیگم نسیم شمیم نے ہاری کانفرنس میں شرکت کے لئے ایک بڑا قافلہ تیار کیا جس میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔ اس اثناء میں 21 مئی کو حیدر بخش جتوئی کا انتقال ہو گیا۔ ہاری رہنما کے ساتھ ساتھ وہ سندھی زبان کے ترقی پسند ادیب و شاعر تھے۔ 7 اکتوبر 1900ء کو لاڑکانہ میں پیدا ہوئے 1943ء میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے سے مستعفی ہو کر ہاری تحریک میں شامل ہو گئے۔

سکرنڈ (نواب شاہ) ہاری کانفرنس 22-21 جون کو منعقد ہوئی جس میں مشرقی پاکستان سمیت پورے پاکستان سے ہزاروں کارکن شریک ہوئے۔ مشرقی پاکستان کے ساتھیوں میں غلام محمد حفیظ خوندکر، شوکت اور اطیع الرحمان قابل ذکر ہیں۔ اہم کی بات یہ ہے کہ کراچی سے دس مسافروں پر مشتمل ایک قافلہ نیشنل عوامی پارٹی کے رہنما ہادی نقوی کی رہنمائی میں پیدل روانہ ہوا جن میں تینوں مشرقی پاکستانی ساتھیوں کے علاوہ عنایت کاشمیری اور مزدور رہنما جاوید شکور بھی شامل تھے یہ قافلہ کراچی سے پیدل مارچ کرتا ہوا 234 میل کا سفر طے کر کے 21 جون کو سکرنڈ پہنچا۔

احمد الطاف کی بیان کردہ رپورٹ کے مطابق:

"21جون کو شام 6 بجے ہاری کانفرنس کے پہلے اجلاس کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ سندھ ہاری کمیٹی کے قائم مقام صدر جناب الٰہی بخش قریشی نے کانفرنس کا فتتاح کیا اور صدارت کے لئے بزرگ رہنما جناب شیخ عبدالمجید سندھی کا نام تجویز کیا۔ واضح رہے کہ سب سے پہلی ہاری کانفرنس کی صدرارت بھی شیخ صاحب ہی نے کی تھی۔ اس کے بعد سندھی زبان کے نامور شاعر نیاز ہمایونی نے ایک نظم سنائی۔

جناب سید رشید احمد نے خطبہ استقبالیہ پڑھتے ہوئے کہا: جاگیر دارانہ رشتے سندھ میں سب سے زیادہ نمایاں اور شدید ہیں یہاں کے زمینداروں کی ملکیت بہت وسیع و بسیط ہے دوسری طرف یہیں سب سے زیادہ تعداد کھیت مزدوروں اور غیر مستقل ہاریوں کی ہے۔ مغربی پاکستان میں تقریبا پانچ ہزار افراد 71فیصد زرعی زمین اور 60فی صد زرعی پیداوار کے مالک ہیں اور 40لاکھ کاشتکار زمین سے محروم ہیں۔

"شیخ عبدالمجید سندھی صاحب نے اپنے خطبہ ءصدارت میں کہا کہ سکرنڈ کانفرنس نواب شاہ کی نہیں بلکہ پورے سندھ، مغربی پاکستان اور بین الاقوامی اصولوں پر مبنی محنت کشوں کی کانفرنس ہے۔ غلام محمد نے پستول سے ون یونٹ بنایا تھا جو دفن ہو گیا۔ ہماری جدو جہد صرف ون یونٹ کے خلاف نہیں بلکہ ہاریوں کے حقوق کے لئے وڈیروں کے خلاف بھی ہے۔ اگر وڈیروں نے خوشی سے ہاریوں کا حق نہیں دیا تو ناخوشی سے حاصل کر لیا جائے گا۔ ہاری بھائیو! اس جنگ میں نیشنل عوامی پارٹی جس نے شروع سے قربانیاں دی ہیں اور حقوق کے لئے جدو جہد کی ہے آخری وقت تک تمہاری حمایت کرے گی۔ بلوچستان کے رہنما غوث بخش بزنجو نے کہا کہ مسئلہ صرف ہاریوں کا نہیں کیونکہ ہاریوں کا

مسئلہ دنیا بھر کے محنت کش طبقہ سے جدا نہیں ہے ہاریوں کی آسودگی اور محنت کشوں کے اقتدار کے لئے مشترک و منظم طور پر ہاری مزدور، طلباء کی متحدہ جدو جہد کی ضرورت ہے کیونکہ جس ملک میں محنت کش آسودہ نہ ہوں وہ ملک آسودہ نہیں کہا جا سکتا۔

ایک فلسطینی عرب طالب علم نے عربی میں تقریر کرتے ہوئے عالمی سامراج، عالمی صیہونیت اور اسرائیل کی جارحانہ حرکات کو بے نقاب کیا اور تحریک آزادیء فلسطین پر روشنی ڈالی۔

ہاری لیڈر جناب غلام محمد لغاری نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''میں ہاری کا بیٹا ہوں اور ہاریوں کے دکھ درد سے واقف ہوں۔ اگر حق کی راہ پر چلتے ہوئے ہمیں پھانسی پر چڑھنا پڑا تو ہم پھانسی کا پھندا چومیں گے۔ شاہ لطیف نے حق وصداقت کے لئے بہت سے اشعار کہے ہیں۔ علمائے حق نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا اور کالے پانی میں شہید ہوئے۔ علمائے سو جارج پنجم کے لئے دعا کرتے تھے۔

ون یونٹ کی وجہ سے 14 سال خراب ہو گئے اگر وڈیرے ون یونٹ نہ بناتے تو آج ملک بہت ترقی کر چکا ہوتا۔ ون یونٹ کے بعد اب صرف ہاری مزدور مظلوم طبقوں کے نعرے بلند ہوں گے۔ اسلام ظلم کے خلاف بغاوت کا حق دیتا ہے۔ ظالم کا کوئی مذہب کوئی وطن نہیں ہوتا۔

ہاری لیڈر رئیس بروہی نے ہاری بھائیوں کو دیہات میں اپنی تحریک پھیلانے، کانفرنس کا پیغام پہنچانے اور منظم و متحد جدو جہد کرنے پر زور دیا۔

دوسرے دن صبح 9 بجے ہاری کانفرنس کا دوسرا عام اجلاس شروع ہوا۔

مولانا عبیداللہ سندھی کے مقلد جناب مولانا عبدالحق ربانی نے اپنی تقریر میں کہا کہ کچھ جماعتوں نے مذہب کو بیوپار بنالیا ہے وہ اسلام کے مقدس نام پر مظلوموں کے مقابلے میں ظالموں کا ساتھ دے رہی ہیں۔

ہاریوں کو چاہئے کہ وہ انتخابات میں وڈیروں کے آلہ کار نہ بنیں۔ مولانا نے مظلوموں اور محنت کشوں کے حامیوں بائیں بازو کے اتحاد پر زور دیا۔

پختون طالب علم فضل غنی نے سرحد کے دہقانوں پر خانوں کے مظالم بتائے اور ون یونٹ کی تباہ کاریوں کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ صوبہ سرحد کے لئے بے زمین مزارع تلاش معاش میں گھر چھوڑ کر کراچی آنے پر مجبور ہیں اور کراچی میں ایسے دس لاکھ پختون ہیں۔ جیکب آباد کے ایک ہاری ورکر، جناب احمد علی سرکی نے ٹھیٹھ ہاریوں کی زبان میں نہایت مؤثر تقریر کرتے ہوئے ہاریوں کو سجاگ ہو کر مزدوروں، طلباء اور شہری بھائیوں سے مل کر اپنے حقوق کے لئے جدو جہد کرنے کی تلقین کی۔

کراچی سے پیدل چل کر آنے والے مشرقی پاکستان کے مسٹر اطیع الرحمان نے بنگلہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں بنگلہ دیش سے آیا ہوں، مجھے ہاریوں سے ہمدردی اور ان سے ملاقات کرنے کا شوق تھا ہماری تحریک ایک ہے۔ ہاری کانفرنس میں جناب محمود الحق عثمانی، پروفیسر مجتبیٰ حسین، بیگم نسیم شمیم ملک، لال بخش رند، جام ساقی، فیض محمد، سیف خالد، سید علی نقوی، امیر حیدر کاظمی، نواز بٹ اور دیگر سیاسی رہنماؤں نے خطاب کیا۔

جناب حسن حمیدی اور برکت علی آزاد نے نظمیں سنائیں۔

کانفرنس میں بیس قرار دادیں منظور کی گئیں جن میں زمین کی حدِ ملکیت مقرر کرنے، ہاریوں کو زمین سے بے دخل کرنے، غیر حاضر زمینداری کے خاتمے، اور بیگاری کو موقوف کرنے پر زور دیا۔

ون یونٹ کا خاتمہ

یکم اپریل 1970ء کو جنرل یحییٰ خان نے اعلان کیا تھا کہ تین ماہ بعد یکم جولائی کو مغربی پاکستان کے صوبے بحال کر دیئے جائیں گے۔ نئے صوبوں کی تفصیلات ذیل میں ہیں۔

صوبہ بلوچستان: کوئٹہ ڈویژن بشمول قبائلی علاقے، قلات ڈویژن، کراچی ڈویژن کے ضلع لس بیلا اور حیدر آباد ڈویژن کے نصیر آباد سب ڈویژن

صوبہ سندھ: کراچی ڈویژن ضلع لسبیلہ کو نکال کر حیدر آباد ڈویژن اور خیر پور ڈویژن، نصیر آباد سب ڈویژن شامل ہوں گے۔

صوبہ پنجاب: راولپنڈی ڈویژن اسلام آباد کے علاقے چھوڑ کر لاہور ڈویژن، ملتان ڈویژن، بہاولپور ڈویژن

صوبہ سرحد: (خیبر پختونخوا) پشاور ڈویژن میں سابق ریاستیں امب، ضلع ہزارہ کے قبائلی علاقے، ڈیرہ اسماعیل خان، مالاکنڈ ڈویژن میں سابق ریاست دیر، وات، چترال اور مالاکنڈ کے زرعی تحفظ والے علاقے دیگر قبائلی علاقوں کو چھوڑ کر شامل ہوں گے۔

15 سال بعد 30 جون 1970ء کو ون یونٹ توڑ دیا گیا۔ اس کے لئے پاکستان کی جمہوری قوتوں، خصوصاً نیپ نے زبردست جدو جہد کی تھی۔ اس جدو جہد میں سندھ اور خیبر پختونخوا میں اینٹی ون یونٹ فرنٹ کافی فعال رہا۔ مجموعی طور پر ون یونٹ کا خاتمہ نیپ کی زبردست سیاسی فتح تھی۔

محمود علی قصوری کا نیپ سے استعفیٰ اور پیپلز پارٹی میں شرکت

28 جولائی 1970ء کو پنجاب نیپ کے صدر میاں محمود علی قصوری نے نیشنل عوامی پارٹی کی قیادت اور رکنیت سے مستعفی ہوکر پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کرنے کا

اعلان کیا۔ اس موقع پر پیپلز پارٹی کے چیئر مین ذوالفقار علی بھٹو خود بھی موجود تھے۔

28 جولائی کی صبح اپنی رہائش گاہ پر صحافیوں سے بات کرتے ہوئے محمود علی قصوری کہہ رہے تھے:

''میں نے گہرے غور اور سوچ بچار کے بعد نیشنل عوامی پارٹی کی رکنیت اور پارٹی کے مختلف عہدوں سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ ممکن ہے آپ کو میرا یہ اعلان کسی حد تک غیر متوقع اور اچانک نظر آئے لیکن اس کے پیچھے ایک طویل سوچ کارفرما ہے''

محمود علی قصوری نے اپنے استعفے کی نقل کے ساتھ اپنی تجاویز بھی پیش کیں۔

10-16 اگست 1970ء کے ہفت روزہ لیل و نہار کے مکتوب لاہور (مکتوب نگار غالباً امین مغل) کے مطابق:

''نیپ سے استعفیٰ دینے کا اعلان بڑے ڈرامائی انداز میں کیا گیا۔ 28 جولائی کو لاہور کے اخباروں میں چھپا کہ گیارہ بجے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو میاں محمود علی قصوری کی رہائش گاہ پر ایک پریس کانفرنس سے خطاب کریں گے۔ یہ بڑی انوکھی بات تھی کہ پیپلز پارٹی کا رہنما نیپ کے رہنما کے گھر پریس کانفرنس کرے۔ اخبارات نے یہ بھی لکھا تھا کہ میاں صاحب سے جب 27 جولائی کی رات کو اس کانفرنس کے انعقاد کی غرض و غایت دریافت کی گئی تو انہوں نے کہا ''مجھے پتہ نہیں۔'' اور یہ کہ پریس کانفرنس بھٹو صاحب کے کہنے پر ان کی رہائش گاہ پر ہو رہی ہے۔ اخبارات کی اکثریت کی قیاس آرائی تھی کہ شاید بھٹو صاحب میاں صاحب کی قومی اسمبلی کی انتخابی مہم میں اپنی حمایت کا اعلان کرنے والے ہیں۔

نیپ کے کارکنوں کا بھی یہی خیال تھا، کیونکہ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ جمیعت العلمائے اسلام اور پیپلز پارٹی دونوں غیر رسمی طور پر میاں صاحب کو اپنی حمایت کا یقین دلا چکی ہیں۔ نوائے وقت نے البتہ قیاس آرائی کی تھی کہ میاں صاحب پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر رہے ہیں۔ لیکن اس کو نیپ کے ارکان اور رہنماؤں نے دوراز قیاس قرار دے کر مسترد کر دیا تھا۔ خاص طور پر جب کہ میاں قصوری ابھی 25 اور 26 جولائی ہی کو میانوالی

(اکلورکوٹ) میں صوبائی نیپ کی کونسل اور مجلس عاملہ کے اجلاس میں شرکت کر کے لوٹے تھے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہاں یہ موضوع ضرور زیر بحث آتا۔

بہر حال اخباری نمائندے جب بھٹو صاحب کی پریس کانفرنس میں پہنچے تو انہیں بڑی حیرانی ہوئی جب میاں محمود صاحب نے فرمایا کہ پہلے میں اپنا بیان پڑھوں گا۔ اس کے بعد انہوں نے نیپ کے صدر خان عبدالولی خان کے نام اپنا استعفیٰ پڑھنا شروع کیا جو انہوں نے 27 جولائی (یعنی ایک دن پہلے) لکھا تھا اور اپنے ایک خاص ایلچی کے ذریعے پشاور ولی خان کو بھیجا تھا۔

سیف خالد لائلپور میں تھے جب انہیں نیپ میں ٹوٹ پھوٹ کی خبریں ملیں۔ وہ بہت دل برداشتہ ہوئے۔ ابھی وہ اس صدمے سے پوری طرح نکل نہیں پائے تھے کہ ایک شام لاہور سے محمود علی قصوری تشریف لے آئے۔ انہوں نے سیف خالد کو پیپلز پارٹی میں شمولیت کی دعوت دی۔ ان کے پاس سیف خالد کے لئے لائلپور کی کسی بھی مرکزی سیٹ سے ایم این اے کا انتخاب لڑنے کی کھلی آفر تھی۔ میاں محمود علی قصوری یہ سوچ کر آئے تھے کہ سیف خالد ذہنی اور سیاسی طور پر ان سے اتنے قریب ہیں کہ وہ فوراً ہی پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لیں گے۔ سیف خالد کے لبوں پر رفیقانہ مسکراہٹ آئی اور بولے:

''میاں صاحب! آپ مجھے جانتے ہیں''

''آپ پرانے رفیق ہیں۔ میں نے سوچا''

''میاں صاحب آپ نے اپنی ذات کی حد تک جو فیصلہ کیا ہے۔ مجھے اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے لیکن ڈھاکہ سے واپسی پر آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اختلافات کے باوجود ان حالات میں آپ استعفیٰ نہیں دیں گے۔ پارٹی کے بعض امور سے مجھے بھی اختلاف ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ پارٹی سے استعفیٰ دے دیا جائے۔ ہمیں اپنے اختلافات نیپ کی مرکزی کونسل میں اٹھانے چاہئیں۔

سیف خالد کے صاحب زادے ندیم خالد کے مطابق ''جب میاں محمود علی قصوری نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور انہیں وہاں ایک اہم حیثیت ملی تو انہوں نے

میرے والد کو بھی پی پی پی میں شمولیت کی دعوت دی۔ قصوری صاحب ہمارے گھر آئے اور ان کے درمیان بات چیت پورے دن جاری رہی۔ اس وقت لائل پور میں پیپلز پارٹی کے پاس ایسے کارکن اور رہنما نہیں تھے جو الیکشن میں حصہ لے کر جیت سکتے۔ قصوری صاحب نے میرے والد سے پی پی پی کی تنظیم کاری کیلئے مدد چاہی اور انہیں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن میں امیدواروں کا چناؤ کرنے کے لئے کہا۔ لائل پور شہر کی مرکزی سیٹ میرے والد کو آفر کی گئی۔ بھٹو نے بھی ان سے ملاقاتوں کے دوران پی پی پی میں شامل ہونے کے لئے کہا۔ اس زمانے میں پنجاب سے بہت سارے ترقی پسند لوگ اس نئی پارٹی میں شامل ہو رہے تھے۔ کیمونسٹ پارٹی نے اپنے کارکنوں کو پیپلز پارٹی میں شمولیت کی اجازت نہیں دی۔ کیمونسٹوں کو جمہوری تحریک میں صرف نیشنل عوامی پارٹی تک محدود کرنا پنجاب کی سیاست کی حد تک کوئی اچھا فیصلہ نہ تھا۔ پنجاب میں ترقی پسند کارکنوں کو عوام کے زیادہ قریب تر رہنے میں یہ پلیٹ فارم شاید زیادہ کارآمد رہتا۔ لیکن جو ترقی پسند کارکنان اس جماعت میں شامل ہوئے بھی تو ان کو بعد میں بھٹو صاحب نے چن چن کر نکال دیا۔

لائل پور میں سیف خالد کے بہت سے ساتھیوں اور رفقاء کار نے بہر حال پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور اسمبلیوں میں منتخب ہوئے۔ ان میں والد کے دوست میاں اقبال، سخاوت علی خان، بدر چوہدری، رانا مختار، طاہر رانا، ان بائیں بازو کے رہنماؤں میں شامل تھے۔ پیپلز پارٹی کا پہلا جلسہ کوتوالی روڈ پر میرے والد کے دفتر کی چھت سے مخاطب کیا گیا جو رحمت گراموفون ہاؤس کے برابر واقع تھا۔ یہ اسٹور موسیقی کا انمول خزانہ رکھتا تھا اور میں نے حال ہی میں سنا کہ ٹیکنالوجی میں تبدیلی کے باعث وقت کا ساتھ نہ دے پایا اور حال ہی میں بند ہو گیا۔“

راقم الحروف کو ان دنوں حبیب جالب کی ایک ملاقات یاد آتی ہے۔ انہوں نے کہا تھا:

”میاں صاحب نے پیپلز پارٹی میں شمولیت کے بدلے، لاہور سے ایم این اے کی سیٹ کی آفر کی ہے میں نے انکار کر دیا ہے۔ اب وہ یہ آفر لے کر لائل پور سیف کے

پاس جا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے سیف بھی انکار کر دے گا۔"

چند روز بعد سیف خالد سے ملاقات ہوئی تو وہ نیپ نہ چھوڑنے کے معاملے پر پر عزم تھے۔ مشرقی پاکستان میں تباہ کن سیلابوں کے بعد صدر یحییٰ نے مشرقی پاکستان کا دورہ کیا اور سیلابی صورت حال کے باعث اعلان کیا کہ عام انتخابات اب اکتوبر کی بجائے دسمبر 1970ء میں ہوں گے۔

پورا ملک اب انتخابی ریلے میں تھا۔ نیپ نے حبیب جالب کو گڑھی شاہو کے علاقے سے صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ دیا۔ سیف خالد، جالب کی بھرپور حمایت کر رہے تھے لیکن نیپ کی ٹوٹ پھوٹ کے باعث اندر سے بے حد دل گرفتہ تھے انہی دنوں روس سے انہیں کاروباری دھچکا پہنچا۔ اس تمام صورت حال کے نتیجے میں یکم نومبر 1970ء کو انہیں دل کا شدید دورہ پڑا۔ وہ ایک پر عزم سیاسی کارکن تھے۔ اس حالت میں انہیں ہسپتال پہنچایا گیا۔ انہوں نے بیماری کا ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن ہسپتال میں دل ہارنے کے اور بھی بہت سے اسباب تھے۔ سیف کے بھانجے وحید بتاتے ہیں کہ ہسپتال کی ایک خوبصورت نرس ماموں پر مرمٹی۔ اس سلسلے میں ماموں کی اپنی مٹی بھی بہت زرخیز تھی۔ سیف ہسپتال سے گھر آگئے تو وہ نرس انہیں گھر بھی دیکھنے آتی رہی۔ اسی دوران اس نرس نے انہیں ایک طویل محبت نامہ لکھ بھیجا جو ان کی بیگم کے ہاتھ لگ گیا۔ اگر چہ وہ سیف کے عاشقانہ مزاج سے واقف تھیں لیکن خط پڑھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ندیم بھی بتاتے ہیں کہ ان کی والدہ نے ایسے بہت سے خطوط سنبھال کر رکھے ہوئے تھے جو شادی سے پہلے مختلف خواتین انہیں لکھتی رہی تھیں۔ شادی سے پہلے بھی خواتین سے ان کی بہت دوستیاں تھیں۔ یونیورسٹی دور کی ایک لڑکی رافعہ تو شادی کے بعد بھی انہیں ملنے آیا کرتی تھی۔ یونیورسٹی لاء کالج کے زمانے میں ان کی ایک دوست ندرت الطاف تو ان کی شادی میں بھی شریک ہوئی تھی۔

بہر حال سیف خالد دل کے عارضے سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور لائل پور میں رہ کر ہی انتخابی عمل میں سیاسی کردار ادا کیا۔ جالب کو لاہور کے صوبائی حلقے سے شکست ہوئی

لیکن کئی اعتبار سے یہ انتخاب یادگار رہا۔ ووٹ اگرچہ انہیں نہیں ملے لیکن انتخابی جلسوں میں ان کی نظموں کا پلڑا تقریروں پر بھاری رہا۔

جالب کا انتخابی معرکہ

جالب نے نیپ کے انتخابی جلسوں میں پنجاب بھر میں تقریریں کیں۔ مجھے راولپنڈی میں جالب کا ایک جلسہ یاد ہے۔ اس جلسے میں جالب کی تقریر ان کی شاعری پر بھاری پڑ گئی۔ انہوں نے ظلم، استحصال اور آمریت کے خلاف نیشنل عوامی پارٹی کی طویل جدو جہد کا ذکر کرتے ہوئے لوگوں کو یاد دلایا کہ اس جنگ میں کون کس کے ساتھ تھا۔ کس نے مزدوروں، کسانوں غریبوں اور کچلے ہوئے عوام کی حمایت کے جرم میں زخم کھائے۔ لیکن مسلک کو نہیں چھوڑا وہ کون سی پارٹی تھی جس سے استبدادی نظام کے خلاف تحریک کی آب یاری اپنے خون سے کی۔ انہوں نے کہا کہ اس تحریک کا پہلا شہید حسن ناصر تھا۔ جو نیشنل عوامی پارٹی کا لیڈر تھا وہی حسن ناصر جسے اس قدر خوفناک اذیتیں دے کر شہید کیا گیا کہ اس کی ماں بھی اپنے لخت جگر کی لاش کو نہیں پہچان سکی۔ جالب نے لوگوں کو یاد دلایا کہ اس وقت بھی میں نے کہا تھا۔ ؎

سیکڑوں حسن ناصر ہیں شکار نفرت کے
صبح و شام لٹتے ہیں قافلے محبت کے
دوستوں کو پہچانو، دشمنوں کو پہچانو
دس کروڑ انسانوں، زندگی سے بے گانو

جالب نے لوگوں یاد دلایا کہ کندن لال بھی نیشنل عوامی پارٹی ہی کا ممبر ہے جسے پیکجز لمیٹڈ لاہور میں مزدوروں کی حمایت اور انتظامیہ کی دھاندلیوں کے خلاف آواز بلند کرنے کے جرم میں کوڑوں اور قید کی سزا دی گئی انہوں نے کہا کہ یہ نیشنل عوامی پارٹی ہی تھی جس نے سب سے پہلے آزاد خارجہ پالیسی کے حق میں آواز بلند کی اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ امریکہ کی محتاجی سے نجات حاصل کرے۔

جالب نے کہا کہ سرمایہ داری اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف سب سے پہلے ہم نے بات کی اور ہم لکھ کر بات کرتے ہیں انہوں ے کہا میں نے دس سال تک ایوبی آمریت کے خلاف جنگ کی ہے اور اس وقت بے شمار ادیب شاعر جاگیرداراور سرمایہ دارایوب کے ساتھ تھے۔ میں نے ایوب کو صلاح الدین ایوبی نہیں کہا بلکہ یہ مطالبہ کیا کہ اس ملک کے اصل حاکم عوام ہیں لہٰذا ان کا حق حاکمیت واپس کر دو اور اس حق گوئی کی پاداش میں میری کتاب ضبط کی گئی۔ مجھے پابند سلاسل کیا گیا۔ میرے خلاف قتل کے مقدمات بنائے گئے او اس سے بھی کام نہ چلا تو پھر آمریت نے مجھے خریدنے کی کوشش کی گئی کہ تم خاموش ہو جاؤ ہم تمہیں تمہاری خاموشی کی منہ مانگی قیمت ادا کردیں گے۔لیکن نیشنل عوامی پارٹی جس کی تاریخ ایثار و قربانی سے عبارت ہے کوئی طاقت اس کے کسی کارکن کو کیسے خرید سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ آج نیشنل عوامی پارٹی کو نہ ستائش تمنا ہے نہ صلہ کی پروا ہمیں کوئی کریڈٹ کوئی تمغہ نہیں چاہئے۔ کیونکہ تمغے حکومت دیتی ہے ہمارے لئے یہی فخر کافی ہے کہ ہم نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا۔

جلسے میں پنجاب بہاولپور نیشنل عوامی پارٹی کے جنرل سیکرٹری شریف متین، نیپ پشاور کے صدر محمد صدیق خان، نیپ پنجاب کے صدر چوہدری ممتاز علی اور نیپ پنجاب کی نائب صدر بیگم نسیم شمیم اشرف ملک نے بھی تقریریں کیں لیکن جو سماں جالب کی نظموں نے باندھا، وہ اپنی مثال آپ تھا۔ انہوں نے ''خطرے میں اسلام نہیں''، ''پاکستان کا مطلب کیا''، اور ''گھیراؤ'' جیسی نظمیں سنائیں۔

لاہور کے جلسوں کی گرما گرمی کم نہیں رہی۔ باجی نسیم اشرف ملک بتاتی ہیں کہ ''ہم نے گڑھی شاہو لاہور میں بیگم لطیف افغانی کے گھر سے انتخابی مہم چلائی ہر روز صبح الیکشن کی حلقہ وار فہرستیں بنتیں، وہیں دوپہر کا کھانا کھایا جاتا اور شام کو ہم سب کارنر میٹنگ کے لئے نکل جاتے۔ انتخابی مہم کے دوران فنڈز اکھٹے کرنے کے لیے ہم نے کئی فنکشن کئے۔ ایک فنکشن میں ایک لڑکی نے جالب کے قدموں میں بیٹھ کر انقلابی نظمیں سنائیں۔

مہر رؤف عزیز اپنی کتاب ''حبیب جالب۔ایک مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:

''1970ء کے الیکشن میں نیپ نے لاہور سے صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ حبیب جالب کو دیا ان کے مقابل پیپلز پارٹی تھی جو کہ ایک بڑی جماعت تھی حبیب جالب گڑھی شاہو کے علاقے سے الیکشن کے لئے کھڑے ہوئے اور یہ حلقہ مزدوروں اور غریب لوگوں کا علاقہ تھا۔ برادری سسٹم بھی تھا۔ بھٹو کی مقبولیت بھی تھی۔ جھونپڑی نیپ کا نشان تھا۔ جالب سارا سارا دن کارنر میٹنگز کرتے رہتے تھے۔ صبح کو نکلتے اور شام کو واپس آتے تھے۔ جالب کے جلسے بڑے بھرپور ہوا کرتے تھے لوگ بڑی تعداد میں شرکت کرتے تھے۔ اب جالب کا مقابلہ نیپ سے گئے ہوئے لوگوں شیخ رفیق احمد، میاں محمود علی قصوری اور رؤف طاہر جیسے لوگوں سے تھا۔ اب پیپلز پارٹی کے لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ آپ ہمارے ٹکٹ پر کھڑے ہو جائیں۔ ہم اپنا بندہ بٹھا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے ہماری لائن مشکل لائن تھی۔ ہماری پارٹی کے لیڈر ولی خان تھے اخبارات اور حکومت نے ولی خان اور ان کے والد غفار خان کے خلاف لوگوں کے دلوں میں زہر بھر دیا تھا۔ یہ پراپیگنڈہ اتنا شدید تھا کہ لوگ اسے ہماری کمزوری سمجھتے تھے۔ ہم غفار خان کو بھی Defend کرتے اور لوگوں کو بتاتے کہ انہوں نے انگریز کے خلاف جنگ لڑی، ہٹلر کے خلاف لڑے، تحریک آزادی ہندوستان میں حصہ لیا۔ ہم لاکھ کہتے کہ قائداعظم نے انہیں چائے پر بلایا۔ پہلی آئین ساز اسمبلی کے وہ ممبر تھے لوگ نہیں سنتے تھے۔ غفار خان نے قائداعظم سے کہا تھا کہ آپ میرے ہاں آئیں مگر قیوم خان اور آئی جی سرحد جو انگریز تھا انہوں نے قائداعظم کو ورغلا دیا اور کہا کہ آپ کی زندگی کو خطرہ ہے۔ لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ ہے تو قائداعظم نہیں جا سکے۔ ان کے انتظار میں بھابڑہ کے مقام پر لوگ دورویہ کھڑے تھے کہ عبدالقیوم خان نے ان پر گولی چلا دی۔ اس میں سات سو آدمی مارے گئے۔ اسی میں عبدالولی خان کی پہلی بیوی بھی ماری گئی۔ اس واقعہ کے بعد غفار خان کو بہت عرصہ تک جیل میں رکھا گیا۔ میرے حلقے میں کچھ پٹھان بھی رہتے تھے۔ لیکن الیکشن کا نتیجہ ہمارے خلاف نکلا اس حلقے میں فرزند اقبال جناب جاوید اقبال بھی الیکشن میں کھڑے ہوئے مگر وہ بھی ہار گئے لیکن پھر بھی جالب کو پیش کش ہوتی رہی جن کو جالب نے کبھی قبول نہیں کیا۔

'' آزاد اخبار میں حمید اختر، عبداللہ ملک، حسین نقی اور آئی اے رحمن تھے انہوں نے لکھا کہ حبیب جالب کے مقابلے میں پیپلز پارٹی کو اپنا آدمی نہیں کھڑا کرنا چاہئے تھا۔ اور انہیں سپورٹ کرنا چاہئے تھا لیکن پیپلز پارٹی اس طرح کبھی نہیں سوچتی ان کا اپنا مزاج ہے کہ یہ ایک پارلیمانی پارٹی ہے۔ ٹی وی پر جب الیکشن پر تبصرہ ہو رہا تھا تو سب مبصروں نے افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ ''حبیب جالب کا ہارنا بہت تکلیف دہ ہے۔'' الیکشن کے نتائج میرے خلاف تھے پورے پاکستان کی ہمدردیاں میرے ساتھ تھیں۔ اس سے میں خوش ہوا جالب نے کہا کہ مجھے یاد ہے کہ ولی خان نے مجھے ایک ہزار روپے دیئے جو میں نے نیپ کے فنڈ میں جمع کروا دیئے کہ ہمارے پاس لاؤڈ سپیکر نہیں ہے وہ خرید لیا جائے۔ اس پر اجمل خٹک نے کہا کہ آپ کی باتیں ہمیں بہت پسند ہیں اور آپ انہی باتوں کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ ہمارے ہاں بہت کم لوگ ایسا کیا کرتے ہیں کسی میں اتنا حوصلہ نہیں ہوتا کہ وہ پیسہ پارٹی کو لوٹا دے لیکن یہ اس وقت پر ہی منحصر نہیں تھا آج تک ایمانداری اور پوری دیانت سے اپنے نظریات کے لئے لڑتے آئے ہیں۔

جالب کو ساڑھے سات سو ووٹ ملے تھے۔ جالب کے لئے وہ ساڑھے سات سو آدمی بہت عظیم ہیں ان میں احمد ندیم قاسمی تھے اور محمد طفیل ''نقوش'' کے جو مدیر تھے۔ ان کے بھی ووٹ میرے ساتھ تھے وہ اسی علاقے میں رہتے تھے۔ میں نے کئی بار چاہا کہ گڑھی شاہو کے ان ساڑھے سات سو آدمیوں کو چائے پر بلاؤں مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں کہ بھٹو کے طوفان میں ان ساڑھے سات سو آدمیوں نے مجھے ووٹ دینا پسند کیا اور میرا سر فخر سے اونچا کیا۔

نیپ اور 1970ء کے انتخابات

سندھ اور پنجاب میں نیپ کے انتخابات کا ذکر کرتے ہوئے نواز بٹ بتاتے ہیں۔:

''دسمبر 70ء کے انتخابات میں نیپ کا سندھ میں برا حال ہوا۔ ڈاکٹر اعزاز نذیر کو تین سو ووٹ ملے۔ وہ نیپ کے لانڈھی سے امیدوار تھے، بڑے ٹریڈ یونین لیڈر تھے۔

ان انتخابات میں سندھ کی حد تک پیپلز پارٹی کی انتخابی ایڈجسٹمنٹ ہونے جا رہی تھی۔ صرف اس وجہ سے کہ ڈاکٹر اعزاز نذیر کی نشست پر جنرل اکبر پیپلز پارٹی کے امیدوار تھے۔ میں نیپ کراچی کا سیکرٹری جنرل تھا اور حفیظ پیرزادہ پیپلز پارٹی کے صدر تھے۔ حفیظ پیرزادہ ہی مجھے بھٹو کے پاس لے کر گئے۔ بھٹو نے کہا کہ اعزاز نذیر کی سیٹ چھوڑ دو باقی نشستوں پر انتخابی ایڈجسٹمنٹ ہو جائے گی۔ نیپ کے سندھ میں چار پانچ ہی امیدوار تھے۔ اس میں معراج محمد خان کی سیٹ تھی جو لالوکھیت والی تھی جو پہلے ہی انتخابات کا بائیکاٹ کر چکے تھے۔ وہ پرچی نہیں برچھی کا نعرہ لگا رہے تھے۔ یہ خورشید حسن میر کا فلسفہ تھا۔ بھٹو کو مسئلہ نہیں تھا عثمانی اور رشید کو نواب شاہ میں چھوڑنے کو تیار تھے۔ اعزاز نذیر نشست چھوڑنے کو تیار نہیں تھے باقی تمام نشستوں پر ایڈجسٹمنٹ کرنے کو تیار تھے۔

"میں نے بہت کوشش کی کہ اعزاز نذیر کو ہٹا دیا جائے اور انہیں روہڑی جہاں سے انکا بنیادی تعلق تھا وہاں سے انتخابات لڑایا جائے تو پیپلز پارٹی کو منا لوں گا مگر پارٹی نہیں مانی۔ ڈاکٹر اعزاز نذیر کو تین سو ووٹ ملے تھے۔ میں انچارج الیکشن تھا۔ شمیم واسطی حیدرآباد میں اڑھائی سے تین سو ووٹ لے سکے۔ ان انتخابات میں سندھ سے کیمونسٹوں کو ووٹ نہیں ملے۔ بہت برا حال ہوا۔ نہ ہی کیمونسٹوں اور نہ ہی نیپ کے امیدواروں کو ووٹ ملے۔

پنجاب میں نیپ کے پاس امیدوار نہیں تھے۔ محمود علی قصوری چلے گئے تھے جس کے بعد حبیب جالب کو کھڑا کرنے کی کوشش کی مگر پیسے نہیں تھے۔ شمیم اشرف ملک وغیرہ کہاں سے اسے فنڈ کرتے۔ سیف خالد نے سپورٹ دی مگر اس کے پاس بھی پیسے اتنے نہیں تھے۔ محمود الحق عثمانی کا انتخاب مجھے یاد ہے ایک لاکھ روپے لگے تھے عثمانی چیخ پڑا تھا کہ کہاں سے پورا کروں۔ جالب اپنے طور پر مغل پورہ حلقہ سے اعتزاز احسن والی نشست پر انتخابات لڑے مگر بری طرح شکست ہوئی۔ نیپ منظم نہیں تھی بری طرح ہاری۔

پنجاب میں بھاشانی نیپ کا بڑا زور تھا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بھاشانی گروپ نے کسان کانفرنس کی تھی۔ میجر اسحاق اس وقت ان کی طرف تھے۔ میجر اسحاق اور فتح محمد نے

کسان کانفرنس کرائی مگر بھاشانی نے انتخابات سے چند دن پہلے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔انہوں، نے کہا تھا الوداع مغربی پاکستان۔ یہ نعرہ انہوں نے مشرقی پاکستان میں آئے ہوئے سائیکلون کی وجہ سے احتجاج میں کیا تھا۔

ولی خان اور بھاشانی کی 1968ء میں علیحدگی کی وجہ کمیونسٹوں کا اختلاف تھا۔مشرقی پاکستان میں سوویت یونین نواز کمیونسٹوں کا غلبہ تھا۔نوے فیصد سوویت نواز تھے پنجاب میں تھوڑا معاملہ تھا سندھ میں تو ان کے پاس امیدوار بھی نہیں تھے کہ ضلع وار کھڑا کر دیتے۔

1968ء میں مشرقی پاکستان کے کمیونسٹوں کا جھگڑا ہو گیا۔ 65ء میں فاطمہ جناح کے انتخابات کا کمیونسٹ فرکشن میرے گھر پر ہوا۔ پروفیسر مظفر، سیف خالد اس میں شامل تھے۔ فاطمہ جناح کے معاملے پر جھگڑا ہوا۔ پہلا مسئلہ یہ آیا کہ مسلم لیگ والے جنرل اعظم کو امیدوار بنا رہے تھے۔ بھاشانی آکر ان کی حمایت میں نعرے لگا رہے تھے۔کمیونسٹ کہہ رہے تھے کہ جنرل اعظم نہیں کسی اور کو بناؤ، کیونکہ اس کا فوج سے تعلق رہا ہے۔ 65ء میں کمبائنڈ اپوزیشن پارٹی بنی۔ اس پارٹی میں محمود الحق عثمانی کو سٹیرنگ کمیٹی کا ممبر بنایا گیا۔ تو عثمانی نے مجھے سنٹرل کمیٹی کا ممبر بنا دیا۔سنٹرل کیٹی میں شیخ مجیب الرحمان، محمود اعظم فاروقی، مسلم لیگ کے جمیل احمد تمبا کو والا تھے۔ یہ کمبائنڈ اپوزیشن پارٹی کی سنٹرل کمیٹی تھی۔

لکھم ہاؤس کراچی سہروردی کے گھر، فاطمہ جناح کو امید دار بنانے کا اعلان ہوا۔ اعلان سے پہلے مولانا بھاشانی اور کچھ لوگ گئے تاکہ رضامندی حاصل کر سکیں۔ فاطمہ جناح نے رضا مندی ظاہر کر دی۔ مگر جب فاطمہ جناح کا نام دیا گیا تو مسلم لیگ جنرل اعظم کے نام سے دستبردار ہو گئی۔

1970ء کے انتخابات میں حبیب بنک نے بھٹو کو دس لاکھ روپے انتخابی فنڈ میں دیئے۔ نیپ کو تین لاکھ ملا، نیپ کو ملنے والے تین لاکھ میں سے ایک لاکھ پروفیسر مظفر لے گئے، ایک لاکھ ولی خان لے گئے، پنجاب اور سندھ کو کچھ نہیں ملا تھا، میرے سامنے، میں اس کا گواہ ہوں۔ شیخ مجیب کی عوامی لیگ کو زیادہ پیسے ملے شائد بیس لاکھ تھے۔ شیخ مجیب اس وقت محمود ہارون کی انشورنس کمپنی کے ملازم تھے اور ان کی چار ہزار روپے تنخواہ تھی۔

اس زمانے میں بڑی بات تھی۔ فیض کی تنخواہ چار ہزار تھی، ڈپٹی کمشنر کی اس وقت تنخواہ ڈھائی سو روپے تھی۔

نیشنل عوامی پارٹی کو مشرقی پاکستان میں ایک نشست بھی نہیں ملی تھی۔ مسلم لیگ کے نورالامین اور تری دیو رائے آزاد امید وار کی نشست کے علاوہ عوامی لیگ نے تمام نشستیں جیت لی تھیں۔ بلوچستان کی چار نشستیں نیپ نے جیتی تھیں۔ طالب علم ڈاکٹر عبدالحیٔ، مری اور بزنجو اور جینیفر موسیٰ خواتین کی نشستوں پر جیتی تھیں۔

بھٹو صاحب کو نظر آرہا تھا کہ اگر عوامی لیگ نے مرکز میں حکومت بنالی تو ان کا حکومت بنانے کا مستقبل میں کوئی موقع نہیں ہوگا۔ پیپلز پارٹی کے جیتے ہوئے ارکان قومی اسمبلی بھی عوامی لیگ کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے پنجاب میں سیف خالد، امین مغل اور کئی دیگر زعما نے یہ اصولی مؤقف اختیار کیا کہ عوامی لیگ کو مرکز میں واضح اکثریت حاصل ہوئی ہے اس لئے مرکز میں اس کا حکومت بنانے کا پورا حق ہے اور پیپلز پارٹی کو اس جمہوری عمل میں رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہئے لیکن پیپلز پارٹی کے رویے کے باعث سیاسی صورت حال پیچیدہ ہوگئی اور معاملہ مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن تک جا پہنچا۔

چھٹا باب

سیف خالد، نیا پاکستان اور اس کے مسائل

اس سے پہلے کہ مشرقی پاکستان کے خونی بحران پر تفصیلی بات کی جائے 1969-70ء کے کچھ اور واقعات پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

سیف خالد کی ایوب خان کے خلاف جدو جہد

ایوب خان کے آخری دن تھے جب نواز بٹ اور سیف خالد الگ الگ پکڑے گئے۔ کراچی میں سیف نے جوتوں کا جو کارخانہ بنا رکھا تھا وہ لیاقت ہاؤس کے نام سے جانا جاتا تھا اور سیف نے اسے ایک گیسٹ ہاؤس بنا رکھا تھا سیف جب بھی لائلپور سے آتے وہیں قیام کرتے اور دوستوں کو بلا کر ان کی خاطر تواضع کرتے۔ سیف دل کے بھی بہت کھلے تھے۔ ایک بار وہ لائلپور آئے تو پارٹی نے نواز بٹ کو زیر زمین چلے جانے کی ہدایت کردی۔ انہوں نے لیاقت ہاؤس میں پناہ لی۔ سیف خالد شام کو جالب کو بھی بلا لیا کرتے۔

"ایک دو روز بعد سیف واپس چلے گئے۔ میں بھی وہاں سے نکل گیا۔ کیونکہ تین چار دن سے زیادہ ایک جگہ روپوش نہیں رہ سکتے تھے۔ میرا اگلا ٹھکانہ ملک نورانی اور بیگم ممتاز نورانی کا گھر تھا۔ یہ گھر زیر زمین کامریڈوں کے لئے ایک محفوظ پناہ گاہ تھی جہاں ایک زمانے میں سجاد ظہیر اور حسن ناصر بھی ٹھہرا کرتے تھے۔ ملک نورانی اور بیگم نورانی کی کمیونسٹ کاز کے لئے بے پناہ خدمات ہیں۔

لاہور میں کل پاکستان طلباء کنونشن

6مارچ 1970ء کو لاہور میں کل پاکستان طلباء کنونشن منعقد ہوا جس میں ملک بھر سے ترقی پسند طلباء نے شرکت کی۔

فیڈرل یونین میں پاکستان بھر کی طلباء تنظیمیں۔ ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس یونین، بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن، پختون سٹوڈنٹس یونین، سندھ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن، اور این ایس ایف (کاظمی گروپ) شامل تھیں۔ ہمارے گورو امین مغل ان دنوں لاہور سے ہفت روزہ ''لیل و نہار'' سے وابستہ تھے کراچی سے یہ جریدہ فیض احمد فیض، سبط حسن اور حسن عابدی مل کر نکال رہے تھے، فیڈرل یونین کی لاہور کانفرنس کی مفصل روداد امین مغل کے قلم کا نتیجہ ہے۔

''ہم نسل انسانی کے اعلیٰ آدرشوں کی خاطر اپنی تمام جسمانی، ذہنی اور جذباتی توانائیاں وقف کر دیں گے۔

تاکہ اس دنیا میں

} فرد معاشرے کے لئے ہو اور معاشرہ فرد کے لئے

} فرد معاشرے کا ضمیر ہو اور معاشرہ فرد کا جسم

یہ الفاظ اس عہد نامے کے ہیں جسے پنجاب بھر کے طالب علم نمائندوں نے 7 مارچ 1970ء کی صبح کو لاہور میں تیار کیا۔ پنجاب کے مختلف علاقوں کے مندوبین نے اس موقع پر پنجاب سٹوڈنٹس یونین کی بنیاد رکھی اور پنجاب، بلوچستان، سندھ، کراچی اور سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) کے طالب علموں نے پاکستان گیر وفاقی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس کانفرنس میں لاہور، لائل پور، راولپنڈی، پاک پتن، جڑانوالہ، ملتان، گوجرانوالہ، کے علاوہ کئی اور مقامات سے طالب علم مندوبین نے شرکت کی۔ بلوچ سٹوڈنٹس آرگنایزیشن کا چالیس افراد کا وفد اپنے چیئرمین عبدالحئ بلوچ کی قیادت میں آیا

تھا۔ پختون سٹوڈنٹس یونین کے احمد کمال اور نثار احمد شنواری اپنے ساتھیوں سمیت موجود تھے۔ سندھ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کا وفد اپنے قائد جام ساقی کی رہنمائی میں اور کراچی سے صدر نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن محمد احمد اپنے ساتھیوں سمیت آئے ہوئے تھے۔ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر امیر حیدر کاظمی خود شرکت نہیں کر سکے کہ وہ کراچی سینٹرل جیل میں قید تھے۔ ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس یونین کے صدر شمس الضحیٰ اور سابق صدر مطیعہ چودھری نے اپنے اپنے پیغام میں کانفرنس کو مکمل تعاون اور یک جہتی کا یقین دلایا تھا۔ پنجاب سے باہر کے نمائندے اس کانفرنس میں بطور مبصر شریک ہوئے۔

6مارچ کے افتتاحی اجلاس کی صدارت جام ساقی نے کی۔ جام ساقی ایک شاعر بھی تھا اور شعلہ بیاں مقرر بھی۔

جام ساقی کی صدارت میں پنجسو کے کنوینر محمد اشرف نے کہا کہ ”عوامی جدو جہد کے موجودہ دور میں، جب لوگوں کو معاشی، تہذیبی اور معاشرتی مسائل درپیش ہیں، یہ طے کرنا ضروری ہو گیا ہے کہ ہمارے تعلیمی مسائل کیا ہیں؟ ان مسائل کا حل کیا ہے؟ ان کا ملکی مسائل سے کیا رشتہ ہے اور انہیں حل کرنے میں طلبا کی قوت کیا لائحہ عمل وضع کر سکتی ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے کون سا کردار ادا کر سکتی ہے۔

اس تقریب میں فیض صاحب موجود نہیں تھے لیکن ان کا پیغام موجود تھا۔

”طلبا کے مسائل پر آپ کی تحریر اس قدر صحیح، مدلل واضح اور باشعور ہے کہ جی خوش ہو گیا۔ آپ کے اغراض و مقاصد بھی صحیح خطوط پر ہیں۔ اگر آپ اپنی برادری کی ان خطوط پر مؤثر ذہنی تربیت کر سکیں، انہیں جماعتی قومی اور بین الاقوامی معاشرے کے حقائق و مسائل سے روشناس کرا سکیں اور انہی حقائق کی روشنی میں ان کے فکر و عمل کی صحیح راہیں متعین کر سکیں تو بڑا کام ہو گا۔“

عطااللہ مینگل نے اپنے پیغام میں یاد دلایا کہ طلبہ نے آمریت کے قلعہ کو مسمار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اب عام لوگوں کے درپیش دوسرے مسائل کو حل کرنے کے لئے آگے بڑھنا چاہئے۔ انتخابات کے زمانے میں ان کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔

''انتخاب کوئی ایسی طلسمی چھڑی نہیں کہ چشم زدن میں عوام کو خوشحالی اور خوشی کی دولتوں سے مالامال کر دے۔''

محمود علی قصوری نے اپنے پیغام میں کہا۔''نوجوانوں کو قدرت نے راست گو، بہادر اور بے باک ہونے کی نعمت عطا کی ہے۔ پرائمری سے یونیورسٹی مدارج تک مفت تعلیم اب خواب نہیں رہنی چاہئے۔''

عوامی ادبی انجمن کے پلیٹ فارم سے پنجابی ادیب اور شاعر احمد سلیم نے کہا''ہم ادب کے راستے زندگی کی جس منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں اس کی سمت آپ تعلیم کے راستے سے آگے جا رہے ہیں۔ ہمیں یوں ہی تمام مزدوروں، کسانوں اور دانشوروں کو مختلف چھوٹے بڑے راستوں سے ہوتے ہوئے بالآخر ایک شاہراہ پر ملنا ہے ہمیں ایک بڑی اکائی میں بدلنا ہے۔''

تعلیمی سیشن کی صدارت بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے چیئر مین عبدالحیٔ بلوچ نے کی۔ مسکراتی ہوئی آنکھیں، سیدھا سادہ انداز، بے باکی اور انکسار، یہ عبدالحیٔ تھے جو ڈاکٹر صاحب کہلاتے تھے۔ بلوچوں کی نیکی، شرافت اور غیرت کا مظہر، حلقہ یاراں میں بریشم کی طرح نرم، اس محفل میں نوجوان تحریک کے پرانے رہنما سعید حسن خان نے بتایا کہ کس طرح نوجوانوں کی عالمی ترقی پسند تحریک، ڈیموکراٹک فیڈریشن آف یوتھ کو ناکام بنانے کے لئے سی آئی اے نے متوازی تنظیم بنائی۔

ایس مغل نے نوجوانوں اور طالب علموں کے عالمی کردار کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اس کے خطرناک رجحانات کی نشاندہی کرتے ہوئے طالب علموں کے محنت کش طبقہ کی رہنمائی میں سماج کے دوسرے حصوں کے ساتھ مل کر جدو جہد کرنے پر زور دیا۔

اگلے دن تنظیمی اجلاس تھا جس کی صدارت پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سابق صدر احمد کمال نے کی۔ پنجاب کے مختلف طالب علم نمائندوں نے تقریریں کیں۔ راولپنڈی کی نیشنلسٹ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے پروفیسر راغب نے اپنی تنظیم کے پنجسو میں مدغم ہونے کا اعلان کیا۔ عہد نامہ، آئین اور منشور منظور کئے گئے اور پنجسو کا انتخاب کیا گیا۔

باسط میر صدر، عباس رضوی سیکرٹری اور لیاقت علی خزانچی چُنے گئے۔ مختلف تعلیمی سیاسی قومی اور بین الاقوامی مسائل پر قرار دادیں منظور کی گئیں۔ اسی اجلاس میں کانفرنس کے مہمان اور مبصر حبیب جالب نے اپنی نظمیں سنائیں۔ انجمن جمہوریت پسند خواتین کی سیکرٹری جنرل طاہرہ مظہر علی نے بھی تقریر کی اور یہ محض اتفاق تھا لیکن کتنا حسین اتفاق تھا کہ شام کو مہمان طلبہ لینن کے صد سالہ جشن کی ایک تقریب میں شریک ہوئے جس میں حبیب جالب، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر مبشر حسن، مظہر علی خان اور کمیٹی کے صدر لاہور کے مشہور دانشور ڈاکٹر نذیر احمد نے سامعین سے خطاب کیا۔

طلبہ کی نمائندہ تنظیموں کی رابطہ کمیٹی کے فیصلہ کے مطابق یہ کانفرنس ایک پاکستان گیر تنظیم بنانے کے لئے بلائی گئی تھی۔ اس میں بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن، پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن، سندھ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن، (کراچی) نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن، اور پنجسو کے نمائندے بطور مندوب شریک ہوئے۔ اس موقع پر ایک پاکستان گیر وفاقی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس کا نام ''پاکستان فیڈرل یونین آف سٹوڈنٹس'' رکھا گیا۔ عہد نامہ، آئین اور منشور اصولی طور پر منظور کر لیئے گئے۔ قرار دادیں پاس کی گئیں اور یہ طے پایا کہ تین ماہ کے اندر اندر فیڈرل یونین کے انتخابات کرائے جائیں۔ اس غرض سے ہر وفاقی یونٹ سے تین تین ارکان پر مشتمل پندرہ رکنی تنظیمی کمیٹی تشکیل پائی جس میں تین نمائندے مشرقی پاکستان سٹوڈنٹس یونین سے لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ صدر شمس الضحیٰ اپنے خط میں اس وفاق کے قیام کی تائید کر چکے تھے۔ اجلاس کی صدارت این ایس ایف کے قائم مقام صدر محمد احمد نے کی۔ مقررین میں محمد احمد، جام ساقی، عبدالحیٔ بلوچ، نثار احمد شنواری (پختون) اور پنجاب کے مندوبین شامل تھے۔

شام کے اجلاس کی صدارت پنج سُو کے نومنتخب صدر باسط میر نے کی۔ میاں محمود علی قصوری، سیف خالد، شیخ رفیق احمد، لطیف افغانی، پیکجز ورکرز یونین کے الطاف بلوچ اور انجمن جمہوریت پسند خواتین کی نسیم اشرف ملک نے تقریریں کیں۔ عوامی ادبی انجمن اور پنج سُو کے اشتراک سے ادبی محفل کا انعقاد ہوا۔ جس میں گل خان نصیر اجمل خٹک، شیخ ایاز،

حبیب جالب کی شاعری کے علاوہ ہر علاقے کے طالب علم شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ محفل کے صدر منیر احمد نے سندھی ادب کی تاریخ کا ایک جائزہ پیش کیا۔

ان دونوں کانفرنسوں کے فیصلے تاریخی اہمیت رکھتے تھے ان سے طالب علموں کی بالغ نظری، وسعتِ قلب اور بین الاقوامی انقلابی جذبے کا پتا چلتا تھا۔ مثلاً سیاست کے باب میں یہ طے پایا کہ طلبہ کا سیاست میں حصہ لینا ان کا تاریخی فریضہ ہے اور انہیں سیاست سے علیحدہ رکھنے کی تمام کوششیں گہری سازش کا نتیجہ ہیں۔ مختلف مقررین نے اعلان کیا کہ طالب علم اور سیاست لازم وملزوم ہیں۔ طالب علموں نے عالمی سیاست میں فعال کردار ادا کیا ہے اور انہیں یہ فعال کردار ادا کرتے رہنا چاہئے۔

مزدوروں، کسانوں، دانشوروں، چھوٹے دکانداروں اور طالب علموں کو خراج تحسین پیش کیا گیا کہ انہوں نے اپنی با اصول جدو جہد سے ایوب آمریت کے سنگین بت کو پاش پاش کر دیا۔ اور اس طرح ایک بار پھر اس تاریخی اصول کو دہرایا کہ اقتدار کا منبع عوام ہیں، چھوٹے صوبوں، مشرقی پاکستان اور پنجاب کے ترقی پسند عوام کو مبارک باد پیش کی گئی کہ ان کی کوششوں نے ون یونٹ کا خاتمہ کر دیا۔

اعلان کیا گیا کہ اب جب کہ ون یونٹ کا خاتمہ ہو گیا ہے، منافرت کی مصنوعی دیواریں قائم رہنے کے لئے کوئی منطقی جواز نہیں رہتا۔ کانفرنس میں حیدر آباد کے سانحہ پر افسوس کیا گیا اور طالب علموں سے اپیل کی گئی کہ دوسری ترقی پسند طاقتوں کے ساتھ مل کر اپنے اپنے علاقے میں عوام کو یہ شعور بخشیں کہ اصل دشمن یعنی سامراج بالخصوص امریکی سامراج، اجارہ دار سرمایہ داری، جاگیر داری اور ان کی آلہ کار نوکر شاہی کے خلاف متحدہ محاذ وقت کی اہم ضرورت ہے، جس کے لئے پورے ملک کے محنت کش عوام ایک وحدت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تمام محب وطن اور ترقی پسند سیاسی جماعتوں اور عناصر سے اپیل کی گئی کہ وہ جمہوریت کی مخالفت قوتوں کے خلاف صف آرا ہو جائیں تاکہ قومی جمہوری انقلاب کی تکمیل کے لئے جدو جہد کی جاسکے۔ جس کے تحت بیرونی سرمایہ ضبط کیا جائے، بڑے

بڑے بنکوں اور انشورنس کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لے لیا جائے، صنعت میں قومی شعبہ کی توسیع کی جائے۔ بھاری صنعت لگائی جائے، بیرونی تجارت کو ریاستی کنٹرول میں لے لیا جائے، جاگیرداری نظام ختم کیا جائے، زمین کی حدِ ملکیت مقرر کی جائے، عوامی جمہوری حقوق بحال کئے جائیں، تعلیم دسویں جماعت تک مفت کی جائے اور معاشرتی اور ثقافتی پسماندگیوں، نوآبادیاتی باقیات کو ختم کیا جائے۔ سامراج دشمن، آزاد، غیر جانبدار خارجہ پالیسی اختیار کی جائے اور پڑوسی ممالک سے تنازعات پر امن گفت وشنید کے ذریعے طے کئے جائیں۔

تمام محب وطن، ترقی پسند طالب علموں کی تنظیموں سے اپیل کی گئی کہ وہ مندرجہ بالا مقاصد اور طلباء کے مسائل کے حقیقت پسندانہ سائنسی حل کے لئے متحد ہو کر جدو جہد کریں۔ پیج سُو نے کہا کہ پنجاب سٹوڈنٹس یونین اپنے آپ کو ان مقاصد کے حصول کی واحد اجارہ دار نہیں سمجھتی،'' طالب علموں سے اپیل کی گئی کہ اپنے اتحاد سے محب وطن، ترقی پسند سیاسی جماعتوں کو مجبور کریں کہ وہ ملک کے معاشی اور ثقافتی حل کے لئے مشترکہ طور پر جدو جہد کریں۔

ان تمام سیاسی اور مفاد پرست عناصر کی مذمت کی گئی جو نظریہ پاکستان کے تحفظ کے حسین پردوں کی آڑ میں مذہبی جنون پھیلا رہے ہیں۔ اور اپنے مفادات کے لئے ملک میں انتشار پیدا کر رہے ہیں۔

اس امر کا اظہار کیا گیا کہ تعلیم کے موجودہ مسائل نتیجہ ہیں اس نوآبادیاتی نظام کے نافذ کردہ تعلیمی نظام کا جسے ارباب حکومت نے معمولی تبدیلیوں کے ساتھ جوں کا توں برقرار رکھا ہے۔ مطالبہ کیا گیا کہ ملک کی معاشرتی، ثقافتی اور معاشی پسماندگیوں کو دور کرنے کے لئے نیا نظام تعلیم وضع کیا جائے جو مذہبی، نسلی، علاقائی اور صنفی تعصبات سے آزاد ہو، جو سائنسی طرز فکر پر استوار ہو اور سائنسی طرز فکر کو فروغ دے۔ جس کا مقصد سامراجی اثرات سے آزاد، خودمختار، جمہوری، غیر جانبدار اور خوش حال پاکستان کا قیام ہو، اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے طلبہ کی غالب اکثریت اس طرز فکر کی

حامی ہے اور یہ کہ نظام تعلیم میں تبدیلی کے لئے معاشی ڈھانچہ میں تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔

مطالبہ کیا گیا کہ قومی منصوبہ بندی میں تعلیم کو ترجیحی درجہ دیا جائے۔ طلبہ اور اساتذہ کو تعلیمی منصوبہ بندی میں موثر نمائندگی دی جائے، سنڈیکیٹوں اور تعلیمی اداروں کے انتظامی شعبوں میں طلبہ اور اساتذہ کو موثر نمائندگی دی جائے۔ اس امر کا اظہار کیا گیا کہ تعلیمی نظام میں تبدیلیاں لانے کے لئے ضروری ہے کہ تعلیمی نظام میں سیاسی اقتدار حاصل کیا جائے۔

مطالبہ کیا گیا کہ اساتذہ کا سماجی مقام بلند کرنے کے لئے ان کی تنظیموں کے مطالبے منظور کئے جائیں اور ان کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے۔

تعلیم کو فنی رنگ دیا جائے، سائنسی تعلیم عام کی جائے اور اس کی خاطر اعلیٰ تعلیمی ادارے پھیلا کر سب علاقوں میں بنائے جائیں۔ بلوچستان، بہاولپور اور دوسرے علاقوں میں یونیورسٹیاں اور اعلیٰ سائنسی اور غیر سائنسی تعلیمی ادارے قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

انگریزی کی جگہ اردو اور بنگلہ رائج کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ مطالبہ کیا گیا کہ پنجابی کو پنجاب میں ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے تاکہ تعلیم میں جمہوری ماحول قائم ہو سکے اور تعلیم آسانی کے ساتھ دی جا سکے۔ پنجاب کے نشرواشاعت کے اداروں میں پنجابی کے لئے وقت کا بیشتر حصہ وقف کر دیا جائے۔ پنجاب یونیورسٹی میں پنجابی کا شعبہ از سر نو کھولا جائے۔ مطالبہ کیا گیا کہ ہر تعلیم یافتہ فرد کے لئے روزگار کی ضمانت دی جائے۔

جام ساقی کانفرنس کی دستاویزات کی تیاری میں پیش پیش رہے تھے۔ کانفرنس کے دوران انہوں نے کئی موقعوں پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ اب وہ طلباء سیاست کو پیچھے چھوڑ چکے ہیں لیکن یہ کانفرنس ان کے لئے ہمیشہ یادگار رہے گی۔

''میں نے پنجاب کا ترقی پسند اور انسان دوست چہرہ دیکھا ہے، یہ روشن چہرہ مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔'' جام ساقی نے پنجاب سٹوڈنٹس یونین کے منظور کردہ عہدنامہ کی خاص طور پر تعریف کی۔ اسے سندھ این ایس ایف سمیت بلوچ اور پشتون تنظیموں کے نمائندوں نے بھی اصولی طور پر تسلیم کیا۔

مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن 1971ء

1970ء کے انتخابات کے بعد 1971ء کے بحران کے دوران سیف خالد اور نواز بٹ مغربی پاکستان کی سنٹرل کمیٹی کے رکن رہے۔ کاروبار سے سیف کے مالی حالات بہت بہتر ہو گئے لیکن انہیں پیسے بنانے یا جمع کرنے کا شوق نہیں تھا۔ نواز بٹ ایک مرتبہ سیف کو ملنے لائلپور گئے تو دوستوں نے انہیں مشورہ دیا کہ پیپلز کالونی بن رہی ہے وہاں پلاٹ لے لیں تو سیف بولے ''یار! وکیلاں والی گلی چھوڑ کر کہاں جاؤں'' چنانچہ انہوں نے وہاں پلاٹ نہیں لیا۔

مشرقی پاکستان میں 1971ء کا خون آشام فوجی ایکشن اب تاریخ کا حصہ ہے۔ کمیونسٹ پارٹی اور نیپ کا مؤقف واضح تھا۔ پارلیمانی جمہوریت کے تناظر میں شیخ مجیب الرحمان کا پورے ملک میں حکومت بنانا جائز حق تھا۔ نیپ اگرچہ خلافِ قانون جماعت قرار دی جا چکی تھی لیکن وہ اس اصولی مؤقف سے پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ میں ان دنوں پنجاب نیپ کی مجلس عاملہ میں تھا لیکن میں ادبی محاذ پر سرگرم تھا۔

سدا جیوے بنگلہ دیش

جب میں نے مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن کے خلاف پنجابی نظم، ''سدا جیوے بنگلہ دیش'' لکھی تو سیف خالد ان دنوں لاہور آئے ہوئے تھے۔ اب ان کی صحت بہتر تھی۔ میں نے انہیں نظم سنائی تو بڑے خوش ہوئے اور مجھے مشورہ دیا کہ میں اس کا اردو ترجمہ کر کے کہیں چھپوا دوں۔ ان دنوں کراچی سے ایم آر حسان ہفت روزہ ''عوامی آواز'' نکال رہے تھے۔ جو پارٹی کا ترجمان تھا۔ شمیم اشرف ملک اس سے رابطے میں تھے اور میری ایک پنجابی نظم اردو ترجمے کے ساتھ شائع کروا چکے تھے۔ جب میں نے اپنی نئی نظم باجی نسیم کو سنائی تو وہ فوراً مجھے کمرے میں شمیم صاحب کے پاس لے گئیں۔ وہاں طے ہوا کہ میں فوراً اس کا اردو ترجمہ کر دوں اور اس کو آج ہی ''عوامی آواز'' میں چھپنے کے لئے بھیج

دیا جائے۔ نظم چھپی اور کچھ ہی روز میں میری گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے۔ میں نے لاہور کے سول لائنز تھانہ میں گرفتاری دے دی۔ اگلے روز مجھے سمری ملٹری کورٹ میں پیش کیا گیا۔ فوجی عدالت نے مجھے کیمپ جیل بھیج دیا۔ کچھ عرصہ بعد دو ہزار روپے جرمانہ کی سزا سنا کر کوٹ لکھپت جیل منتقل کر دیا۔ کہانی کو مختصر کرتے ہوئے میں جیل کے ساتھیوں، حبیب جالب، عبداللہ ملک اور پنجاب سٹوڈنٹس یونین (پنجسو) کے کارکنوں حافظ محمود، آفتاب شاہ، محسن رضا، راحت بابر، باسط میر، ارسلان میر، عزیز، محمد باقر، منیب انور اور آصف شاہکار کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں لاہور آرٹ پریس انارکلی کے محسن صاحب بھی شامل تھے۔ انہوں نے، فوجی ایکشن کے خلاف پنجسو کا ایک پمفلٹ شائع کیا تھا اور پنجسو کے لڑکوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جیل میں ہی کالعدم نیپ میں شمولیت اختیار کر لی۔

کمیونسٹ پارٹی اور مشرقی پاکستان

16 دسمبر 1971ء کو مشرقی پاکستان کمانڈ نے جنرل عبداللہ نیازی کی سربراہی میں بھارتی کمانڈ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ 1971ء کے تمام عرصے میں کمیونسٹ پارٹی اور نیپ کے رہنماؤں کی اکثریت جیلوں میں بند رہی تھی۔ کراچی کی سنٹرل جیل میں نواز بٹ، م، ر، حسان، تنویر شیخ اور محمود الحق عثمانی محصور تھے۔ اسی جیل میں 32 بنگالی بھی قید تھے جن کی زندگی خطرے میں تھی۔

1971ء کے اوائل میں کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کی میٹنگ مشرقی پاکستان میں منعقد ہوئی۔ ابھی شیخ مجیب نے 7 مارچ کا حکومت کے بائیکاٹ کا اعلان نہیں کیا تھا۔ میٹنگ میں شرکت کے لئے پروفیسر جمال نقوی اور سنٹرل کمیٹی کے دوسرے ارکان ڈھاکہ میں تھے۔

مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ممبران نے مغربی پاکستانی ممبران کو مخاطب کر کے کہا۔

''ہم آزاد بنگلہ دیش کی طرف جا رہے ہیں۔ ہم مزید آپ کے ساتھ نہیں چل

سکتے۔ آپ اپنا بندو بست خود کریں۔ الوداعی سلام۔" کچھ ایسی ہی بات مولانا بھاشانی 1970ء میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کسان کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہہ چکے تھے۔ پاکستان کی حکمران اشرافیہ اور اسٹیبلشمنٹ ایسے اقدامات کی طرف بڑھ رہی تھی جن سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا عمل تیز ہو سکے۔ شمیم اشرف ملک، اس صورت حال سے خوش نہیں تھے۔ غالباً فروری 1971ء میں، میں لائلپور گیا اور سیف خالد سے طویل ملاقات ہوئی۔ وہ حالات کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ بھٹو، یحییٰ گٹھ جوڑ آگے بڑھ رہا تھا۔ پنجاب پیپلز پارٹی اس عمل کی مزید تائید اور حمایت کر رہی تھی۔ سیف خالد کی پیپلز پارٹی میں کافی لوگوں سے دوستی تھی۔ انہوں نے وثوق سے بتایا کہ پاکستان اب متحد نہیں رہ سکتا۔ اپنے پیپلز پارٹی کے دوستوں کے حوالے سے انہوں نے واضح کیا کہ مشرقی پاکستان کی آزادی اب دیوار پر صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ جاگیردار ٹولہ اور اس کے فوجی اتحادی بنگلہ دیش کے قیام کا فیصلہ کر چکے ہیں تاکہ پاکستان کے مغربی حصے میں پیپلز پارٹی کے اقتدار کے لئے راستہ صاف کیا جا سکے۔ میں ان کی یہ گفتگو سن کر کانپ گیا اور لاہور واپس آ کر شمیم صاحب سے ملا۔ وہ میری باتیں سن کر اداسی سے مسکرائے اور بولے:

" 3 مارچ کو ڈھاکہ میں اسمبلی کا اجلاس ہوتا نظر نہیں آتا کیونکہ بھٹو اس کے بائیکاٹ کا اعلان کر چکا ہے۔ اگر یہ اجلاس منعقد ہو گیا تو پاکستان بچ جائے گا لیکن اجلاس کا امکان کم ہی نظر آتا ہے۔"

جلد ہی سیف خالد اور شمیم اشرف ملک کی باتیں سچ ثابت ہو گئیں۔ 28 فروری کو بھٹو نے لاہور کے جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے دو تجاویز پیش کیں آئین سازی کے لئے 120 دن کی شرط کا خاتمہ یا 3 مارچ کو ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس کا التوا۔ 29 فروری کو یحییٰ خان نے قانون ساز اسمبلی کا اجلاس غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کر دیا۔ جس پر مشرقی پاکستان کے عوام سڑکوں پر نکل آئے۔

بھٹو کا استدلال

2 مارچ کو بھٹو صاحب نے کراچی میں پریس کانفرنس کرتے ہوئے کہا کہ "قومی اسمبلی کے اجلاس کا جو التواء ضروری تھا اس پر مشرقی پاکستان عوامی لیگ نے غیر مناسب ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ ہم نے اجلاس ملتوی کرنے کا مطالبہ محض اس لئے کیا تھا کہ دونوں بڑی پارٹیوں کو نئے سلسلہء مذاکرات کا موقع مل سکے۔"

واقعات کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔ شیخ مجیب نے 7 مارچ کو ایک جلسہ عام میں خطاب کیا جس کے بعد مشرقی پاکستان کے عوام نے منظم انداز میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ ایسا لگتا تھا کہ پاکستان کو توڑنے کے عمل کا آغاز ہو گیا ہے۔ مغربی پاکستان کا جاگیردار ٹولہ کھل کر انتخابی نتائج کو مسترد کرنے کا مطالبہ کرنے لگا۔ کیونکہ شیخ مجیب کے وزیر اعظم بننے کی صورت میں قومی اسمبلی سے جاگیرداری نظام کا خاتمہ کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

میں اب روزانہ شمیم صاحب کے گھر جاتا وہاں ایک روز سیف خالد آئے ہوئے تھے بعد میں میں سیف کی رہائش گاہ پر ان سے ملنے گیا۔ وہ بے حد سنجیدہ نظر آئے۔ ان کا خیال تھا کہ یحییٰ خان نے مجیب کو مذاکرات کی دعوت دی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آخری ڈرامے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ یحییٰ۔ مجیب۔ بھٹو مذاکرات کا ڈرامہ۔ غالباً مذاکرات کی آڑ میں مشرقی پاکستان کے عوام پر حملہ کرنے کی مہلت حاصل کی جائے گی۔"

ولی خان کی گواہی

سیف خالد کی بات حرف بحرف درست نکلی۔ اسی اثنا میں عوامی پریس کے احاطے میں امین مغل نے ایک ہنگامی پریس کانفرنس منعقد کی اور نیپ کی طرف سے اسمبلی کا فوری اجلاس بلانے، اقتدار فوری طور پر منتخب نمائندوں کو سونپنے، مارشل لاء کے خاتمے اور فوج کے بیرکوں میں واپس جانے کا مطالبہ کیا۔ میں اس پریس کانفرنس میں موجود تھا اور پورے

جوش میں تھا۔ مجیب نے مذاکرات کی دعوت قبول کر لی۔ 15 مارچ کو صدر یحییٰ ڈھاکہ پہنچ گئے۔ بعد ازاں بھٹو بھی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ ڈھاکہ پہنچے۔ نیشنل عوامی پارٹی اور جمیعت علمائے السلام کے رہنما بھی ڈھاکہ پہنچ گئے۔ لیکن متحدہ پاکستان کو زخم لگایا جا چکا تھا۔ جس سے اس کا بچ نکلنا محال تھا۔ 25 مارچ کو مذاکرات کی ناکامی کے بعد ایک سنگین فوجی ایکشن کا آغاز ہو گیا۔ ولی خان نے حمود الرحمان کمیشن کے روبرو اپنے بیان میں ایک اہم انکشاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں 13 مارچ کو ڈھاکہ پہنچ گیا تھا۔ 14 مارچ کو میں شیخ مجیب سے ملنے گیا۔۔ میں نے پوچھا آپ دو پاکستانوں پر یقین رکھتے ہیں یا ایک پاکستان پر؟ ان کا جواب تھا میں مسلم لیگی ہوں۔ انہوں نے مجھے اشارۃً کہا، تم نے کسی حد تک تشکیل پاکستان کی مخالفت کی تھی اور مجھ سے آ کر پوچھ رہے ہو کہ میں اس پر یقین رکھتا ہوں یا نہیں؟ تم پاکستان کے محافظ بن بیٹھے ہو؟ میں اسے تباہ کر رہا ہوں اور تم اسے بچا رہے ہو؟"

بزنجو صاحب کی گواہی

اسی طرح کی بات نیپ کے ایک اور رہنما غوث بخش بزنجو نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھی ہے وہ بھی ولی خان کے ساتھ ڈھاکہ میں تھے۔

" 14 مارچ 1971ء کو مقررہ وقت پر ولی خان اور میں شیخ مجیب کے گھر پہنچ گئے۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی اور محبت کے ساتھ ہمیں خوش آمدید کہا۔ بیٹھتے ہی ہم نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا اور شیخ مجیب سے کہا۔

"ہمیں توقع ہے کہ آپ صاف گوئی سے ہمیں اپنے منصوبوں یا لائحہ عمل کے بارے میں بتا دیں گے کیوں کہ ہم مغربی پاکستان کے ان لوگوں میں سے ہیں جو مضبوطی سے آپ کے سیاسی مؤقف کی حمایت کرتے ہیں۔ آپ انتخابات میں کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ اور اقتدار آپ کو منتقل ہونا چاہئے۔ اگر آپ یک طرفہ اعلان آزادی (Unilateral Declaration of Independence) کرنے کا انتخاب کرتے

ہیں تو آپ ان شدید مسائل کا تصور کر سکتے ہیں کہ جن کا سامنا ہمیں کرنا پڑے گا۔

یہ سن کر شیخ مجیب بے حد جذباتی ہو گئے۔ یہ پوچھتے ہوئے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔ کہ ''کون کس کو پاکستان توڑنے کا کہہ رہا ہے؟ آپ جو کانگریس سے منسلک تھے (آزادی سے قبل ہمارے انڈین نیشنل کانگریس سے تعلق کا حوالہ دیتے ہوئے) مجھے کہہ رہے ہیں، جو ایک پکا مسلم لیگی تھا اور جس نے پاکستان کے قیام کے لئے قربانیاں دی تھیں؟ کیسی ذو معنی بات ہے۔!

ولی خان نے اپنی مخصوص حاضر جوابی کے ساتھ مداخلت کی اور شیخ مجیب کو یاد دلایا۔

''تب ہم آپ سے ہندوستان کو تقسیم نہ کرنے اور پاکستان کی تخلیق نہ کرنے کی درخواست کر رہے تھے لیکن آپ نے کہا تھا کہ جب تک پاکستان قائم نہ ہو جائے، آپ آرام سے نہ بیٹھیں گے اور آپ نے اسے واقعی کر کے دکھایا۔ اب جڑے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ ہم آپ سے منت کر رہے ہیں کہ برائے مہربانی پاکستان کو مت توڑیں۔ لیکن آپ کا کہنا ہے کہ آپ پاکستان کو توڑیں گے۔ آپ ماضی اور حال کے مسلم لیگی ایک خاص قسم کی نوع ہیں۔''

بالآخر ہم اصل معاملے پر آ گئے۔ ہم نے شیخ صاحب کو بتایا کہ صورت حال جیسا کہ وہ آگاہ تھے، بے حد نازک تھی۔ اگر وہ پس و پیش کرتے رہتے یا ڈانواں ڈول رہتے تو پاکستان یقیناً تقسیم ہو جاتا۔ ہم نے انہیں اس نکتے پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ انہیں یحییٰ خان سے ضرور ملاقات کرنی چاہئے۔ اور خود کو اقتدار کی منتقلی یقینی بنانے کے لئے کوئی راہ یا حل نکالنا چاہیے کہ ان کی جامع انتخابی فتح کے باعث ان کا اور ان کی پارٹی کا جائز حق تھا۔ قیادت میں موجود افراد اس بحران سے نمٹنے کی صلاحیت سے بالکل محروم تھے۔

شیخ صاحب نے جواب دیا۔''میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ وہ (یحییٰ اینڈ کمپنی) مجھے اقتدار کبھی منتقل نہ کریں گے، چاہے اس کا مطلب پاکستان کی تقسیم ہی کیوں نہ ہو۔ پنجاب مجھے اقتدار میں آنے کی اجازت نہیں دے گا۔

ہم دیکھ سکتے تھے کہ شیخ صاحب شدید ذہنی کرب کی حالت میں تھے۔ جب انہوں نے یہ کہا تو ان کے لہجے میں واضح افسردگی تھی۔ ''میں کوشش کروں گا لیکن ایک شرط پر، جب تک بات چیت جاری رہتی ہے آپ دونوں ڈھاکہ میں موجود رہیں گے۔ ایک اور بات۔۔ اب جب آپ میرے گھر سے رخصت ہوں گے تو میں آپ کے ساتھ باہر آؤں گا لیکن عوام کے سامنے یہ اعلان نہیں کروں گا کہ میں یحییٰ سے ملنے والا ہوں۔

جب وہ ہمارے ساتھ صحن میں آئے تو مقامی اور غیر ملکی نمائندوں کا ایک ہجوم منتظر تھا اور ہزاروں لوگ ''جئے بنگلہ'' کے آسمان کو چھوتے نعرے بلند کر رہے تھے۔ منظر کا جائزہ لینے کے بعد شیخ صاحب نے منتظر صحافیوں کے سامنے اعلان کیا کہ وہ یحییٰ سے ملاقات کریں گے۔''

بعد کے واقعات ہماری بدقسمت تاریخ ہیں۔ آخر کار 16 دسمبر 1971ء کے روز پاکستان دولخت ہو گیا۔ تب حبیب جالب، عبداللہ ملک، عبدالرؤف ملک پنجاب سٹوڈنٹس یونین کے رہنما اور میں لاہور کی جیل میں تھے۔ سب کو ہماری فوری رہائی کی امید تھی چند روز میں میرے علاوہ سب رہا ہو گئے۔ رہائی کی خبر سنتے ہی سیف خالد لاہور پہنچ گئے۔ جیل حکام نے مجھے بتایا کہ جب تک شیخ مجیب اور ڈاکٹر کمال حسین کی رہائی کا فیصلہ نہیں ہوتا، میں جیل میں ہی رہوں گا۔ سیف خالد اور باجی نسیم اگلے روز مجھے جیل ملنے آئیں۔ باجی نسیم میری رہائی نہ ہونے پر خاصی جذباتی ہو رہی تھیں۔ لیکن سیف خالد مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے چند سو روپے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''شاید مزید کچھ روز آپ کو جیل میں رکنا پڑے۔ یہ پیسے کام آئیں گے۔ آپ کی سزا ختم ہو چکی ہے۔ اگلے ماہ آپ باہر ہمارے ساتھ ہوں گے۔''

جیل میں ہی مجھے پتہ چلا کہ شیخ مجیب کو میانوالی جیل سے رہا کر کے سہالہ ریسٹ ہاؤس میں رکھا گیا ہے۔ ان سے بھٹو صاحب ملاقات کر کے بنگلہ دیش روانہ کر دیں گے۔ یہی ہوا۔ 3 جنوری کو شیخ مجیب کو لندن کے راستے بنگلہ دیش روانہ کر دیا گیا۔ اس کے دو تین روز بعد مجھے بھی رہائی نصیب ہو گئی۔

سیف خالد ماسکو میں 1971ء

شہباز اقبال کے لفظوں میں: چاچا سیف نے میرا داخلہ سوویٹ یونین میں کروا دیا اور میں 70ء میں لومبا یونیورسٹی میں پڑھنے لگا۔ اس زمانے میں مجھے پاکستان کی آزادی کے بارے میں ایک مضمون لکھنا تھا۔ میں نے انہی دنوں رجنی پام دت کی کتاب ''ہندوستان کا استحصال'' پڑھی تھی اور میں نے اسی کے زیر اثر ایک زوردار مضمون لکھ مارا جسے یونیورسٹی اساتذہ میں بڑی سنجیدگی سے لیا گیا۔

71ء میں جون یا جولائی کا مہینہ تھا جب چچا سیف ماسکو آئے اور یوکرائن ہوٹل میں ٹھہرے۔ وہاں ان سے ملنے روسی کمیونسٹ پارٹی کے لوگ آیا کرتے تھے۔ اور سیاسی مسائل پر بہت بحث و مباحثہ رہتا۔ بنگال میں عوامی تحریک کی مزاحمت کو کچلا جا رہا تھا اور انہیں اقتدار منتقل کرنا ناممکنات میں تھا۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد کہ کسی کے سوال کے جواب میں چاچا سیف نے جب یہ کہا کہ ان کے خیال میں بنگال ایک علیحدہ حقیقت ہے اور پاکستان کے ساتھ اس کا کوئی مستقبل نہیں ہے تو کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ ان سے سوال کیا گیا کہ وہ اس بارے میں اتنی حتمی بات اتنے وثوق کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ اس موقع پر چاچا سیف نے بہت پُرمغز Eloquent اور Articulate تجزیہ پیش کیا جو یہ ظاہر کرتا تھا کہ اس موضوع پر ان کا مطالعہ کتنا وسیع اور گہرا تھا۔ بنگال کی تاریخ، معیشت، زبان، مغربی پاکستان کے ہاتھوں بنگال کے استحصال اور پاکستان میں بنگال کے مستقبل پر ان کا تجزیہ اس قدر جاندار تھا کہ ان کے پاس آنے والے روسی ملاقاتیوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور پاکستان اور ہندستان پر تحقیق کرنے والے روسی ماہرین ان سے سیر حاصل مباحث کے لئے ان کے پاس آنے لگے۔

ماسکو سے سیف کو کرغستان کے شہر فرونزے (بشکک) میں ''سوویت زراعت میں وسطی ایشیاء کا تجربہ'' نامی کانفرنس میں مدعو کیا گیا۔ یہ دورہ اُن کے لیے بہت متاثر کن تھا۔ یہاں انھوں نے سوویت زراعت میں انقلابی تبدیلیوں کے ذریعے پیداوار بڑھانے اور

جدید مشینری کے استعمال سے آگاہی لی۔

اسی زمانے میں ماسکو میں میری ملاقاتیں فیض صاحب اور سجاد ظہیر سے بھی ہوئیں۔ اسی طرح ہندوستان کمیونسٹ رہنما ایس کے ڈانگے ،سے بھی ہوتیں۔ بھٹو نے بھی اسی زمانے میں روس کا دورہ کیا۔ ہم اس کے استقبال کے لئے ائیر پورٹ بھی گئے۔ پاکستانی طالب علم کی ان دنوں حکومت پاکستان کے نزدیک کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی۔ حفیظ پیرزادہ نے ہمارے ساتھ ایک ملاقات میں ہماری قانونی حیثیت تسلیم کرنے کا وعدہ کیا اور پاکستانی سفارت خانے کے ساتھ ہمارے تعلقات بہتر ہو گئے اور ہم یوم پاکستان کی تقاریب میں پاکستانی سفیر کو بھی مدعو کرنے لگے۔

نیا پاکستان

بھٹو صاحب نے 20دسمبر 1971ء کو پاکستان کے پہلے سویلین مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر اور صدر پاکستان کے طور پر اقتدار سنبھال لیا۔ انہوں نے باقی ماندہ پاکستان کو''نیا پاکستان'' قرار دیا اور کہا:

''ہمیں ٹکڑے جمع کرنے ہیں۔ بہت چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لیکن ہم نیا پاکستان بنائیں گے ایک خوشحال، ترقی پسند، استحصال سے آزاد پاکستان۔''

ان نیک اور خوش آئندہ جذبات کے باوجود گو بھٹو صاحب کو من چاہا اقتدار مل چکا تھا اور اگر چہ وہ نئے پاکستان کے مرکزی قائد کا اختیار حاصل کر چکے تھے ایسا لگتا ہے کہ وہ پورے پاکستان کے بلا شرکتِ غیرے مالک بننا چاہتے تھے۔ صوبہ سرحد (موجودہ پختونخوا) اور بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمیعت علمائے اسلام کا غلبہ تھا۔ پھر بھی وہ انہیں صوبوں کا اختیار نہیں دینا چاہتے تھے۔

سیف خالد اور نیپ کے دیگر قائدین نے سب سے پہلا مطالبہ مارشل لاء کے خاتمے اور جمہوریت کی مکمل بحالی کا کیا۔

میری رہائی کے بعد سیف خالد ملے تو مجھے لائلپور آنے کی دعوت دی اور پھر ہنستے

ہوئے کہنے لگے۔

''نیا پاکستان وجود میں آیا ہے تو ایک نیا عہدہ بھی ہونا چاہئے تھا۔ ہم سویلین چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے عہدے پر کیوں اعتراض کر رہے ہیں؟''

یہ معنی خیز تبصرہ سیف خالد ہی کر سکتے تھے۔ نئے پاکستان کو کئی چیلنج درپیش تھے۔ مثلاً چاروں صوبوں کے مساوی حقوق، ایک جمہوری آئین، نئے گورنروں کا تقرر، سماجی، سیاسی اور اقتصادی اصلاحات، خارجہ تعلقات، صوبوں اور مرکز کے درمیان اختیارات کی تقسیم وغیرہ۔

بھٹو صاحب نے سب سے پہلے نیشنل عوامی پارٹی سے پابندی اٹھانے کا اعلان کیا اور نیپ کی قیادت سے مذاکرات کا آغاز ہو گیا۔ 6مارچ 1972ء کو سہ فریقی معاہدے پر دستخط ہو گئے۔

سہ فریقی معاہدہ

بی ایم کٹی کا کہنا ہے کہ بھٹو صاحب ولی خان کے ساتھ مذاکرات کو مسلسل التواء میں ڈال رہے تھے۔ میر غوث بخش بزنجو کے مطابق بھٹو نے ولی خان کے ساتھ اپنے مذاکرات کو ہفتوں لٹکائے رکھا۔ جس کا کوئی مثبت نتیجہ نہ نکل سکا اور ولی خان نے تنگ آ کر یہ کام بزنجو صاحب کے حوالے کر دیا۔ اس نئے اقدام کے نتیجے میں 6مارچ 1972ء کو پی پی پی۔ نیپ، جے یو آئی کے مابین سہ فریقی معاہدہ طے پا گیا۔ اور یوں نیپ کے گورنرز اور حکومتیں بلوچستان اور صوبہ سرحد میں تشکیل پا گئیں۔ شاہِ ایران اور امریکہ ان حکومتوں کے قیام پر خوش نہیں تھے۔ اس لئے پی پی پی اور نیپ کے درمیان عدم اعتماد کو بڑھاوا دینے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ ''چنانچہ جام لسبیلہ اور نبی بخش زہری کی رہنمائی میں قیوم خان کی وزارتِ داخلہ اور بلوچستان کے سیاسی عوامل حکومت کی مخالف سمت اختیار کرنے لگے۔ ان سازشوں کا عملی مظاہرہ مئی 1972ء میں ایران کی شہزادی اشرف پہلوی کے دورہ کوئٹہ میں قیوم خان کے پرائیویٹ لشکر کی کارکردگی اور دیگر مثلاً ششک تنازعے اور

لسبیلہ بغاوت کی صورت میں نظر آیا اور پھر آخر کار یہ نیپ حکومت کے خاتمے اور چار سالہ (1977-1973) ملٹری ایکشن پر انجام پذیر ہوا۔

سیف خالد نے سہ فریقی معاہدے کی حمایت نہیں کی اور کمیونسٹ پارٹی بھی اس کے حق میں نہیں تھی۔ نواز بٹ کے بقول ''اختلافات بھٹو سے مذاکرات پر ہوئے۔ بھٹوصاحب چاہتے تھے کہ نیپ ملاؤں (جمیعت) کو الگ کرے اور بلوچستان میں پیپلز پارٹی کے ساتھ حکومت بنائے۔ ولی خان نے بھی بعد میں مخالفت کی۔

بلوچستان صوبائی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کے صرف دو ارکان تھے جب کہ نیپ کے آٹھ ارکان تھے۔ اسی طرح کی صورتِ حال صوبہ سرحد میں بھی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی میں پروفیسر جمال نقوی اس سخت مؤقف کے حامی تھے کہ پیپلز پارٹی سے کوئی بات نہیں ہوسکتی جبکہ نازش امروہوی کا کہنا تھا کہ پیپلز پارٹی سے لڑائی نہیں ہونی چاہیے۔ باجی نسیم شمیم کے مطابق سیف خالد نیپ میں تھے وہ اس معاہدے کی حمایت کرتے تھے لیکن کمیونسٹ پارٹی کے تین رکنی فریکشن (نازش امروہوی، جمال نقوی اور شمیم اشرف ملک) میں شمیم اشرف ملک اور نازش کی رائے یکساں تھی۔ شمیم صاحب کا کہنا تھا کہ حالات ایسے نہیں ہیں کہ پیپلز پارٹی سے لڑ اجائے لیکن بعد کے حالات سے ثابت ہوا کہ بھٹو بلا شرکتِ غیرے چاروں صوبوں میں اقتدار کے متمنی تھے۔ اور نیپ یا جمیعت کو اقتدار میں شریک کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھے۔

نام نہاد لندن پلان

پیپلز پارٹی کا رویہ جو بھی رہا ہو، اب یہ بات واضح ہو چکی ہے اور سیف خالد اس بات سے پوری طرح متفق تھے کہ نیپ اور پیپلز پارٹی کی چپقلش پاکستان میں جمہوریت کی تباہی کا نقطہء آغاز ثابت ہوئی۔ اسی اثناء میں لندن پلان اور عراقی سفارت خانے میں روسی ہتھیاروں کی برآمد کے شوشے چھوڑے گے۔ لندن پلان کی خبر کی اصل حقیقت واضح کرتے ہوئے غوث بخش بزنجو نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھا کہ:

''پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں نیپ رہنماؤں اور دیگر کی جانب سے لندن میں پاکستان کو توڑنے کی نام نہاد سازش تیار کرنے سے متعلق بلند و باگ پروپیگنڈا شروع کر دیا گیا۔ یہ مہم 5 سے 13 ستمبر 1972ء کو اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ درحقیت وزیر اعلیٰ سردار عطا اللہ اور احمد نواز بگٹی ان دنوں اپنے طبی معائنے کے لئے لندن میں تھے اور ان کے چند دوسرے اپوزیشن رہنماؤں کے ساتھ غیر رسمی سماجی روابط تھے جو اتفاق سے ان دنوں وہاں موجود تھے۔ خان ولی خان بھی اپنی آنکھ کے علاج کے سلسلے میں لندن میں تھے۔ ان کی لندن میں موجودگی کو اسلام آباد میں سازشی نظریہ سازوں نے لندن پلان کی کہانی بننے کے لئے استعمال کیا! جب ملک اور بیرون ملک مختلف حلقوں کی جانب سے اس پروپیگنڈے کی صداقت پر سوال اٹھنے شروع ہوئے تو تب ہی صدر بھٹو نے یہ ضروری سمجھا کہ لندن پلان کی تشہیر کو ختم کرنے کا حکم دیا جائے۔''

1972ء کا پورا سال نیپ۔ پیپلز پارٹی کے تعلقات پر بحث مباحثہ میں گزرا۔ جتنے منہ اتنی باتیں لیکن غوث بخش بزنجو، بی ایم کٹی، نواز بٹ، امین مغل اور تنویر شیخ کے بیانات کی اس لئے بھی اہمیت ہے کہ یہ سب سیف خالد سے براہِ راست رابطے میں تھے اور اس دور کے حالات و واقعات سے با خبر تھے۔ ساتھ ہی ان بیانات کو بہت احتیاط سے دیکھنے کی ضرورت بھی ہے۔ کیونکہ 73-1972ء کے واقعات میں سوویت یونین کے دباؤ کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے جسے جمال نقوی نے شدت سے پھیلانے کی کوشش کی جس سے پوری صورت حال ہی کنفیوز لگتی ہے۔

کمیونسٹ پارٹی کا کردار

نواز بٹ 1972ء میں کراچی میں پارٹی کے سیکرٹری تھے۔ جمال نقوی نے انہیں

کمیونسٹ پارٹی کا پبلک ترجمان نامزد کر دیا تھا۔ جس کا نواز بٹ کو علم نہیں تھا۔ انہی دنوں بزنجو نے پیپلز پارٹی کے ساتھ اتحادی حکومت بنانے کی تجویز دی تھی۔ اس سلسلے میں نواز بٹ نے بلوچستان خط لکھا۔ امیر الملک مینگل پارٹی کی بلوچستان کمیٹی کے سیکرٹری جنرل تھے۔ انہوں نے کمیٹی کا اجلاس بلا کر بزنجو کی پیپلز پارٹی سے اتحادی حکومت بنانے کے خلاف قرار داد پیش کر دی۔ اس کمیٹی میں عطا اللہ مینگل بھی شامل تھے جو بھٹو کے ساتھ کسی بھی طرح کا اتحاد بنانے کے خلاف تھے۔ بقول نواز بٹ وہ بھٹو کو گالیاں تک دینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اس معاملے پر خیر بخش مری بھی ان کے ہم نوا تھے۔ غوث بخش بزنجو نے امیر الملک مینگل سے کہا کہ انہیں تو گھر میں ہی گالی پڑ گئی۔ میرا بنایا ہوا لڑکا میری ہی رائے کی مخالفت کر رہا ہے۔ پشاور میں بزنجو نے کہا ''تمہیں ذرا سمجھ نہیں، ولی خان تمہیں کدھر لے جا رہا ہے۔ آپ ولی خان کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ اجلاس میں نواز بٹ بھی موجود تھے۔ وہ بتاتے ہیں:۔

''میں نے کہا اب کیا کریں قرار داد تو پاس ہو گئی۔
اس پر میر بزنجو نے کہا کہ ایسا کرو، مجھے نیپ کا سیکرٹری جنرل بنا دو۔
میں نے کہا آپ گورنر ہیں
میر بزنجو نے کہا کہ مجھے نیپ کا سیکرٹری جنرل بنا دو، میں گورنری سے کل ہی استعفیٰ دیتا ہوں۔

کمیونسٹوں نے طے کیا کہ اجمل خٹک کو سیکرٹری جنرل بنائیں، میں اس میں شامل نہیں تھا۔ میں نے بزنجو کو بتا دیا کہ اجمل خٹک کو سیکرٹری جنرل بنانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ میں نے میر بزنجو کو ٹال دیا اور اجمل سیکرٹری جنرل ہو گئے۔''

فوج کا پشتون دھڑا

بقول نواز بٹ ''بعد میں پتہ چلا کہ میر بزنجو جو بات کر رہے تھے وہ بہت اہم تھی۔ بات یہ تھی کہ فوج میں 71 فیصد پنجابی اور 29 فیصد پٹھان ہیں۔ مجھے ولی خان نے جب وہ

اپوزیشن لیڈر تھے اپنے کمرے میں بلا کر کہا کہ بھٹو کہاں جائے گا، بھٹو کیسے بچ کے جائے گا۔ وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ بھٹو کا تختہ الٹ دیں گے اور اقتدار لے لیں گے۔ ہو سکتا ہے کمیونسٹوں نے یہ غلط فہمی ان کے ذہن میں ڈالی ہو، مجھے نہیں پتہ ایسا تھا۔ کیونکہ میں کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے ولی خان سے رابطہ نہیں کرتا تھا ڈاکٹر اعزاز نذیر کرتے تھے

''1972ء کے بعد سیف خالد اور شمیم اشرف نے میر بزنجو کے حق میں یہ مؤقف اختیار کر لیا کہ بھٹو کی پیپلز پارٹی کے ساتھ جانا چاہئے۔ مجھے شمیم اشرف نے کہا کہ یہ پارٹی کے سیکرٹری جنرل نازش نے کہا ہے تو تم اس کے خلاف کیسے جا سکتے ہو۔''

مجھے نہیں پتہ تھا کہ نازش نے بزنجو سے کمٹمنٹ کر لی ہے میرے لئے یہ دھچکہ تھا، نازش کی صلاحیتوں کا بعد میں پتہ چلا کہ وہ مذاکرات کی بہترین صلاحیت رکھتے تھے۔ جمال نے انہیں فرنٹ میں بنا کر رکھا ہوا تھا۔ میں نے جمال نقوی سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ پارٹی نے نازش کا فیصلہ رد کر دیا ہے۔ میر بزنجو اس پر اختلاف کرتے ہوئے کمیونسٹ پارٹی سے الگ ہو گئے، گل خان بھی الگ ہو گئے۔ بلوچستان کی کمیونسٹ پارٹی بیٹھ گئی۔ جو بچے کیڈر تھا اس کو منظم کرنے اور پارٹی چلانے کے لئے عزیز اللہ سائیں کو بلوچستان بھیجا گیا۔ وہی فیصلہ ہوا کہ بھٹو کے ساتھ نہیں جانا۔'' نواز بٹ اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے مزید کہتے ہیں:

''سوویت پریشر آ چکا تھا۔ یہ 1973ء کے دور کی بات ہے۔ سوویت سنٹرل پارٹی سے ٹیلی گرام آیا کہ بھٹو کے ساتھ بلوچستان میں ہی نہیں پورے پاکستان میں اتحاد کیا جائے تاکہ ملاؤں سے جان چھڑائی جا سکے۔ یہ بات مجھے خود جمال نقوی نے بتائی۔

لاہور میں سنٹرل کمیٹی کا تین دن اجلاس ہوا، میر بزنجو پھر ذوالفقار علی بھٹو سے ملنے گئے، بھٹو اس وقت لاہور میں تھے۔

میر بزنجو نے مجھے خود بتایا کہ ذوالفقار علی بھٹو نے پیشکش کی ہے کہ مجھے نواز بٹ اور جام ساقی کو سندھ میں اور پنجاب سے سیف خالد اور امین مغل کو وزیر کے برابر مشیر لے لیتے ہیں۔ جب کہ بلوچستان اور فرنٹیئر میں ہم پیپلز پارٹی کو دو دو وزارتیں دے

دیں۔ مگر سنٹرل کمیٹی نیپ نے بھٹو کی اس پیش کش کو رد کر دیا اور حکومتیں چھوڑنے کا اعلان کر دیا۔ عطا اللہ مینگل نے بزنجو کی مخالفت اور بھٹو کے خلاف بہت کردار ادا کیا۔ نیپ کی بلوچ قیادت میں سوائے بزنجو کے تمام ولی خان کے حامی تھے۔

پشاور کنونشن 1972ء

اس سے قبل نومبر 1972ء میں پشاور میں نیپ کا قومی کنونشن ہوا تھا جس نے پشتون، بلوچ اختلافات کی بنیادیں مزید گہری کر دیں۔ بی ایم کٹی، سرکاری طور پر گورنر بزنجو کے پرسنل سیکرٹری تھے۔ وہ اس کی تفصیلی روداد کو سمیٹتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ”کوئٹہ میں حاصل کردہ تجربے کی روشنی میں پشاور نیشنل کنونشن کے ثمرات کا اندازہ ہو جانا چاہیے تھا۔ چنانچہ سنٹرل کمیٹی کی میٹنگ میں اجمل خٹک نے کمیونسٹوں اور قوم پرستوں کی ترجمانی کرتے ہوئے بزنجو پر براہِ راست اور ارباب سکندر پر بالواسطہ طور پر تنقید کرتے ہوئے ان پر اقتدار کی ہوس کا الزام لگایا۔ ولی خان اجلاس میں بزنجو پر تنقید کے دوران چپ سادھے بیٹھے رہے حالانکہ بزنجو نے آئین پر تائیدی دستخط کرنے سے پہلے ان کی لندن سے فون پر رضامندی حاصل کر لی تھی۔

بھٹو بمقابلہ نیپ

سیف خالد کا کہنا تھا کہ بھٹو کو دراصل دو صوبوں میں نیپ کی حکومتیں منظور نہیں تھیں خصوصاً بلوچستان کی حکومت انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے اسے ختم کرنے کے درپے تھے۔ کبھی وہ بلوچستان میں ششک کے تنازعے کو بنیاد بناتے کبھی لسبیلہ واقعہ کی آڑ میں بلوچستان کی حکومت پر حملہ آور ہوتے اور کبھی عراقی سفارت خانے میں روسی اسلحے کا انکشاف کرتے۔ یہ بات سیف خالد نے ان دنوں کہی جب نیپ کے بیشتر رہنما حیدر آباد سازش مقدمے کے عذاب سے گزر رہے تھے۔ بعد ازاں خود بزنجو صاحب نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں ان تینوں مسائل کا ذکر کیا۔ عراقی سفارت

خانے سے روسی اسلحے کے پکڑے جانے کی حقیقت بیان کرتے ہوئے بزنجو لکھتے ہیں:

عراقی سفارت خانے سے روسی اسلحے کی برآمدگی کا افسانہ

''جنوری 1973ء کو قومی پریس میں سیکورٹی فورسز کی جانب سے اسلام آباد میں عراقی سفارت خانے پر چھاپے اور بڑی مقدار میں روسی اسلحہ کو قبضے میں لینے کی ہیجان خیز خبریں سامنے آئیں۔ صدر بھٹو اور وفاقی حکومت میں ان کا ڈھول پیٹنے والوں نے فوری طور پر یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ ان ہتھیاروں کی منزل بلوچستان تھی لیکن انہیں اسلام آباد میں حکام نے پکڑ لیا تھا۔ تقریباً اسی دوران نواب اکبر بگٹی جو بیرون ملک مقیم تھے، وطن واپس آگئے اور انہوں نے پنجاب (جہاں انہوں نے واپسی کے بعد بلوچستان آنے کی بجائے ٹھہرنے کا انتخاب کیا تھا) سے اشتعال انگیز بیانات دینے شروع کر دیئے۔ اور دعویٰ کیا کہ وہ لندن میں نیپ رہنماؤں کی جانب سے بنائے جانے والے پاکستان مخالف منصوبوں اور بغداد سے ان کے ''خفیہ'' رابطوں وغیرہ سے واقف تھے۔ ظاہر ہے کہ انہیں اسلام آباد کی حکومتی انتظامیہ کی آشیر باد حاصل تھی۔ نیت بالکل واضح تھی یعنی اس سلسلے میں نیپ قیادت اور بلوچستان حکومت کو بدنام کرنا۔

''قبضے میں لئے گئے عراقی ہتھیاروں'' کی پہلے دارالحکومت میں عوامی نمائش لگائی گئی اور پھر خصوصی ٹرینوں میں بڑے تام جھام کے ساتھ انہیں ملک کے گوشے گوشے میں گھمایا گیا۔ نیپ قیادت اور بلوچستان حکومت کو بدنام کرنے کے لئے تیار کردہ گھٹیا ترین قسم کے پروپیگنڈے کا ایک تفصیلی اور مہنگا مظاہرہ قوم نے دیکھا۔ قومی پریس نے اسلام آباد کے گھڑے ہوئے جھوٹوں کی بنیاد پر چٹ پٹی کہانیاں بے حد شوق اور چاؤ سے شائع کیں اور پنجابی اشرافیہ کے حلقوں نے، جو خود کو بلوچستان میں پنجابی آبادکاروں کے محافظین سمجھتے تھے، قیامت کا صور پھونکنے میں کوئی وقت ضائع نہ کیا۔ کسی نے اس بات پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ نیپ، جو بلوچستان میں اقتدار میں تھی، وہ دور کہیں اسلام

آباد میں موجود عراقی سفارت خانے کے ذریعے ایک ایسا طویل اور چکر دار راستہ کیوں اختیار کرتی کہ نام نہاد روسی ہتھیار بلوچستان میں سمگل کرے جب کہ وہ چھوٹی چھوٹی بندر گاہوں والی 900 میل طویل مکران کی ساحلی پٹی رکھتی تھی۔ مزید برآں ایسے خفیہ منصوبے کو بہ حفاظت سرانجام دینے کے لئے قریبی کراچی کی بندرگاہ بھی موجود تھی۔ یہ ایک دماغ کو چکرا دینے والا گھڑا گیا جھوٹ تھا۔

''میں نے سب سے پہلے یہ کہانی لاہور ریلوے سٹیشن پر ٹرین میں سنی جہاں کچھ صحافی مجھ سے ملاقات کے لئے آئے تھے۔ میں اسلام آباد جا رہا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ نیپ قیادت اور حکومت کو بدنام کرنے کے لئے ایک اور شرارت تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ ہتھیار کسی غلط مقصد کی خاطر چھپا کر اسلام آباد لائے گئے تھے، جس سے یقینا وہ پوری طرح واقف رہے ہوں گے۔ کسی طرح راز آشکار ہو گیا اور اس بھدے مشن پر پردہ ڈالنے کا آسان ترین طریقہ یہ تھا کہ نیپ اور بلوچستان حکومت کو قربانی کے بکرے کے طور پر استعمال کیا جاتا۔''

بزنجو کی گورنری سے سبکدوشی

فروری 1973ء میں بھٹو صاحب نے بزنجو صاحب کو گورنر کے عہدے سے ہٹا دیا۔ بزنجو لکھتے ہیں:

''صوبائی اسمبلی کے اراکین کو اپنی وفاداریاں تبدیل کرنے کے لئے مجبور کرنے کی خاطر خواہ کوششیں شروع کی گئیں۔ پی پی پی کی قیادت میں جعلی حکومتی اتحاد کو رشوت اور بلیک میل نے مرتب کیا۔ پی پی پی کا اپنا ایک بھی رکن ہاؤس میں موجود نہ تھا۔ جلد ہی راتوں رات نئے سیاسی الائنس اور حکومتی اتحادوں کے ظہور کی قائم شدہ روایت کے عین مطابق جام غلام قادر خان کی سربراہی میں ایک جعلی حکومت بلوچستان میں بھرتی کر لی گئی۔ ایسے اسمبلی ممبران جنہوں نے وفاداریاں تبدیل کرنے سے انکار کر دیا تھا، انہیں جلد

ہی ہر قسم کے خوف و ہراس کا سامنا کرنا تھا۔ اپوزیشن سے تعلق رکھنے والے قومی اسمبلی کے ممبران جنہوں نے وفاقی حکومت کے غیر جمہوری اقدامات کے خلاف اپنی آواز اٹھائی تھی، انہیں اسمبلی کے فلور پر مارا پیٹا گیا اور ہال سے اٹھا کر باہر پھینک دیا گیا۔ اپوزیشن کے پارٹی رہنماؤں اور کارکنوں کو ڈرانے دھمکانے اور بے عزت کرنے کے لئے ایف ایس ایف کو بلا امتیاز استعمال کیا گیا۔ مشتعل اپوزیشن رہنماؤں کو ''ٹھنڈا'' کرنے کے لئے مسلح غنڈوں کو کھلا چھوڑ دیا گیا۔''

1973ء کے آئین کی منظوری

اگلا مرحلہ 1973ء کے آئین کی منظوری کا تھا۔ آئین میں صوبائی حقوق نہ ہونے کے معاملے پر نیپ اور کمیونسٹ پارٹی کے بعض حلقوں کی جانب سے اس کی مخالفت ہو رہی تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس مخالفت کے باوجود نیپ نے حکومتیں چھوڑنے کے بعد 1973 کے آئین کی حمایت کی۔ خیر بخش مری کے علاوہ نیپ میں سے کسی نے اختلافی نوٹ نہیں لکھا۔ پارٹی قیادت کی اکثریت 1973ء کے آئین کو منظور کرنے کی مخالف تھی۔ خصوصاً مختار باچہ اور افراسیاب خٹک آئین کی منظوری کے حق میں نہیں تھے۔ افراسیاب خٹک نے اعتراض کرتے ہوئے پارٹی کے مرکزی قائد ولی خان سے کہا کہ آپ کس طرح کے آئین پر دستخط کر رہے ہیں۔ ولی خان خود بھی متفق نہ تھے۔نواز بٹ بتاتے ہیں کہ وہ مجبوراً آئین پر دستخط کر رہے تھے۔ بعد میں افراسیاب خٹک مان گئے کیونکہ پارٹی مان گئی تھی۔ نواز بٹ مزید بتاتے ہیں کہ جہاں تک سیف خالد کا تعلق ہے، وہ ولی خان کے ساتھ تھے اس لئے کہ کمیونسٹ پارٹی ولی خان کے ساتھ تھی۔ سیف نیشنل عوامی پارٹی کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ وہ نیشنل کنونشن 1972ء میں مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ مجلس عاملہ کے کل چھتیس اراکین منتخب ہوئے۔ ان میں سیف خالد سمیت قسور گردیزی، حبیب جالب، منت اللہ، لطیف افغانی، چودھری جلیل، حبیب پاسلوی، حسن اشرف چیمہ، خیر بخش مری، عطا اللہ مینگل، غوث بخش بزنجو،

گل محمد، محمد یوسف خان، محمد خان باروزئی، حاجی سید حسن، عبدالعلی کاکڑ، خان بہادر خان، محمد افضل خان، امیر زادہ خان، ارباب سکندر خان، حاجی محمد فاضل خوشدل خان۔ شہزاد گل، محمود ہ سلیم، نواز بٹ، اعزاز نذیر، جام ساقی، رکن الدین قاسمی، قاضی عبدالخالق، عزیز اللہ شیخ، بچل تونیو، مہر حسین شاہ کے نام شامل تھے۔ اجلاس کی روداد کے مطابق ''کونسل کے دو اجلاس ہوئے۔ ایک 16 نومبر کو 5 بجے شروع اور رات 9 بجے ختم ہوا۔ یہ انتخابی اجلاس تھا۔ صدارت خان عبدالولی خان نے کی۔ اجلاس کے آغاز میں میر قلم خان وزیر، سید باقر شاہ اور رشید جاوید کی وفات پر تعزیت کی قرارداد منظور ہوئی جس کے بعد ولی خان نے ایک مفصل تقریر کی جس میں ملک کے سیاسی حالات اور پارٹی کی گزشتہ سالوں میں کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے اپنا اور اپنے ساتھی عہدیداروں کا استعفیٰ پیش کیا اور اس طرح آئندہ دو سال کے لئے نئے انتخابات کے لئے راستہ صاف کیا اس کے بعد پنجاب نیپ کے نو منتخب صدر سید قسور گردیزی نے صدارت کی کرسی سنبھالی اور انتخابات کا اعلان کیا۔ میر غوث بخش بزنجو نے آئندہ صدارت کے لئے ولی خان کا نام پیش کیا۔ بلوچستان نیپ کے صدر خیر بخش مری، سندھ نیپ کے صدر عزیز اللہ شیخ، سرحد (خیبر پختونخوا) نیپ کے صدر محمد افضل خان اور پنجاب نیپ کے صدر قسور گردیزی نے تائید کی۔ یوں ولی خان آئندہ دو سال کے لئے دوبارہ صدر منتخب ہو گئے۔ اسی طرح اجمل خٹک چاروں صوبوں کے صدور کی تجویز اور تائید سے مرکزی نیپ کے جنرل سیکرٹری منتخب ہو گئے۔

بعد ازاں نائب صدور، محمد ہاشم غلزئی (بلوچستان) سید رشید احمد (سندھ) سید محمد الیاس (خیبر پختونخوا) اور بیگم نسیم شمیم ملک (پنجاب) منتخب ہوئیں۔ جام ساقی اور امین مغل مرکزی نیپ کے جائنٹ سیکرٹری، مشتاق راج فنانس سیکرٹری، ملک زمرد حسین بھٹہ پبلسٹی سیکرٹری جبکہ سالار امین جان خان پارٹی کے سالارِ اعظم منتخب ہوئے۔

اسی اجلاس میں پنجاب بلوچستان، سندھ اور خیبر پختونخوا کے 80,80 قومی کونسلر چنے گئے۔ نیشنل کونسل کا دوسرا اجلاس ہاشم خان غلزئی کی صدارت میں ہوا۔ جس میں مختلف

قرار دادیں منظور ہوئیں۔ پہلی اور بنیادی قرار داد ''آئینی سمجھوتہ'' کے حوالے سے تھی۔ اکتیس اراکین کی تقریروں کے بعد قرار داد کو اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔ قرار داد میں کہا گیا تھا کہ اجلاس تمام پارلیمانی جماعتوں کے آئینی سمجھوتہ کے پیچھے کارفرما اس جذبہ کی تائید کرتا ہے کہ ملک کو درپیش سیاسی اور آئینی مسائل افہام و تفہیم سے حل کئے جائیں تا کہ ملک کے لئے مستقل آئین تیار رہو۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ سمجھوتہ نیشنل عوامی پارٹی کے منشور کے مطالب حقیقی جمہوریت اور صوبائی خود مختاری کے حوالے سے عوام کے تقاضوں سے بہت کم تھا۔ اجلاس وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے بارے میں، سمجھوتہ میں موجود دفعات سے مطمئن نہیں تھا کیونکہ یہ دفعات پارلیمانی جمہورت کے بنیادی اصولوں کے منافی تھیں۔ اس ضمن میں اجلاس نے کئی سفارشات بھی پیش کیں۔

اجلاس میں شہری آزادیوں، مزدوروں کے مسائل جبری ریٹائرڈ ملازمین، ڈیرہ غازی میں تشدد، نام نہاد عوامی عدالتوں، سرحد و بلوچستان کی حکومتوں، اعلیٰ ملازمتوں، ذرائع ابلاغ اور ضلع سرگودھا کے گلہ بانوں کے حوالے سے بھی قرار دادیں منظور ہوئیں۔

نیشنل کونسل کے اجلاس سے واپسی پر میری سیف خالد سے ملاقات ہوئی تو وہ بے حد پر جوش نظر آئے۔ میں اجلاس میں شریک نہیں ہوا تھا اس لئے زیادہ تفصیلات سے آگاہ نہیں تھا لیکن اجلاس میں بزنجو صاحب کے بارے میں جو جارحانہ رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ اس کے بارے میں نسیم باجی سے سن کر قدرے اداس تھا۔ میں نے دکھ کا اظہار کیا تو سیف خالد نے مجھے سمجھایا کہ کمیونسٹ پارٹی ولی خان کے ساتھ ہے۔ اس لئے جو بھی ہوا، پارٹی کی صوابدید کے مطابق ہوا۔ اس کے بعد میں شمیم اشرف ملک صاحب کے پاس گیا۔ انہوں نے بھی گول مول باتیں کیں۔ مجھے سب سے زیادہ دکھ سیف خالد کے رویے پر تھا۔ باجی نسیم بھی اس رویے پر دکھی تھیں جب 2017ء میں، میں انہیں لیڈز (یوکے) میں ملا تو کہنے لگیں:

''پارٹی نے علی الاعلان تصادم کا راستہ اختیار کیا۔ سیف خالد کو پارٹی کے اعلان پر عمل کرنا ہی تھا۔

قسور گردیزی پر شرمناک حملہ

قسور گردیزی، جو 1968ء میں نیپ (بھاشانی) کا حصہ بن گئے تھے۔ 1971ء کے بعد پھر سوویت نواز ہو گئے۔ پھر 1972ء میں پنجاب نیشنل عوامی پارٹی (ولی گروپ) کے صدر منتخب ہو گئے۔ جب کمیونسٹ پارٹی اور نیپ کی مرکزی کمیٹی نے بھٹو کے ساتھ نہ جانے کا فیصلہ کیا تو بھٹو انتقامی کارروائیوں پر اتر آئے اور نیپ کو کالعدم قرار دینے سے قبل نیپ کی قیادت کے خلاف تشدد کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کا آغاز راولپنڈی کے لیاقت باغ میں نیپ کے جلسے پر پُرتشدد حملے سے ہوا۔ پھر یہ سلسلہ بلوچستان سمیت پورے پاکستان تک دراز ہو گیا۔ اس سلسلے میں پنجاب نیپ کے صدر قسور گردیزی بھی شرمناک حملے کا نشانہ بنے۔

26اگست 1973ء کو سید قسور گردیزی نے ڈیوٹی مجسٹریٹ ملتان کی عدالت میں اس تشدد کے خلاف اپنا بیان لکھوایا۔ اس بیان کے مطابق:

''ڈیڑھ بجے رات گزشتہ شب مجھے بلایا گیا تھانہ حرم گیٹ میں ایک اے ایس آئی وہاں موجود تھا جس کا نام بعد میں معلوم ہوا۔ اے ایس آئی نے مجھ سے پوچھا 'آپ لوگوں کو جرأت کیسے ہوئی کہ آپ لوگ سیلاب زدگان اور بھٹو صاحب کے خلاف بات کریں'۔ اتنا کہتے ہی ایک آدمی نے جس کے داڑھی تھی، مجھے دبوچ لیا اور خلاف توقع میرا ازار بند کھول کر شلوار کو ٹانگوں کے نیچے سے کھینچ لیا۔ میں انہیں کہتا رہا کہ یہ غیر قانونی، غیر اخلاقی اور غیر آئینی فعل ہے۔ تھانہ میں ایسی حالت میں میرا بیان قلم بند کرنے کے بعد میں نے اسے کہا کہ مجھے گولی مار دو اور میں لکھ دیتا ہوں کہ میں نے خود کشی کی ہے لیکن محب وطن لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو۔ بیان لکھنے کے بعد مجھے اسی حالت میں ایک اور کمرے میں بھیج دیا گیا جہاں میز پر ایک پولیس آفیسر بیٹھے

تھے۔ جنھوں نے میز پر کچھ انڈے، پیاز، آلو اور مرچیں رکھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کہا یہ اشیاء اپنے پیچھے خود لے لیں یا ہم دیں۔ میں ان سے درخواست کر رہا تھا کہ ایسی حرکت نہ کریں۔ اس کے بعد ایک آدمی نے، جو سفید کپڑوں میں ملبوس تھا، انڈا اٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دیا اور کہا کہ تمہیں دوسرے کمرے میں لے جانا ہے۔ تم خود پیچھے دے لو۔ شلوار کے بغیر میں جب ایک اندھیرے کمرے میں گیا تو وہاں دو اور آدمی، جن کی میں آوازیں سن سکتا تھا، بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے برف پر پندرہ منٹ زبردستی قمیص کا پلہ اتار کر لٹا دیا اور اس کے بعد مجھے برآمدے میں بنچ پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد تمام دیگر ملزمان کو تھانے کے صحن میں قطار میں کھڑا کر دیا اور اس اے ایس آئی نے، جس نے سب سے پہلے (میری) شلوار اتاری تھی، ہمیں کہا کہ شلواریں اتار دو اور زمین پر اوندھے منہ لیٹ جاؤ۔ ہم نے شلواریں نہ اتاریں اور اوندھے منہ دراز ہو گئے۔ میں دل کا مریض ہوں اور تین مہینے ڈاکٹر رؤف صاحب کے پاس نشتر ہسپتال میں زیر علاج رہا ہوں۔ اگر مجھے طبی امداد نہ ملی اور دو روز تک میرے ساتھ یہی سلوک ہوتا رہا تو مجھے دل کا شدید دورہ پڑنے کا امکان ہے۔ جیل میں طبی امداد و سہولت مہیا نہیں ہے۔ عام قیدیوں کی طرح بھی کوئی سہولت مہیا نہیں ہے۔

سُن کر درست تسلیم کیا۔

دستخط بحروف انگریزی

قسور گردیزی

مجسٹریٹ (26-8-1973)

(مطبوعہ: ہفت روزہ چٹان، لاہور، 8 اکتوبر 1973ء)

جب میں 'چٹان' کا شمارہ لے کر سیف خالد سے ملا تو اسے دیکھنے کے بعد وہ بے اختیار بول پڑے۔

''یہ شرمناک ہے۔ اس کے باوجود میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بھٹو ہمارا فطری

اتحادی ہے اور ہم اسے مذہبی جنونیوں اور فسطائیوں کی طرف دھکیل رہے ہیں"

یہ بات صرف سیف خالد ہی نہیں کہتے تھے بلکہ میں نے اسی عرصے میں بہت سے دوسرے لوگوں سے بھی سنی، جن میں شمیم اشرف ملک، باجی نسیم اور مہدی انور شامل تھے۔ وہ یہ بات غوث بخش بزنجو سے بھی منسوب کرتے تھے۔

ولی خان پر قاتلانہ حملہ

28 ستمبر 1973ء کو ولی خان مالا کنڈ ایجنسی میں گاڑیوں کے ایک قافلے میں سفر کر رہے تھے کہ اچانک ان کی کار پر فائرنگ ہوگئی۔ ان کا ایک ملازم موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ جبکہ دوسرا زخمی ہوا۔ ولی خان اس قاتلانہ حملے میں بال بال بچ گئے۔ وزیر داخلہ عبدالقیوم خان، وزیر اعظم بھٹو اور ان کے کئی دیگر رفقاء نے حملے کی مذمت کی۔ گورنر سرحد اسلم خٹک نے کہا کہ حملہ آوروں کو بہت جلد گرفتار کر لیا جائے گا۔ ولی خان پر یہ پہلا حملہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک دو مقامات پر ان پر حملے کیے گئے۔ اوائل 1973 میں ان کی وزارتیں توڑی گئیں۔ راولپنڈی کے جلسہ میں ان کے ساتھی شہید کئے گئے۔ نیشنل عوامی پارٹی کا ترجمان اخبار "روزنامہ شہباز" بند کر دیا گیا۔ یہ اقدامات صرف ولی خان کے خلاف نہیں اٹھائے گئے بلکہ نیپ سے وابستہ سیاسی کارکن اور رہنما پاکستان میں جہاں کہیں بھی سرگرم عمل تھے انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ظلم اور زیادتی کا شکار ہونے والوں میں سیف خالد پیش پیش تھے اور زندگی بھر سی آئی ڈی کی ستم گیری کا شکار رہے۔

سیف خالد اور سی آئی ڈی

اس سلسلے میں ان کی صاحبزادی صبوحی گل ایک واقعہ سناتی ہیں:

"1972ء یا 1973ء کی بات ہے کہ سیف خالد کو مشرقی پنجاب سے ایک دیرینہ دوست سریندر سنگھ کا پیغام ملا کہ اس کا داماد بلدیو سنگھ ہندوستان کی ہاکی ٹیم میں کھیلتا ہے اور

ان دنوں پاکستان کا دورہ کر رہا ہے۔ سیف اپنے اہل خانہ کے ہمراہ اسے انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل ملنے گئے اور دو تین روز تک اس کی خوب خاطر مدارت کی۔ اس دوران سی آئی ڈی مسلسل سیف خالد اور ان کے اہل خانہ کو ہراساں اور ان سے باز پرس کرتی رہی۔ کچھ سال بعد سیف خالد کے دوست اور بزنس پارٹنر میاں زاہد سرفراز وزیر داخلہ بنے تو انہوں نے سیف خالد کی فائل منگوا کر دیکھی تو پتہ چلا کہ سیف خالد کے امپورٹ لائسنس کے منسوخ ہونے میں ان کی ہندوستانی ہاکی ٹیم سے ملاقاتوں کا گہرا دخل تھا۔

انھی دنوں میں سیف خالد کو چیکوسلواکیہ جانے کا موقع بھی ملا جہاں اُن کے دیرینہ دوست اور کامریڈ پروفیسر جان مارک نے اُن کی بہت آؤ بھگت کی اور اُنھیں پراگ دیکھنے کا موقع ملا۔ پراگ کی خوبصورتی نے اُن کے دل پر گہرا نقش مرتب کیا۔

نیشنل عوامی پارٹی کی مجلس عاملہ کا اجلاس اپریل 1974ء

پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کی مجلس عاملہ کا تین روزہ اجلاس 13 تا 15اپریل 1974ء کو اسلام آباد میں منعقد ہوا۔ اس تین روزہ اجلاس نے 28 قرار دادیں منظور کیں۔ 15اپریل کو وفاقی حکومت پاکستان کے جواب میں 29ویں قرار داد منظور کی گئی اس کی تفصیل اس دور کی سیاسی صورت حال کو سمجھنے کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ یوں تو تمام قراردادیں اہمیت کی حامل ہیں لیکن متحدہ جمہوری اتحاد کے قیام، بلوچستان کے خلاف فوجی کارروائی، سیاسی قیدیوں کی رہائی اور شہری آزادیوں کے مسئلہ، صوبائی خودمختاری سے انکار عوام کو مفلس اور محتاج بنانے، زرعی اصلاحات کو بہتر بنانے، بنکوں کے قومی تحویل میں لینے اور تعمیر و ترقی کے غیر سرمایہ دارانہ راستے، بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے، اعلان دہلی، امن کی طرف ایک قدم، عبدالغفار خان پر پابندیون، تربیلا اور روہڑی کے دوروں کی تائید، چلی کے انقلابیوں کی تائید، بحر ہند بطور پُر امن خطہ، نیپ کے کارکنوں، جمہوری طاقتوں اور عوام سے اپیل جیسی قراردادیں حسب ذیل ہیں :

متحدہ جمہوری محاذ کا قیام اور اس کا کردار

''نیپ کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس اس امر پر اپنے اطمینان کا اظہار کرتا ہے کہ ملک کی دوسری مخالف حکومت پارٹیوں کے ساتھ مل کر متحدہ جمہوری محاذ بنانے کا اس کا اقدام بڑا فائدہ مند رہا ہے۔ اس سے عوامی حقوق کی بحالی کی جدو جہد کو آگے بڑھانے میں مدد ملی ہے۔ 1958ء میں جب ایوب خان نے مارشل لاء نافذ کر کے سب سے پہلے پاکستان کے عوام کو ان کے حقوق سے محروم کر دیا تھا، اس وقت سے لے کر اب تک عوام کو ان کے یہ حقوق پوری طرح واپس نہیں ملے۔

بلوچستان کے خلاف فوجی کارروائی

''مجلس عاملہ کا یہ اجلاس اس واقعہ کو نہایت گہری تشویش سے دیکھتا ہے کہ بلوچستان کے عوام کے خلاف فوجی کارروائی بدستور جاری ہے اور اس صوبے کے عوام کے مصائب اب بھی ختم ہوتے نظر نہیں آ رہے۔ پانچ ہزار سے زیادہ آدمی بلوچستان کی مختلف جیلوں میں قید ہیں۔ کوئی تین نظر بندوں کے کیمپ ہیں۔ ان میں ایک عورتوں اور بچوں کا ہے۔ بلوچستان کی حکومت کو جسے واضح طور پر صوبائی اسمبلی کی اکثریت کی تائید حاصل تھی، آئین اور قانون کے تمام ضابطوں اور اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے برطرف کر دیا گیا۔ اس صوبے کی متحدہ اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے کے لئے ہر قسم کے ذلیل طریقے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ اسمبلی کے ارکان پر جھوٹے مقدمے بنا کر انہیں ان کو اسمبلی کی نشستوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔ سیاسی قتل کئے گئے ہیں۔ رشوت سے لے کر بندوق کی گولی تک کے تمام طریقے اسی سلسلے میں جائز و مناسب سمجھے گئے ہیں۔

سیاسی قیدیوں کی رہائی اور شہریوں کا مسئلہ

''نیپ کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس بڑی گہری تشویش سے ان واقعات کو دیکھتا ہے کہ

پریس اور خبر رسانی، ابلاغ کے ذرائع کی زبان بندی کر دی گئی ہے۔ سیاسی مخالفوں کے خلاف سیاہ اور ہنگامی قوانین استعمال کئے جا رہے ہیں۔ ملک کی عدلیہ کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ لوگوں کو انصاف دے، وہ حکومت کے مخالفوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں کرنے کے لئے اس کے ہاتھوں میں آلہ کار بنے۔ لوگوں کو دبانے اور ان پر سختی کرنے کے حکومت کے اختیارکو بے حساب بڑھایا جا رہا ہے۔ آئین کی رو سے پولیس ایک صوبائی محکمہ ہے لیکن اس کے باوجود صوبوں کو دبانے کے لئے فیڈرل فورس اور سیکورٹی کھڑی کی گئی ہے۔ عوام سے عملی تعلقات کے معاملے میں حکومت کا تمام تر انحصار جبر و طاقت جھوٹ اور دھوکے پر ہے۔

چنانچہ مجلس عامہ مطالبہ کرتی ہے کہ تمام سیاسی و ٹریڈ یونین کارکن، طالب علم اور کسان کارکن فوراً رہا کئے جائیں۔ ان کے خلاف مقدمے واپس لئے جائیں اور ان کے وارنٹ منسوخ کئے جائیں۔ ہنگامی صورت حال ختم کی جائے۔ بنیادی حقوق بحال کئے جائیں۔ اخبارات کو آزادی دی جائے۔ سرکاری انتظامیہ اور پیپلز پارٹی کے عہدیداروں کی بدعنوانیوں، جانب داری اور اقربا پروری کا خاتمہ کیا جائے۔

صوبوں کو خود مختاری دینے سے انکار

''نیپ کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس حکومت کی سخت مذمت کرتا ہے کہ وہ اس آئین کا احترام نہیں کرتی جو اس نے خود بنایا ہے۔ مرکزی حکومت کی طرف سے ملک کے آئین کی بار بار کی خلاف ورزی جو، خاص طور پر یہ صوبوں کے معاملات میں کی جا رہی ہے۔ صوبائی خود مختاری کو ایک مذاق بنا دیا ہے اور اسی صورت حال نے آئین کو ایک فرسودہ اور بے کار دستاویز میں بدل دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نیپ صوبائی خود اختیاری کے اس حصے پر جو آئین میں رکھا گیا ہے، باہمی مفاہمت اور ایثار کے جذبے کے تحت قناعت کرنے پر راضی ہوئی تھی لیکن حکومت جو زبان سے کہتی ہے اس پر عمل کرنے کو تیار نہیں۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ حکومت اس سے کہیں زیادہ مرکزیت کی حامل ہے، جتنی

کہ مغربی پاکستان کی ایک یونٹ کی حکومت کبھی تھی غرض اس سے وہ عمل ترقی کر رہا ہے جو صوبائی حکومتوں کو مرکزی حکومت کا بالکل دم چھلہ بنا دے گا۔ نیپ پورے عزم سے اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ وہ اپنی اس پالیسی سے جس کا وہ مستقل طور سے اظہار کرتی چلی آرہی ہے، کبھی نہیں ہٹی کہ مرکز کے پاس صرف دفاع، امور خارجہ، کرنسی اور مواصلات کے محکمے رہنے چاہئیں اور یہ کہ نیشنل عوامی پارٹی اس معاہدے کے یک طرفہ طور پر کبھی پابند نہیں رہے گی۔ جس کی کہ دوسری پارٹی عملاً خلاف ورزی کر چکی ہے۔ نیپ ایک بار پھر حکومت کو آگاہ کرتی ہے کہ ملک کے عوام اور نیپ پاکستان کے مختلف صوبوں کے حقوق و اختیارات میں کسی قسم کی اجازت نہیں دے گی۔

عوام کو مفلس و محتاج بنایا جا رہا ہے

''نیپ کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس روز مرہ استعمال میں آنے والی چیزوں کی برابر تیزی سے بڑھتی ہوئی قیمتوں اور افراط زر پر حیرت و وحشت کا اظہار کرتا ہے، جو عوام کو روز بروز زیادہ سے زیادہ محتاج و مفلس بنا رہا ہے۔ وہ مطالبہ کرتا ہے کہ امیروں کے اور زیادہ امیر ہونے اور غریبوں کے غریب بنائے جانے کے موجودہ رجحان کو روکا جائے۔ دفاع، پولیس، سرکاری مشینری اور دوسری غیر پیدا آور مدوں پر کئے جانے والے مصارف کو گھٹا کر افراطِ زر کا سد باب کیا جائے۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی قیمتوں پر کنٹرول ہو، بد عنوانیوں اور رشوت کا خاتمہ کیا جائے۔

حکومت عوام کی حالت کو جو بد سے بد تر ہوتی جا رہی ہے، بہتر بنانے میں بری طرح ناکام رہی ہے اور مجلس عاملہ کے اس اجلاس کی یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ عوام اس صورت حال کو زیادہ دیر برداشت نہیں کریں گے۔

زرعی اصلاحات کو بہتر بنایا جائے

''مجلس عاملہ کے اس اجلاس کی یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ وہ زرعی اصلاحات جن کا

کہ بہت چرچا کیا گیا ہے، کسانوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے رائج نہیں کی گئیں تھیں بلکہ اس کے بجائے ان کا اجرا جاگیرداری نظام کی عمارت کو سہارا دینے کی خاطر کیا گیا تھا۔ ان اصلاحات کو جس طرح نافذ کیا گیا اس نے ان کے پیچھے حکومت کے جو حقیقی عزائم تھے، انہیں بالکل بے نقاب کر دیا ہے اور وہ یہ کہ دیہاتی معیشت میں کسانوں اور جاگیرداروں کے درمیان موجود جن رشتوں کا خاتمہ قریب تھا ان کے اوپر پردہ ڈال کر انہیں سنبھالا دیا گیا ہے۔ زمین اس کی جو اسے جوتے، اسی اصول پر عمل نہ کر کے یہ اصلاحات مالک کسانوں کے طبقے کو وجود میں لانے میں ناکام رہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان زرعی اصلاحات کے نتیجے میں امیر مالکوں اور غریب کسانوں کا باہمی فرق اور زیادہ بڑھتا ہے اور یہ اس طرح کہ ان کی وجہ سے چند مالدار جاگیرداروں کے ہاتھ میں تمام معاشی طاقت آگئی ہے اور چھوٹے اور متوسط طبقے کے مالک ختم ہو رہے ہیں۔ کیونکہ انہیں نہری پانی سے محروم کر کے وہ پانی بہت بڑے زمینداروں کی اراضی کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ان تک زرعی قرضوں اور کیمیائی کھاد وغیرہ کی سہولتیں نہیں پہنچتیں اور یہ کہ بعض دفعہ بے سہارا غریب مالک کسانوں کی اراضی پر بڑے زمیندار زبردستی قبضہ کر لیتے ہیں۔ نیز چھوٹے مالک کسانوں کی نقدی اجناس کو خریدنے والی متعلقہ ایجنسیاں وقت پر نہیں اٹھاتیں۔ اس حالات میں چھوٹے مالک مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی زمینیں غیر فائدہ شرطوں پر بڑے بڑے زمینداروں کو اجارے پر دے دیں۔

بنکوں کا قومی تحویل میں لینا اور تعمیر و ترقی کا غیر سرمایہ دارانہ راستہ

"نیشنل عوامی پارٹی کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس حکومت کی نام نہاد معاشی اصلاحات سے مطمئن نہیں۔ صنعتوں کو دیوالیہ ہونے سے بچانے کی خاطر عوام کے مفاد سے قطع نظر کرتے ہوئے حکومت نے انہیں اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ نیپ بنکوں کو قومی ملکیت میں لینے کا ہمیشہ سے مطالبہ کرتی رہی ہے لیکن اس کے نزدیک یہ با مقصد زرعی اصلاحات کے نفاذ اور جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے بعد کا اقدام ہونا چاہیے تھا تاکہ اس طرح نام نہاد

قومی ملکیت یا صحیح معنوں میں صنعتوں کو اشتراکی بنانے اور زراعت میں جاگیرداری نظام کے بدستور جاری رکھنے سے جو مہمل اور مائل بہ خرابی صورت حال پیدا ہوگئی ہے اس سے بچا جاتا۔ اس اجلاس کی رائے میں بنکوں کو اس لئے قومی تحویل میں لیا گیا ہے کہ ان میں جمع شدہ سرمائے کو حکومت کے اختیار میں دے دیا جائے تا کہ وہ اسے اپنے حق میں سیاسی امداد حاصل کرنے اور صنعتوں کے نجی سیکٹر میں نئے کاروباری گروہوں میں اس کو محض منتقل کرنے اور ان میں نئے سرے سے اسے اور سرمایہ لگانے کی سہولتوں کو تقسیم کرنے پر صرف کر سکے۔ اس میں حکومت کے پیش نظر یہ ہے کہ معیشت کا موجودہ سرمایہ دارانہ نظام بدستور قائم رہے جس کا کہ لازمی نتیجہ اجارہ داریوں کے قیام کی شکل میں نکلے گا۔

"یہ بات بالکل واضح ہے کہ حکومت قومی ملکیت میں لئے گئے ان بنکوں کی مالی امداد سے ان نقصانات کو پورا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، جو قومی ملکیت میں لی گئی اور حکومت کی زیر انتظام صنعتوں میں لازماً ہوتا ہے۔ مزید برآں مزید یہ ہے کہ قوم کی بچتوں کو غیر پیداواری مقاصد پر خرچ کیا جائے گا۔ کیونکہ حکومت کے سامنے کوئی مستحکم اور طے شدہ منصوبہ نہیں ہے جو اس پورے مسئلے کے پہلوؤں پر روشنی ڈالے۔ پھر یہ کہ غیر ملکی بنک اور کمپنیاں اسی طرح رہنے دی گئی ہیں، بلکہ طرہ یہ کہ انہیں مزید یقین دہانیاں کرائی گئی ہیں۔ چنانچہ حکومت کا یہ اقدام اس کی سامراج دوستی اور جدید استعماریت کے کردار کو صاف طور پر واشگاف کرتا ہے۔ جس کے تحت وہ سرمایہ دار جاگیردار، بڑے زمیندار پید کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ معیشت کے سرمایہ دارانہ سیکٹر کو جاگیرداری نظام اور سامراج کا محتاج بنا رہی ہے۔

بنگلہ دیش کا تسلیم کیا جانا

"نیپ نے شروع ہی میں پاکستان کی آمرانہ حکومت سے احتجاج کرتے ہوئے اس پر زور دیا تھا کہ وہ سابقہ مشرقی پاکستان میں طاقت استعمال کرنے سے باز رہے، اس سے ملک کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ اپنے اس موقف کی بنا پر اس وقت کی آمرانہ حکومت نے نیپ پر پابندی لگا دی۔ جب فوجی کارروائی کے نتیجے میں بدقسمتی سے بدی کی طاقتوں کے

ذریعہ ملک بٹ گیا تو نیپ نے پھر بنگلہ دیش کو جلد سے جلد منظور کرنے کے لئے کہا تاکہ دونوں کے درمیان معمول کے مطابق تعلقات کا قیام عمل میں آ سکے۔ اگر بنگلہ دیش کو تسلیم کر لینے کا ہمارا یہ مطالبہ شروع ہی میں قبول کر لیا جاتا تو ہمارے فوجیوں کے جنگی قیدیوں کے طور پر اتنے عرصے تک قید رہنے اور ان کے خاندانوں کو اس قدر اذیت جھیلنے کی نوبت نہ آتی۔ اور اس وقت تک ہم بنگلہ دیش میں اپنے بھائیوں سے زیادہ قریب ہو چکے ہوتے۔

مجلس عاملہ بنگلہ دیش کے تسلیم کئے جانے کو، گو اس میں تاخیر ہوئی، قدر کی نظروں سے دیکھتی ہے۔ وہ محسوس کرتی ہے کہ بنگلہ دیش کے تسلیم نہ کرنے اور اس میں اتنی دیر ہونے کا نقصان پاکستان کے سوا اور کسی کو نہیں پہنچا۔ مجلس عاملہ کا یہ اجلاس شمالی ویت نام اور شمالی کوریا کی حکومتوں کو تسلیم کرنے پر اپنے اطمینان کا اظہار کرتا ہے۔

اعلان دہلی۔۔ امن کی طرف ایک قدم

''نیشنل عوامی پارٹی کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس حال میں طے پانے والے ''معاہدہ دہلی'' کا خیر مقدم کرتا ہے۔ جس نے برصغیر میں صورت حال کو معمول پر لانے اور برصغیر کے تینوں ملکوں کے درمیان بامعنی تعلقات کے قیام کا دروازہ کھول دیا ہے۔ یہ اجلاس اس صحت مند اقدام پر پاکستان کے عوام کو مبارکباد دیتا ہے۔ جس نے ثابت کر دیا ہے کہ انتہائی درجے کی رجعت پسند حکومت کو بھی خفیف ہو کر اپنے الفاظ واپس لینے اور بالآخر عوام کی مرضی کے سامنے جھکنے پر مجبور کیا تھا۔ یہ اقدام نیپ کے اس مؤقف کی بھی تصدیق ہے جو اس نے بہت شروع ہی میں طے کیا تھا۔ اگر نیپ کے اس مؤقف کو اس سے پہلے تسلیم کر لیا جاتا تو ملک کو جنگی قیدیوں کے دو سال تک ہندوستانی کیمپوں میں قید کی شرم و ذلت سے بچایا جا سکتا تھا۔

یہ اجلاس پاکستان کے عوام کو متنبہ کرتا ہے کہ وہ چوکس و بیدار رہیں اور رجعت پسند مفاد پرستوں کو اس کی جازت نہ دیں کہ برصغیر میں حالات کو معمول پر لانے کا جو عمل شروع ہو چکا ہے، وہ اس کا رخ پھر پیچھے کو پھیر دیں۔ ملک میں اس قسم کی طاقتیں موجود

ہیں اور گو وہ بذات خود کمزور ہیں لیکن انہیں سامراج سے تقویت مل جاتی ہے۔ اس لئے جب تک پاکستان سینٹو اور دوسرے فوجی معاہدوں کا رکن ہے اور سامراج ہمارے ملک کے اندر مضبوط قدم جمائے بیٹھا ہے، یہ خطرہ برابر رہے گا کہ حقوق یافتہ مفادات کہیں ایک بار پھر خیر سگالی کی پالیسی کو الٹ پلٹ کر ملک کو مصائب میں مبتلا کر دیں۔

عبدالغفار خاں پر عائد پابندیوں کو ہٹایا جائے

''نیپ کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس عبدالغفار خان کی نقل و حرکت پر پابندیاں عائد کرنے کے حکومت کے حکم کی بہت سخت الفاظ میں مذمت کرتا ہے، جس کی وجہ سے عوام ان کی رہنمائی اور سماجی اصلاح کی خدمات سے، جو وہ کر رہے تھے، محروم کر دیئے گئے ہیں۔ یہ اجلاس ان پابندیوں کو فی الفور ہٹانے کا مطالبہ کرتا ہے۔

تربیلہ اور روہڑی کے مزدوروں کی تائید اور ان کے ساتھ اتحاد و یک جہتی کا اظہار

''نیپ کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس تربیلا بند پروجیکٹ کے بیس ہزار مزدوروں کے ساتھ، جو اپنے جائز اور مبنی بر انصاف مطالبات کے لئے جدو جہد کر رہے ہیں، اپنی یک جہتی اور اتحاد کا اظہار کرتا ہے۔ جب ان مزدوروں نے ہڑتال کی تو پولیس نے ان پر گولی چلائی، جس میں چار آدمی ہلاک اور بہت سے زخمی ہوئے۔ ان کے بہت سے لیڈر اور ساتھی مزدور گرفتار ہیں۔ یہ اجلاس تربیلا بند کو ایک لازمی سروس قرار دیئے جانے کے اعلان کیا جو محض وہاں کے مزدوروں کی متحدہ جدو جہد کو ناکام بنانے کے لئے کیا گیا ہے، مذمت کرتا ہے، یہ اجلاس تربیلا بند کے مزدوروں کے ریفرنڈم اور دوسرے مطالبوں کی حمایت کرتا ہے۔ مزید برآں یہ اجلاس حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ لوگ جو تربیلا بند پروجیکٹ سے متاثر ہوئے ہیں، انہیں معاوضے میں متبادل زمینیں دی جائیں۔

نیز یہ اجلاس روہڑی سیمنٹ فیکٹری کے مزدوروں کے ساتھ اپنی یک جہتی و اتحاد کا اظہار کرتا ہے اور ان کی شاندار کامیابی پر انہیں مبارکباد دیتا ہے۔ مجلس عاملہ کا یہ اجلاس

ملک کے مزدوروں کے ساتھ جو انتہائی نا مساعد حالات میں اپنے حقوق کے لئے جدو جہد کر رہے ہیں اپنی یک جہتی و اتحاد کا اظہار کرتا ہے۔

چلی کے انقلابیوں کی تائید

''نیشنل عوامی پارٹی کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس چلی میں سامراج کے اشارے پر کرائے گئے رجعت پسندانہ انقلاب اور آئین کی رو سے منتخب کردہ اس ملک کی حکومت کے ہٹائے جانے کی مذمت کرتا ہے۔ یہ اجلاس چلی کے مصائب میں گھرے ہوئے لوگوں کے ساتھ جو بڑی بہادری سے اپنے ملک کے اندر آزادی اور جمہوریت کی خاطر لڑ رہے ہیں اپنی پوری یک جہتی اور ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ یہ اعلان کرتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ پاکستان اور چلی کے عوام ایک ہی دشمن یعنی امریکی سامراج کے ہاتھوں دبائے جا رہے ہیں، بلکہ یہ کہ ان دونوں ملکوں میں امریکی سامراج اور اس سے امداد پانے والے داخلی رجعت پسند، حقوق یافتہ مفادات سول اور فوجی افسر شاہی سب سے اہم دشمن ہیں جن کے خلاف دونوں ملکوں میں عملاً رجعت پسندوں کے پشت پناہ ثابت ہو چکے ہیں یہ اجلاس پاکستان کے عوام سے اپیل کرتا ہے کہ وہ پوری دنیا کے عوام کے ساتھ متحد ہو کر چلی کے لوگوں کی تائید کریں۔

بحر ہند کو بطور ایک پر امن خطے کے رہنا چاہئے

''نیپ کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت کے اس اقدام کی کہ وہ بحر ہند کے جزیرہ دیگو گارسیا میں ایک بحری اڈا بنا رہا ہے، مذمت کرتا ہے۔ اس اڈے کا قیام بحر ہند کے ملکوں کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے۔ نیز یہ چیز افریقی اور ایشیائی ملکوں کے حق میں اچھی نہیں کہ امریکی سامراج ان کے بیچوں بیچ اپنا ایک اڈا بنائے اور انہیں پرانی دھونس کی ڈپلومیسی اور سازشوں کے ذریعے اپنی باتیں منوانے پر مجبور

کرے۔ یہ اجلاس اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ وہ بحر ہند کو ایک امن کا خطہ بنانے کے حق میں ہے تاکہ ان علاقوں میں ہتھیاروں کی دوڑ سے بچا جائے۔ اس سے ایٹمی طاقتوں کی محاذ آرائی کے خطرات محدود ہو جائیں گے۔ اور بحر ہند کے اردگرد کے ملک امن کے ماحول میں اپنے ترقیاتی کاموں کو جاری رکھ سکیں گے۔

نیپ کے کارکنوں سے اپیل

نیپ کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس ملک بھر کے نیپ کارکنوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ جمہوریت اور عوام کی فلاح و بہبود کے کاز کے لئے ثابت قدم رہیں۔ وہ عوام کو منظم کریں اور دوسری جمہوری اور ترقی پسند طاقتوں کے ساتھ اتحاد و اشتراک کو اس طرح مضبوط بنائیں کہ موجود غیر جمہوری حکومت کو صحیح معنوں میں ایک جمہوری حکومت میں بدلا جا سکے اور ایسا نہ ہو کہ اس حکمران ٹولے کے کچھ اور لوگ برسر اقتدار آ جائیں۔

جمہوری طاقتوں سے متحد ہونے کی اپیل

نیپ کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس تمام ترقی پسند اور جمہوریت کے حامی عوام اور بالعموم سب جمہوری طاقتوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ موجودہ حالات میں نیپ سے تعاون کریں تاکہ ملک کو سامراجیوں، اجارہ داروں اور جاگیرداروں کے پنجوں سے بچایا جا سکے۔

عوام سے اپیل

یہ اجلاس پاکستان کے عوام سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اس بات کو اچھی طرح ذہن میں رکھیں کہ خبر رسانی و ابلاغ کے تمام ذرائع پر حکومت کا کنٹرول ہے اور وہ ہر قسم کے جھوٹ اور پر فریب پروپیگنڈے میں لگے رہتے ہیں۔ اس لئے انہیں ہوشیار اور چوکس رہنا چاہئے اور اس پروپیگنڈے کے زہر سے اپنے دماغوں کو بچانا چاہئے، انہیں ہر سیاسی

پارٹی اور گروہ کی جانچ پرکھ، اس کے پروگرام اور عمل ہر دو کو سامنے رکھ کر کرنی چاہئے۔

ملک میں ایک جمہوری تبدیلی کے لئے حالات سازگار ہیں اور نیپ عوام، طالب علموں، مزدوروں، کسانوں اور کاروباریوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ حکمران طبقات میں حقیقی تبدیلی کے لئے، نہ کہ انہی حکمرانوں میں سے محض نئے چہروں کے لئے، نیز ایک صحت مند جمہوری اور خوش حال پاکستان کی تعمیر کے لئے متحد ہوں۔

29ویں قرارداد اہمیت کی حامل تھی، اس لئے اسے بھی یہاں درج کیا جاتا ہے

وفاقی حکومتِ پاکستان کے جواب میں

حسب ذیل ریزولیوشن نیشنل عوامی پارٹی کی مجلس عاملہ کے اجلاس منعقدہ اسلام آباد مورخہ 15 اپریل 1974ء میں منظور کیا گیا۔

''پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کی مرکزی مجلس عاملہ نے پاکستان کی وفاقی حکومت کے اعلان مورخہ 14 اپریل 1974ء پر اپنے اجلاس کے اختتام پر غور کیا۔ اس نے بلوچستان کی صورت حال پر بڑی تفصیل سے بحث کی اور آخر میں یہ فیصلہ کیا کہ پاکستان بھر میں بلوچ عوام کی آزادی کی جدو جہد کو جاری رکھا جائے۔

حکومت کا یہ اعلان، جس کا سرکاری ذرائع ابلاغ سے پہلے بڑا ڈھنڈورا پیٹا گیا تھا، مجلس عاملہ کی نظر میں زخموں پر نمک چھڑکنا ہے۔ یہ اعلان صرف آنکھوں میں دھول ڈال کر پاکستان اور بیرون پاکستان کے عوام کو دھوکا دینا ہی نہیں بلکہ یہ ان بلوچ شہیدوں کی یاد کی توہین بھی ہے جنہوں نے جمہوریت اور عوام کے حق اقتدار کی خاطر اپنی جانیں دی ہیں۔ یہ بات بڑی افسوس ناک ہے کہ وزیر اعظم، جس کے ہاتھ بلوچ عوام کے خون سے رنگین ہیں۔ اب اپنے جبر و تشدد کے ساتھ دھوکا و فریب اور غلط بیانیوں کو بھی شامل کر رہا ہے۔ وہ کانفرنس جس کے اجلاس کے بعد وفاقی حکومت کی طرف سے یہ اعلان جاری کیا گیا۔ اس میں صوبہ سرحد اور فوج کے چیف آف سٹاف کی شمولیت اس کانفرنس کو ایک نہایت مشتبہ اور مضحکہ خیز اجتماع کی شکل دیتی ہے۔ ایک سیاسی کانفرنس میں فوج کے چیف

آف سٹاف کی شمولیت موجودہ حکومت کی اس پالیسی کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ بلوچ عوام کی مبنی بر انصاف سیاسی آرزوؤں کو ان کے معصوم خون میں ڈبو دینا چاہتی ہے۔

مجلس عاملہ ضروری سمجھتی ہے کہ وہ پاکستان کے عوام اور اس کے ساتھ ساتھ دنیا کی حکومتوں اور اس کے عوام کو حکومت پاکستان کے اس پر فریب اور جھوٹے پروپیگنڈے پر مشتمل اعلان کے بارے میں آگاہ کرے۔ اس اعلان کی رو سے بلوچستان سے فوج کو فی الفور ہٹالے جانے کے بجائے اسے 15 مئی 1974ء تک وہیں رکھا جائے گا۔ تاکہ وہ وہاں اپنا جبر و تشدد کا سلسلہ جاری رکھے۔ اعلان کے مطابق وہ بزعم خویش اپنے نام نہاد و سماجی ترقی کے کام، جیسے سڑکیں بنانا، سکول تعمیر کرنا اور بجلی لگانا وغیرہ ہیں کرتی رہے گی۔ یہاں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ ایسے سماجی کاموں کے لئے بلوچستان کی سول حکومت اور اس کے متعلقہ محکمے کہاں گئے اور کب سے فوج کو یہ ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں کہ وہ ملک کی سرحدوں کی حفاظت کے مقدس فرائض کو ترک کر کے سماجی ترقی کے محکموں کو اپنے ہاتھ میں لے۔ یہ کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ ملک کی دفاعی افواج، جن کا مقدس ترین فرض غیر ملکی جارحیت سے ملک کی حفاظت کرنا ہوتا ہے وہ غلط استعمال کی جارہی ہیں اور انہیں خود اپنے عوام کو قتل کرنے پر لگا دیا گیا ہے۔ تاکہ وہ حکمران ٹولے کی برسر اقتدار رہنے کی ہوس کو پورا کرنے میں مدد دے سکیں۔

جہاں تک وفاقی حکومت کے اعلان میں معافی دینے کا تعلق ہے یہ اس معافی سے بڑی نمایاں مشابہت اور یکسانیت رکھتی ہے جس کا جنرل یحیٰی نے پاک ہند جنگ کے وقت اعلان کیا تھا اور یقیناً اس کے بھی وہی نتائج نکلیں گے جو اس معافی کے نکلے تھے۔ مزید یہ کہ اس مضحکہ خیز معافی میں بھی ایک استثنا رکھا گیا ہے اور وہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو بقول اس اعلان کے مجرمانہ کارروائیوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مجلس عاملہ اس امر کا اعلان کرتی ہے اور ہم وطنوں کو یقین دلاتی ہے کہ اس وقت بلوچستان میں جو پانچ ہزار قیدی اور ان کے رہنما ہیں ان میں سے کسی نے بھی کوئی جرم نہیں کیا۔ جرم کیا ہے تو حکومت پاکستان کے فرمانرواؤں نے اور یہ جرم عوام کے خلاف کیا ہے۔ اب یہ فرمانروا

پاکستان کے عوام اور دنیا کے عوام کی عدالت کے سامنے جواب دہ ہیں۔

نیپ کی مجلس عاملہ ایک بار پھر عوام کو اپنے ان بہت پہلے کے نقطہ نظر کی یاد دہانی کراتی ہے، جن کا لب لباب یہ تھا کہ پاکستان کے موجودہ وزیر اعظم پر اعتماد کرنا ممکن نہیں۔ اس نے موجودہ اعلان کر کے ہمارے اس نقطہ نظر کی مزید تصدیق کر دی ہے اور پوری دنیا پر اپنا یہ کردار واضح کر دیا ہے کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جو جوڑ توڑ اور سازش کرنے اور سیاسی وعدہ خلافی کے انتہائی شرمناک افعال کرنے کا عادی ہے یہ کتنی شرم کی بات ہے کہ بلوچستان جل رہا ہے اور مسٹر بھٹو آج کے نیرو کے انداز میں بانسری بجا رہا ہے۔ مجلس عاملہ کو بہر حال پورا یقین ہے کہ پاکستان کے محب الوطن عوام اور دنیا کی جمہوری اور ترقی پسند طاقتیں اس طرح کے زبانی اور خالی خولی اعلانات سے دھوکے میں نہیں آئیں گی۔

بلوچستان کے عوام کی جمہوری جدو جہد جاری رہے گی اور مزید زور پکڑے گی۔ مجلس عاملہ سب جمہوریت خواہ عوام کو بلوچستان کے مجاہدین کا ساتھ دینے اور ان کی اس جدو جہد میں جو فسطائیت، آمریت، جبر وظلم اور استبداد کے خلاف جمہوریت سماجی انصاف، قومی مساوات اور عوام کے اقتدار اعلیٰ کی خاطر کی جاری ہے ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ اتحاد و یک جہتی قائم کریں گے یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ وفاقی حکومت کا یہ اعلان صرف بلوچستان پر حملہ نہیں ہے بلکہ یہ حکومت کی طرف سے پورے ملک کے عوام کے خلاف ایک نئی یلغار شروع کرنے کے بڑے ارادوں کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔

نیپ کی مجلس عاملہ کی یہ بھی رائے ہے کہ مشرق وسطیٰ میں عمل دخل رکھنے والی سامراجی اور جدید استعمار پسند طاقتیں اور ان کے علاقائی پٹھو اور گماشتے بلوچستان کے خلاف جبر و تشدد کی کارروائیاں کرنے کے معاملے میں موجودہ حکومت کے صلاح کار اور اسے تحریک دینے والے ہیں۔ مجلس عاملہ جہاں اس اعلان کو پوری حقارت کے ساتھ جس کا کہ وہ مستحق ہے، مسترد کرتی ہے وہاں وہ بلوچستان کے بہادر مجاہدین کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے کہ وہ اپنی جمہوری جدو جہد کو جاری رکھیں اور اسے اور تیز کریں کیونکہ حق و انصاف ان کے ساتھ ہے اور ان کی یہ جنگ یقینی طور پر فتح و نصرت سے سرفراز ہوگی۔

ساتواں باب

بھرپور سیاسی سرگرمیاں 1979-1974

1974ء کے باقی واقعات

اپریل 1974ء میں نیشنل عوامی پارٹی کی مجلس عاملہ کے اسلام آباد اجلاس کے بعد سیف خالد سے کبھی لاہور میں اور کبھی کبھارلائلپور میں بڑی گرم جوش ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان دنوں میرا قیام کمیٹی چوک راولپنڈی میں تھا۔ میں نیشنل کونسل آف دی آرٹس کے شعبہ فوک لور ریسرچ سنٹر اسلام آباد میں پاکستان کا لوک ادب جمع کرنے کے کام پر مامور تھا اور راولپنڈی میں کرنل لطیف افغانی اور ان کی بیگم ثریا لطیف افغانی کے قریبی رابطے میں تھا۔ ایک دن اُن سے ملنے گیا تو لطیف افغانی خاصے اداس تھے۔ انہی دنوں قومی اسمبلی سے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا بل منظور ہوا تھا۔ لطیف افغانی کہنے لگے" اس سے پاکستان میں مذہبی جنون بڑھے گا۔ تمام رجعت پسند جماعتیں اکٹھی ہو کر بائیں بازو پر حملہ کریں گی اور دیکھنا، بھٹو بھی ان کی لپیٹ میں آجائے گا۔ ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ سیف خالد دروازے سے آتے دکھائی دیئے۔ کرنل لطیف افغانی کا وسیع وعریض گھر پنڈی کینٹ سے مری بروری جاتے ہوئے راستے میں پڑتا تھا اور میں کمیٹی چوک سے اکثر ٹہلتے ہوئے ان کے گھر آجاتا تھا۔ سیف خالد سے ملاقات میرے لئے ہمیشہ خوشی کی خبر ہوتی تھی۔ اس روز بھی میرے یہی جذبات تھے لیکن میں بلوچستان کی خبروں سے خاصہ دلبرداشتہ تھا۔ اس لئے میں نے اس گرم جوشی کا مظاہرہ نہ کیا، جس کا ان سے ملاقات

پر میں اکثر کیا کرتا تھا۔ ہم مجلسِ عاملہ کے اجلاس پر تبصرے کرنے لگے۔ اچانک سیف خالد لطیف افغانی سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ''احمد سلیم آپ کے پاس ہے اور آپ طلباء کمیٹی کے ممبر بنائے گئے ہیں۔ آپ اس سے کام لیں نا، پاکستان میں طلباء تحریک خصوصاً پارٹی کے طلبا ونگ کے حوالے سے یہ آپ کی بہت مدد کر سکتا ہے۔ یہ تو پڑھنے لکھنے کا بہت شوقین ہے اور آجکل اپنے دفتر کی طرف سے پاکستان بھر میں گھومتا پھرتا ہے۔''

دراصل طلباء کمیٹی کچھ نہیں کر رہی تھی۔ کمیٹی کے ارکان پاکستان بھر میں بکھرے ہوئے تھے۔ لطیف افغانی پنڈی میں تھے۔ امیر زادہ خان ایم پی اے مردان سے تعلق رکھتے تھے۔ بیگم محمودہ سلیم ایبٹ آباد میں تھیں جب کہ جمال نقوی دور دراز کراچی میں ہوتے تھے۔ اس لئے ان مشکل سیاسی حالات میں کمیٹی کے ارکان کے درمیان رابطے کا فقدان تھا۔ جب میں نے سیف خالد سے یہ ساری تفصیل بیان کی تو کہنے لگے ''کرنل صاحب، یہ سیلانی بندہ ہے۔ آج یہاں ہے کل پتہ نہیں کہاں ہو۔ آپ اس کی موجودگی سے فائدہ اٹھائیں'' دیر تک ہم اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ پھر میں اجازت لے کر وہاں سے چلا آیا۔

بلوچستان پر قرطاس ابیض

اسی سال حکومتِ پاکستان نے بلوچستان پر ایک قرطاس ابیض جاری کیا جس میں بلوچ باغیوں کے حوالے سے مختلف دعوے کئے گئے۔ حکومتی دعوے کے مطابق 14 اپریل 1974ء کو ہتھیار ڈالنے کی شرط پر باغیوں کے لئے عام معافی کا اعلان کیا گیا۔ ایک اور حکومتی اعلان کے مطابق ہتھیار ڈالنے کے لئے 15اکتوبر 1974ء کی تاریخ رکھی گئی۔ حکومت کے دعوے کے مطابق ہزاروں باغیوں نے اس تاریخ تک ہتھیار ڈال دیئے۔ بتایا گیا کہ باغیوں نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور بغاوت کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ بعد ازاں یہ تمام دعوے جھوٹے ثابت ہوئے اور فوجی آپریشن جاری رہا۔

واپڈا بم دھماکہ

2 ستمبر کو واپڈا ہاؤس لاہور میں بم کے خوفناک دھماکے میں دو افراد ہلاک ہوگئے۔ اس کے باعث لاہور میں سخت حفاظتی اقدامات کئے گئے۔ شہر بھر میں مسلح دستوں کو تعینات کر دیا گیا۔ حکومت نے الزام عائد کیا کہ نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) اس واقعہ میں ملوث ہے۔ پولیس نے نیپ کے ایک نوجوان رہنما باسط میر کو پکڑنے کے لئے چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ جب باسط پولیس کے ہاتھ نہیں لگے تو وہ ان کے بڑے بھائی ولید میر کو گرفتار کر کے لاہور کے قلعہ میں لے گئے۔ جہاں انہیں شدید قسم کی ایذا رسانی سے گزرنا پڑا۔ سیف خالد کو قید کر کے شاہی قلعہ میں رکھا گیا۔

ولید میر پر تشدد اس لئے کیا جا رہا تھا تا کہ ان سے اس واقعہ میں ملوث شخص کا نام معلوم کیا جا سکے۔ اس اثناء میں باسط میر بھی گرفتار کر لئے گئے اور 17 ستمبر 1976ء کو رہا ہوئے۔ الزام کے مطابق دھماکے کی سازش سیف خالد کے فلیٹ میں تیار کی گئی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ بھٹو حکومت ہر قیمت پر نیپ کو جھوٹے سچے الزامات کے تحت بین کرنا چاہتی تھی۔ 21 اکتوبر کو وزیر داخلہ قیوم خان نے اعلان کیا کہ ضرورت پڑنے پر نیپ اور جماعت اسلامی پر پابندی لگائی جا سکتی ہے۔ 10 نومبر کو وزیر اعظم بھٹو نے کہا کہ نیپ ملک کے مختلف حصوں میں دھماکے کروا رہی ہے۔ اس بیان کی ابھی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ 10 اور 11 نومبر کی درمیانی شب کو ممبر قومی اسمبلی احمد رضا قصوری کے والد نواب محمد احمد قصوری لاہور کے شادمان چوک میں نامعلوم افراد کی فائرنگ سے ہلاک ہو گئے۔ چنانچہ جب 1974ء کا اختتام ہوا تو ملکی حالات بے حد کشیدہ ہو چکے تھے۔ 1975ء کا آغاز بھی خوشگوار نہیں تھا۔

حیات محمد خان شیر پاؤ کا قتل

8 فروری 1975ء کو صوبہ سرحد میں پیپلز پارٹی کی حکومت کے سینئر وزیر اور پیپلز پارٹی سرحد کے صدر حیات محمد خان شیر پاؤ پشاور یونیورسٹی میں منعقدہ ایک تقریب میں بم

دھماکے کے نتیجے میں ہلاک ہو گئے۔ پیپلز پارٹی کی قیادت نے فوری ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے نیپ کے تمام سرکردہ رہنماؤں کو شیر پاؤ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی نیپ پر پابندی عائد کر دی۔ پولیس نے ملک بھر میں نیپ کے دفاتر سیل کر دیئے۔ پارٹی کی املاک اور فنڈز کو ضبط کر لیا اور پارٹی سرگرمیوں کو ملکی سالمیت کے منافی قرار دے دیا گیا۔ نیپ کے خلاف سپریم کورٹ میں ریفرنس دائر کرنے کا اعلان بھی ہوا۔ پیپلز پارٹی نے اس موقع کو نیپ کے خلاف استعمال کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ پی پی پی نے اپنی اکثریت کے زور پر آئین میں تیسری ترمیم منظور کروالی جس کے باعث حکومت کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ کسی بھی جماعت پر پابندی عائد کر سکتی ہے اس ترمیم کا سہارہ لیتے ہوئے ہی نیپ کو خلافِ قانون قرار دینے اور اس کے دفاتر سربمہر کرنے کا حکم جاری کیا گیا۔ گرفتار کئے جانے والے رہنماؤں میں خان عبدالولی خان، ارباب سکندر خان خلیل، غوث بخش بزنجو، عطا اللہ مینگل، نواب خیر بخش مری در متعدد دوسرے شامل تھے۔ جون 1975ء میں نیپ پر پابندی کو جائز قرار دلوانے کے لئے حکومت نے سپریم کورٹ سے رجوع کر لیا الزام لگایا گیا کہ گرفتار شدگان اور ان کی پارٹی پاکستان کو توڑنے اور ملک دشمن سرگرمیوں میں مصروف تھی۔

سپریم کورٹ کی کارروائی

اس مقدمے میں استغاثہ کی نمائندگی اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار نے کی جب کہ نیپ کا دفاع محمود علی قصوری کر رہے تھے۔ مقدمے کی کارروائی تین ماہ تک چلتی رہی۔ 30اکتوبر کو مقدمہ کا فیصلہ سناتے ہوئے سپریم کورٹ نے قرار دیا کہ نیپ پر لگنے والی پابندی جائز ہے۔ اس کے ساتھ ہی پارٹی کے مرکزی وصوبائی رہنماؤں کو اسمبلیوں کی رکنیت کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔ نیپ کی مرکزی قیادت پہلے ہی جیلوں میں تھی۔ نیپ پر پابندی نے ایک زبردست سیاسی خلاء پیدا کر دیا۔ اس سے پوری پارٹی کے بکھر جانے کا اندیشہ تھا۔ خصوصاً نیپ کے دوسرے اور تیسرے درجے کی صفوں میں جو لوگ گرفتاری سے بچ گئے تھے وہ

ایک متبادل سیاسی جماعت کے قیام پر غور کرنے لگے۔

نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کا قیام

کالعدم نیپ کے ان کارکنوں نے ایک جگہ جمع ہوکر قومی اسمبلی کے رکن اور نیپ کے ہمدرد شیر باز مزاری سے رابطہ کیا۔ اس رابطے کے نتیجے میں نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی (این ڈی پی) کا قیام عمل میں آگیا۔ بی ایم کٹی کے مطابق ایک پانچ نکاتی ایجنڈا تیار کرکے این ڈی پی کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ نئی سیاسی جماعت کے لئے ایجنڈے کے نکات مندرجہ ذیل تھے:

1۔ جماعت قرآن وسنت کے خلاف کسی قانون کی حمایت نہیں کرے گی

2۔ جماعت جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کو ختم کرنے میں جدو جہد کرے گی اور کسانوں، صنعتی کارکنوں اور تمام مزدور طبقے کے استحصال کو ختم کردے گی

3۔ جماعت جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کے لئے پوری جدو جہد کرے گی تاکہ آزادانہ انتخابات کے تحت عوام کی نمائندگی رکھنے والی جماعت ان کے بنیادی حقوق اور شہری آزادی کی پاسبانی کر سکے اور جمہوری طریق کار سے 1973ء کے آئین کے تحت ایمرجنسی ہٹائی جائے۔

4۔ جماعت ایک آزادانہ اور غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی کو ترقی دے گی۔ تمام فوجی معاہدوں کی مخالفت کرے گی اور پاکستان کی سرزمین پر غیر ملکی فوجی اڈوں کی اجازت نہیں دے گی اور ان تمام اقوام کی حمایت کرے گی جو کسی قسم کے استحصال اور ظلم کا شکار ہیں اور جماعت تمام امن پسند ممالک خصوصاً ہمسایہ ممالک، اسلامی ریاستوں اور تھرڈ ورلڈ ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرے گی۔

5۔ جماعت مذہب، رنگ ونسل، جنس یا خطے کے امتیاز کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تمام لوگوں کو برابری کے حقوق دلوانے کی جدو جہد کرے گی۔ جماعت خارجہ امور، دفاع اور مواصلات کے شعبہ جات کے علاوہ باقی تمام شعبے صوبوں کو دے گی اور

صوبوں کی تشکیل نو کرے گی کیوں کہ موجود صوبے برطانوی حکومت نے اپنے انتظامی مقاصد کی خاطر قائم کئے تھے۔

بی ایم کٹی بتاتے ہیں کہ محمد رکن الدین (م۔ر) حسان نے پارٹی کے منشور کی ڈرافٹنگ میں بھرپور حصہ لیا تھا ان کے ساتھ منشور کی تیاری میں خود کٹی صاحب بھی شامل رہے۔ خصوصاً منشور کی انگریزی ڈرافٹنگ میں۔

نواز بٹ این ڈی پی کے قیام کی پہل کاری کے سلسلے میں تفصیلی کہانی سناتے ہیں:

مزدور، طلباء کسان رابطہ کمیٹی

''نیشنل عوامی پارٹی کے غیر قانونی قرار دیئے جانے اور قیادت کی گرفتاری کے فوراً بعد کراچی سے رابطہ کمیٹی وجود میں آگئی تھی جس کے صدر ڈاکٹر اعزاز نذیر تھے۔ اگر میری یاداشت درست ہے اس کے سیکرٹری غالباً سیف خالد تھے۔ رابطہ کمیٹی میں نیپ سے وابستہ مزدوروں، کسان، طلباء اور سیاسی نمائندے شامل تھے۔ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے قیام کی پہل کاری میں رابطہ کمیٹی کا بنیادی کردار تھا۔ جس میں سیف خالد اور میں پیش پیش تھے اور ہم دونوں سب سے پہلے اسلام آباد آ کر مزاری صاحب سے ملے۔ مزاری قومی اسمبلی کے رکن تھے اور انہوں نے دو کمروں کا ایک سوٹ لے رکھا تھا۔ اسی کمرے میں سیف خالد اور میں ان کے پاس پہنچے اور نیپ کی جگہ نئی پارٹی بنانے کی بات کی۔ بلوچستان سے نیپ کے سینیٹر ہاشم غلزئی بھی موجود تھے۔ ابھی ہماری گفتگو جاری تھی کہ اوپر سے محمود علی قصوری آگئے۔ ان کے ہم دونوں سے اچھے مراسم تھے لیکن انہیں کمیونسٹوں سے خاصا پرہیز تھا۔ قصوری صاحب ہمیں دیکھتے ہی شیر باز مزاری سے کہنے لگے:

''یہ دونوں کمیونسٹ ہیں ان سے بچ کر رہنا۔'' بات آئی گئی ہوگئی۔ انہوں نے قصوری صاحب کی بات کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ ہم نے مزاری صاحب سے پارٹی کی تشکیل

کا معاملہ طے کیا۔ پارٹی کا نام تجویز کیا۔ ان دنوں قومی جمہوریت کا چرچا تھا چنانچہ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی نام تجویز ہوا اور سیف خالد مجھے لے کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔''

ابھی یہ لوگ اسلام آباد میں ہی تھے کہ چند روز بعد وزارت قانون نے ولی خان، بزنجو اور دیگر گرفتار شدگان کو اڈیالہ جیل سے بلا کر وزارت کے ایک بڑے ہال میں جمع کیا۔ وہاں سیف خالد اور نواز بٹ بھی پہنچ گئے۔ قیدیوں کی وجہ سے ان کی بھی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ نواز بٹ ولی خان سے جا کر ملے۔ انہوں نے بزنجو صاحب سے ملاقات کی۔ شیر باز مزاری بھی وہیں موجود تھے وہ بزنجو اور ولی خان سے پارٹی کے نام کی منظوری لے چکے تھے۔ نواز بٹ نے بزنجو صاحب سے مزاری کی شکایت کی تو بزنجو صاحب نے سیف خالد اور نواز بٹ کی طرف اشارہ کر کے شیر باز مزاری سے کہنے لگے

''یہ لوگ ہیرے ہیں۔ ان کو چھوڑ کر پارٹی نہ بنانا۔''

سپریم کورٹ ریفرنس

سپریم کورٹ میں نیپ پر جو الزامات عائد کئے گئے ان میں سے بعض یہ تھے:

1۔ نیپ قومیتوں کے مسئلہ کو ہوا دے کر پاکستان کی قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی کوششوں میں لگی ہوئی ہے۔

2۔ اسے پاکستان کی غیر ملکی دشمن طاقتوں سے مالی امداد اور حمایت حاصل رہی ہے۔

3۔ آئین، قانون کی عملداری اور جمہوری اداروں کو تباہ کرنے کے لئے یہ جماعت تشدد کا پرچار کرتی رہی ہے۔

4۔ پختونستان اور آزاد بلوچستان کے نام پر غیر ملکی طاقتوں سے امداد حاصل کر کے وہ پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی کوششوں میں لگی رہی ہے۔

5۔ پاکستان دشمن غیر ملکی طاقتوں کی مدد سے اس نے بڑے پیمانے پر تخریبی اور دہشت پسند سرگرمیوں کو منظم کیا۔

30 اکتوبر 1975ء کو سپریم کورٹ نے حکومت کی جانب سے جاری ہونے والے حکم کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے فیصلے میں لکھا:

''۔۔۔اس نتیجہ پر پہنچے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ نیشنل عوامی پارٹی پولیٹکل پارٹیز ایکٹ (III-1962) کی دفعہ 6 کی ذیلی دفعہ 1 کے تحت کالعدم قرار دیئے جانے کی مستوجب ہے کیونکہ یہ پاکستان کی سالمیت وخودمختاری کے منافی سرگرمیوں میں ملوث رہی ہے۔''

یہ پہلا موقع تھا کہ کسی حکومت نے ایک سیاسی جماعت کو کالعدم قرار دینے کے لئے طاقت استعمال کی تھی اور یہ بھی کہ سپریم کورٹ نے اس نوع کے مقدمہ کا فیصلہ دیا تھا۔ بعض قانون دانوں نے اس فیصلہ پر نقطہ چینی کی۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کا ایک وفد پاکستان آیا اور فیصلہ کے بارے میں اپنے تحفظات پیش کئے جو درج ذیل سے متعلق تھے۔

- سپریم کورٹ کا اختیار سماعت اور آئین کے آرٹیکل 17 کے تحت تنظیم سازی کے حق کی ضمانت کے خلاف انتظامیہ کی پابندیاں، صفائی کی جانب سے مقدمہ کی تیاری اور صفائی کے وکلاء کی عدالتی کارروائیوں کے دوران موجودگی۔
- گواہی کے بعض قاعدوں میں تبدیلیاں، خصوصاً جن کا تعلق مزید جرح سے تھا جن میں غیرملکی ریڈیو اور اخباری رپورٹیں، اندرون ملک کی اخباری رپورٹیں جن کے معاملہ میں پابندیاں عائد ہیں اور جن کے باعث یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ ان پر اعتماد بھی کیا جا سکتا ہے، خصوصی عدالتوں کی جانب سے بم دھماکوں کے کئی مقدمات کے فیصلے شامل ہیں۔
- نیپ کے خلاف اس الزام میں کہ یہ علیحدگی کے لئے مسلح کارروائیاں کر رہی تھی، اس لئے ''پاکستان کی سالمیت اور تحفظ کے اس منافی اقدام'' کے سلسلہ میں شہادت کی حیثیت۔

ان نکات کے ذیل میں ایمنسٹی انٹرنیشنل نے نیشنل عوامی پارٹی کو کالعدم قرار دینے اور اس پر سپریم کورٹ کے فیصلے کو اس طرح بیان کیا:

1۔ سپریم کورٹ نے ایک ایسے مقدمہ میں جس نے ایک پوری سیاسی جماعت کی تقدیر

کا فیصلہ کرنا تھا، معمول کے بعض قواعد تبدیل کر کے عام قاعدوں کے مطابق شہادتیں قلمبند نہیں کیں۔ یہ طریق کار خاصہ تشویش ناک ہے۔علاوہ ازیں عدالت نے ایسی شہادت پر اپنے نتائج وضع کئے جو یہ ثابت نہیں کرتی کہ نیپ پاکستان کی سالمیت وتحفظ کے منافی کام کر رہی تھی۔

2۔ اگر نیپ لیڈروں اور ارکان کی تقریریں اور اقدامات ''پاکستان کی خود مختاری و سالمیت کے منافی اقدام'' اور ''بغاوت'' کے ذیل میں آتی ہیں جیسا کہ فیصلہ میں دعویٰ کیا گیا ہے تو پھر ان اقدامات اور تقریروں پر الگ الگ مقدمات بننے چاہئیں تھے اور پارٹی کے خلاف فیصلہ سے پہلے ان انفرادی مقدمات کے ضابطہ تعزیرات کی عام دفعات کے مطابق عدالتوں میں فیصلے ہونے چاہئیں تھے۔ جنہیں پارٹی کے خلاف فیصلہ میں استعمال کیا جانا چاہئے تھا۔

3۔ متذکرہ ریفرنس کے جواب میں نیپ کی ورکنگ کمیٹی کے اٹھائیس ارکان نے صفائی کا جو تحریری بیان دائر کیا، اس میں اس سے انکار کیا گیا تھا کہ ان کی جماعت پاکستان کی سالمیت اور خود مختاری کے منافی حرکتوں میں مصروف تھی۔ بیان میں اس سے انکار کیا گیا کہ نیپ کی صوبائی حکومت نے اپنی آئینی ذمہ داریوں سے انحراف کیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ نیپ نے کبھی بھی کسی بھی وقت چار قومی نظریہ کا پرچار نہیں کیا۔ صفائی کے بیان میں کہا گیا کہ پارٹی نے آئین کے تحت پاکستان کے مختلف علاقوں کے لوگوں کے لسانی وثقافتی حقوق کے تحفظ اور فروغ کی بات کی ہے۔ کسی غیر ملکی حکومت سے امداد حاصل نہیں کی اور اس کا تشدد کی کارروائیوں پر کبھی یقین نہیں رہا۔ ریفرنس کی درخواست میں جن واقعات کا ذکر کیا گیا تھا، اس بیان میں ان کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کیا گیا۔

پارٹی کے اس وقت کے سربراہ ولی خان کا تحریری بیان انہی خطوط پر تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔ ''بعض افراد کے خلاف شہادت کو استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن پارٹی کے بعض

ارکان کے بیان اور تقریروں پر پارٹی کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا، چاہے وہ کتنے ہی اعلیٰ عہدوں پر کیوں نہ ہوں۔" ولی خان نے کہا کہ پارٹی کے سابق سیکرٹری جنرل اجمل خٹک کے مقدمہ اور عبدالغفار خان کا ضمیموں میں حوالہ غیر متعلقہ ہے کیوں کہ اول الذکر پارٹی کے جنرل سیکرٹری نہیں رہے اور مؤخر الذکر کا 1964ء کے بعد سے پارٹی سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس الزام کے متعلق کہ نیپ پاکستان مخالف جماعت ہے۔ ولی خان نے کہا کہ صوبوں کے لئے زیادہ خودمختاری کے حوالہ سے نیپ کا کیس یہ ہے کہ اس جماعت کے نزدیک پاکستان میں ایک قوم رہتی ہے جو پاکستانی قوم ہے۔ یہ پاکستانی قوم قومیتوں کا مجموعہ ہے جن کی اپنی الگ الگ زبان اور ثقافت ہے ان دو باتوں میں کوئی تضاد نہیں مگر یہ قومیتیں پھولوں کی طرح ہیں جن کے الگ الگ رنگوں اور خوشبوؤں سے گلدستہ بنتا ہے۔ ان کے اختلاف میں ایک اتحاد کی شکل ہے۔

بلوچستان کے برطرف گورنر غوث بخش بزنجو نے اپنے تحریری بیان میں ان سے انکار کیا کہ نیپ کا کسی غیر ملکی حکومت سے کوئی رابطہ ہے یا اس نے بغاوت یا شورش بر پا کرنے، تخریبی یا تشدد کی کارروائیوں کے لئے جن کا استغاثہ نے ذکر کیا ہے، کوئی امداد حاصل کی ہے۔

سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد نیپ لیڈروں کے خلاف مقدمہ چلانے کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ 15 اپریل 1976ء کو ایک خصوصی عدالت میں مقدمہ کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ حکومت کہتی تھی کہ سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد حیدر آباد میں مقدمہ چلانا ناگزیر ہو گیا تھا۔ 8 مئی 1976ء کے نیویارک ٹائمز میں حکومت کا عزم اس طرح بیان کیا گیا:

"ہم نے تہیہ کر کر رکھا ہے کہ پاکستان کی سالمیت کو کسی خطرہ سے دو چار نہیں ہونے دیں گے۔"

مسلح کارروائیوں کے ساتھ ساتھ بھٹو حکومت نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) کی سیاسی قیادت کو کچلنے پر بھی تلی ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں حیات محمد شیر پاؤ کے قتل کو بہانہ بنایا گیا

تھا۔ 10فروری 1975ء کو اس واقعہ کے فوراً بعد حکومت نے نیپ کو کالعدم قرار دے کر ایک سرکاری اعلان کے ذریعے اس کے فنڈز ضبط کرلئے۔ اسی روز قانونی تقاضوں کے پیش نظر حکومت نے یہ مقدمہ سپریم کورٹ میں پیش کر دیا۔

حیدر آباد سازش مقدمہ

حیدر آباد میں خصوصی عدالت ضابطہ فوجداری کے ترمیمی آرڈیننس (خصوصی عدالت) مجریہ 20دسمبر 1976ء کے تحت قائم ہوئی اور فوراً بعد اپریل1976ء میں اس نے کارروائی شروع کر دی۔ کالعدم جماعت کے لیڈروں کو گرفتار کیا جا چکا تھا۔ ان میں سینیٹ کے تین ارکان ہاشم غلزئی، حسین شاہ اور غلام احمد بلور اور پارٹی کے دوسرے نمایاں رہنما شامل تھے۔ ولی خان سمیت دوسرے رہنماؤں کو پہلے ہی گرفتار کیا جا چکا تھا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ کے مطابق (23اپریل، 12مئی 1976ء) 10فروری 1975ء کو ایک آرڈیننس نافذ ہوا جس کے تحت قومی وصوبائی اسمبلیوں کے ارکان کو اس استحقاق سے محروم کر دیا گیا تھا کہ سیشن کے دوران انہیں گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔ اس آرڈیننس نے ولی خان کی گرفتاری کو ''قانونی'' بنا دیا۔ انہیں ڈیفنس آف پاکستان رولز کی دفعہ 32 کے تحت امتناعی نظربندی میں رکھا گیا۔ بعد میں ان کے خلاف ضابطہ تعزیرات پاکستان اور دھماکہ خیز اشیاء کے ایکٹ کے تحت الزامات عائد کر دیئے گئے۔ نیپ کے تین بلوچ رہنماؤں میر غوث بخش بزنجو، سابق گورنر بلوچستان، عطا اللہ مینگل سابق وزیر اعلیٰ بلوچستان اور خیر بخش مری صدر بلوچستان نیشنل عوامی پارٹی کے خلاف بھی حیدر آباد کی خصوصی عدالت میں فرد جرم عائد کی گئی۔ ان تینوں کے معاملہ کو ایمنسٹی انٹرنیشنل حیدرآباد سپیشل کورٹ سے پہلے ہی ضمیر کے قیدی کے طور پر لے چکی تھی۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ یہ رہنما کوئی مقدمہ چلائے بغیر 16اگست 1973ء کو گرفتاری کے بعد طویل عرصہ جیل میں گزار چکے تھے اور اس وقت تک استغاثہ کی جانب سے ان کے خلاف کوئی ثبوت پیش نہیں کئے گئے تھے۔

10 جون 1976ء کو اپوزیشن کے دوسرے بڑے لیڈروں کو بھی خصوصی عدالت میں پیش ہونے والے ان چوالیس رہنماؤں کے ساتھ شامل کرنے کا اعلان ہوا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کیوں کہ قبل ازیں جاری ہونے والے سیاسی بیانات کے مطابق اس خصوصی عدالت کو صرف نیپ کی قیادت کے خلاف ہی الزامات کا فیصلہ کرنا تھا۔ جو دوسرے اپوزیشن لیڈر گرفتار کر کے اس خصوصی عدالت میں پیش کئے جانے والے تھے، ان میں معراج محمد خان بھی شامل تھے۔ پیپلز پارٹی کے اس سابق وزیر کو ''قابل اعتراض تقریریں'' کرنے کے الزام میں چار سال قید کی سزا دی گئی تھی۔ علی بخش تالپور کو جو دسمبر 1975ء میں پیپلز پارٹی سے مستعفی ہوئے، 26 مئی 1976ء کو واضح الزامات کے بغیر گرفتار کیا گیا اور اب انہیں بھی اس مقدمہ میں شامل کر لیا گیا۔ معروف اپوزیشن لیڈروں کی گرفتاری کے متعلق دریافت کرنے پر اپریل 1976ء میں وزیر قانون نے سینٹ میں بتایا کہ ان افراد کو ''پاکستان کے خلاف جنگ لڑنے، اس مقصد کے لئے ہتھیار جمع کرنے اور اس ملک کے قیام کی مذمت اور اس کی سالمیت کے منافی کارروائیوں کے الزامات کا جواب دینے کے لئے گرفتار کیا گیا ہے۔ اگست 1976ء میں اٹارنی جنرل نے مطلع کیا کہ ان کے خلاف الزام ہے کہ انہوں نے بلوچستان اور پختونستان کی علیحدہ مملکتوں کے قیام کے لئے پاکستان کو توڑنے کی سازش کی ہے۔

حیدر آباد کی خصوصی عدالت ہائی کورٹ کے تین ججوں پر مشتمل تھی۔ اپریل 1976ء میں اس مقدمہ کی سماعت شروع ہونے کے بعد عدالت کے صدر سمیت دو ججوں کو لاہور ہائی کورٹ اور پشاور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بنایا جا چکا تھا (لاہور ہائی کورٹ کا جس جج کو چیف جسٹس مقرر کیا گیا، انہیں یہ ترقی آٹھ دوسرے ججوں کو نظر انداز کر کے دی گئی) اب مسٹر جسٹس مشتاق قاضی باقی رہ گئے تھے۔ جنہیں اس خصوصی عدالت کا چیئرمین مقرر کر دیا گیا۔

مقدمہ کی سماعت حیدر آباد جیل میں سخت حفاظتی انتظامات میں شروع ہوئی۔ حکومت کا دعویٰ تھا کہ مقدمہ کی کارروائی عام لوگوں کے لئے کھلی ہے مگر حقیقت یہ تھی کہ پچپن

ملزموں کے اہل خانہ اور دوستوں کے لئے صرف چالیس نشستوں کا انتظام تھا اور اس کے لئے خصوصی اجازت حاصل کرنی پڑتی تھی۔

خان عبدالولی خان نے اپنے بیان میں واضح کیا کہ ان پر سازش اور بغاوت کے انتہائی سنگین الزامات عائد کئے گئے ہیں مگر جیل حکام کے عدم تعاون کے باعث وہ اپنے وکیل کے ساتھ ابتدائی رابطہ بھی قائم نہیں کر سکتے۔ یہ حقیقت تھی کہ ملزمان اپنے دفاع کے سلسلہ میں ہر سہولت کے حصول کے لئے جیل حکام کے رحم و کرم پر تھے۔ مقدمہ کی کارروائی جولائی 1977ء تک جاری رہی جب جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کو ہٹا کر مارشل لاء نافذ کر دیا۔ انٹیلی جنس کے سابق ڈائریکٹر اے پی اعوان کا کہنا ہے کہ 6 دسمبر 1977ء کو پندرہ ملزموں کی جانب سے ضمانت کی درخواست دائر کی تھی۔ اس وقت تک جو شہادتیں پیش کی جا چکی تھیں ان کی بنیاد پر ٹربیونل نے قرار دیا:"

"ان اعتراضات کے مطابق تمام ملزموں کو مجرمانہ سازش کا مجرم نہیں گردانا جا سکتا۔"

"اس کی بنیاد پر ملزموں کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا چند روز بعد عام معافی کے تحت سارے ملزم چھوڑ دیئے گئے۔

سیف خالد اس مقدمہ میں ملوث نہیں کئے گئے لیکن واپڈا بم کیس میں، جب ولید میر لاہور قلعے میں تشدد اور ایذا رسانی سے گزر رہے تھے، سیف بھی گرفتار ہو کر قلعہ میں پہنچا دیئے گئے۔ اگرچہ وہ زیادہ عرصہ گرفتار نہیں رہے لیکن چند دنوں کے لئے ہی سہی۔ انہوں نے بھی قلعے کی روایتی ایذا رسانی کا مزہ چکھا۔

کراچی میں مزدور، طلبا، کسان رابطہ کمیٹی:

جب یہ کمیٹی بنی تو جلد ہی اسے کل پاکستان بنیادوں پر قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ تنویر شیخ بتاتے ہیں کہ اس کام میں سیف خالد بہت سرگرام رہے۔ یہ دراصل کمیونسٹ پارٹی کا کھلا پلیٹ فارم تھا۔ اسی پلیٹ فارم سے سندھ اور پنجاب سے مظاہرے منظم کئے

گئے۔ پنجاب کے مظاہروں میں سیف خالد پیش پیش تھے۔ تنویر شیخ مزید بتاتے ہیں کہ این ڈی پی کے منشور سے سوشلزم اور سیکولرازم کو نکال دیا گیا، اگرچہ سوشلزم اور سیکولرازم، نیپ میں بھی نعرے کی حد تک ہی تھے۔ لیکن این ڈی پی نے انہیں نعرہ بنانا بھی گوارہ نہ کیا۔ بی ایم کٹی اس سلسلے میں کارکنوں کے تحفظات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نیپ کے کالعدم ورکرز نے 'این ڈی پی' میں شمولیت تو اختیار کر لی تھی لیکن شیر باز مزاری اور بیگم نسیم ولی خان کی مہیا کردہ قیادت کے بارے میں ان کے تحفظات تھے، یہ خاص طور کمیونسٹ ارکان اور ان کے ہمراہیوں کا مسئلہ تھا کہ وہ مزاری کے سیاسی ماضی اور حال کو ہضم نہ کر پا رہے تھے۔ ان کو بھٹو حکومت کے بارے میں ''نظریاتی'' اختلاف تھا۔ ان کی ناامیدی کی اہم وجہ بھٹو کا اپنی وضع کردہ پالیسی سے انحراف اور اپنی جماعت اور حکومت میں جاگیرداروں کی دوبارہ شمولیت تھا۔ مزاری اور نسیم ولی گروہ کا بھٹو حکومت کے خلاف مخاصمانہ رویہ ان کی ذاتی پسند و ناپسند کے باعث تھا۔ یہ رویہ نیپ کے بھٹو مخالف رہنماؤں بشمول عبدالولی خان جیل میں نشو نما پا چکا تھا۔ انکی بھٹو کے خلاف نفرت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ وہ بھٹو کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے ہر حیلہ حتیٰ کہ فوج کی مداخلت کے لئے بھی تیار تھے۔ ہمارے پاس جو اطلاعات جیل سے آتی تھیں ان سے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ نیپ رہنماؤں میں تقسیم پیدا ہو چکی ہے۔

''تین گروہ ابھر کر سامنے آ گئے تھے، ایک وہ جس میں عبدالولی خان اور دوسرے صوبہ سرحد کے نیپ رہنما شامل تھے وہ بھٹو کو ہر قیمت پر اقتدار سے ہٹانا چاہتے تھے۔ سردار مینگل، نواب خیر بخش مری اور دیگر بلوچستان کے رہنماؤں کا بھی یہی مؤقف تھا۔ دوسرا گروپ میر غوث بخش بزنجو اور بہت سے دوسرے صوبوں کے ممبران پر مشتمل تھا وہ بھی بھٹو کی پالیسیوں کے سختی سے مخالف تھے لیکن وہ فوجی جرنیلوں کو اس تبدیلی کے لئے بلانا مناسب نہیں گردانتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ بھٹو کا احتساب کرنا ہے تو وہ منتخب شدہ پارلیمنٹ کے ذریعہ ہونا چاہئے۔ اس گروہ کی 'پی این اے' تحریک کے خلاف بھی تحفظات تھے کیوں کہ انہیں شک تھا کہ پی این اے کے کچھ ارکان کا مغربی سامراجی ایجنسیوں کے

ساتھ براہِ راست رابطہ تھا اور مڈل ایسٹ کے حکمران بھٹو کی مخالفت کے لئے ان کی استعانت کر رہے تھے۔ تیسرا گروپ اپنے دوسرے دو گروہوں کے سینئر ارکان کے احترام میں غیر فعال تھا۔''

''ہر شخص بخوبی باخبر تھا کہ جب پی این اے تحریک نقطہء عروج پر تھی تو اس وقت جنرل ضیاء نے حیدر آباد جیل میں عبدالولی خان اور کچھ دوسرے نیپ رہنماؤں سے کافی ملاقاتیں کیں۔ این ڈی پی کے لیڈر شیر باز مزاری اور بیگم نسیم ولی خان بھی جرنیلوں کے ساتھ پیہم رابطے میں تھے۔ درحقیقت تمام پی این اے، این ڈی پی قیادت پوری طرح جرنیلوں کے ساتھ تھی۔ انہوں نے تو یہاں تک عوام میں بیانات دینا شروع کر دیئے کہ اس وقت ضرورت بھٹو کو اقتدار سے ہٹانے کی ہے۔ انتخابات تو بعد میں بھی کرائے جا سکتے ہیں۔ ان بیانات سے بلوچستان نیپ کے رہنماؤں نے شدید ردعمل ظاہر کیا محمود عزیز کرد، بزن بزنجو اور امیر الملک مینگل جو ابھی ابھی مچھ جیل سے رہا ہوئے تھے وہ کراچی میں فصیح سالار، یوسف مستی خان و دیگر پارٹی کے رفقاء اور مجھ سے ملے اور میر صاحب سے جیل میں ملاقات کر کے اور ان کی رضامندی حاصل کر کے ایک اہم بیان دیا کہ مزاری اور بیگم نسیم ولی کے ایسے اعلانات آرمی کو دعوت دینے اور اقتدار ان کے حوالے کر دینے کے مترادف ہے۔

''لہٰذا اس کے نتیجے میں 'این ڈی پی' کے سرکردہ بائیں بازو کے لوگ جو بھٹو کے خلاف جرنیلوں کی مداخلت کو ہضم نہیں کر پا رہے تھے وہ یا تو 'پی این اے' کی سیاست کے مخالف رہے یا اس کے خلاف سرگرم ہو گئے بلکہ کچھ ارکان کو اس عمل کے باعث بھٹو سے ہمدردی ہو گئی۔''

سیف خالد اور نواز بٹ نے این ڈی پی کے قیام میں سر توڑ کوششیں کی تھیں، دونوں نظریاتی اعتبار سے کافی سخت روّیے کے حامل تھے۔ خصوصاً سیف خالد تو نظریاتی کجرویوں کو برداشت نہیں کرتے تھے اور غصے میں آجاتے تھے۔ اس لئے وہ سوشلزم اور سیکولرازم کے معاملے پر سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ پھر بھی وہ پارٹی کے اندر

رہتے ہوئے جدو جہد کرنے کے حق میں تھے ان کے بھتیجے شہباز اقبال کے لفظوں میں ''نیپ کی اعلیٰ قیادت چونکہ جیلوں میں تھی اس کے باعث این ڈی پی شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی اور ولی خان کے اشارے پر بیگم نسیم ولی اور مزاری اسے پی این اے (پاکستان قومی اتحاد) میں شامل کر چکے تھے لیکن چاچا سیف کا مؤقف تھا کہ انہیں یہ لڑائی پارٹی کے اندر رہ کر ہی لڑنی چاہئے اور ایک علیحدہ پارٹی نہیں بنانی چاہئے کیونکہ اس سے وہ تنہائی کا شکار ہو جائے گی۔''

شہباز اقبال مزید بتاتے ہیں کہ کیمونسٹ پارٹی میں نیشنل عوامی پارٹی کے مسئلے پر ہمیشہ بحث رہی تھی۔ چاچا (سیف) کا مؤقف تھا کہ کیمونسٹ پارٹی پر پابندی کے بعد نیشنل عوامی پارٹی نے جمہوری جدو جہد کو آگے بڑھایا تھا چنانچہ جب این ڈی پی سے نکل کر نیشنل پروگریسو پارٹی (این پی پی) بنی اور چاچا سیف کو اس کا سربراہ بنایا گیا تو یہ فیصلہ ان کی زندگی کا انتہائی مشکل فیصلہ تھا۔''

1975ء کا سال تیزی سے اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہا تھا او 1976ء کا آغاز ہو رہا تھا، پے در پے ایسے واقعات ہوئے جنہوں نے پورا سیاسی منظر نامہ بدل دیا۔ 11 نومبر 1975ء کو بھٹو حکومت نے اکثریت کے بل پر چوتھی آئینی ترمیم منظور کی جس کے نتیجے میں مقننہ اور عدلیہ کو الگ الگ نہ کیا جا سکا۔ اسی طرح اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کی مدتِ ملازمت اور ریٹائرمنٹ کے عرصے میں تبدیلیاں کر دی گئیں۔ ہائی کورٹس کو پابند کر دیا گیا کہ وہ امتناعی نظر بندی کی ضمانت نہیں منظور کر سکیں گی۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں اقلیتوں کو نمائندگی دینے اور بعض ارکان کی رکنیت ختم کرنے کے فیصلے کے گئے۔ یہ آمرانہ فیصلے تھے۔ ابھی ان فیصلوں کی تلخی کا خاتمہ نہیں ہوا تھا کہ 6 فروری 1976ء کو ایک اور سانحہ رونما ہو گیا۔ نیپ کے ممتاز رہنما اور بلوچستان کے سابق وزیر اعلیٰ عطا اللہ مینگل کے صاحبزادے اسد مینگل اغوا ہو گئے۔ اپنی حکومت کے خاتمے کے بعد بھٹو نے الزام لگایا کہ اسد مینگل اور ان کے دوست کو فوج نے اٹھایا اور قتل کیا ہے۔ بھٹو پے در پے غلطیاں کر رہے تھے۔ انہوں نے فروری 1976ء میں ٹکا خان کی ریٹائرمنٹ کے بعد لیفٹیننٹ

جنرل ضیاء الحق کو ترقی دے کر نیا چیف آف سٹاف مقرر کر دیا۔ ضیاء سینیارٹی کی درجہ بندی میں آٹھویں نمبر پر تھے۔ مارچ 1976ء میں بھٹو نے فرانس سے ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کا معاہدہ کیا جو امریکہ اور کیسنجر کی شدید ناراضگی کا باعث بنا۔ اگست 1976ء میں ہنری کسنجر نے پاکستان کا دورہ کرتے ہوئے بھٹو کو نشانِ عبرت بنانے کی دھمکی دی۔ ستمبر 1976ء میں بھٹو نے پانچویں آئینی ترمیم منظور کروائی جس نے عدلیہ سے اس کی آزادی چھین لی اور انتظامیہ کی عدلیہ پر گرفت مزید مضبوط ہوگئی۔ ان واقعات سے بھٹو اپنے آمرانہ رویوں کے باعث تنہا ہوتے چلے گئے۔

سیف خالد کا کہنا تھا کہ بھٹو صاحب کی یہ تمام سرگرمیاں پاکستان میں جمہوریت کو تباہ کر دیں گی۔ ان کا خیال تھا کہ بھٹو کے یہ اقدامات خود ان کے مفاد میں نہیں ہیں۔ انتظامیہ کے ہاتھوں عدلیہ کو کمزور کر کے وہ خود بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔ سیف خالد کے اس انتباہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ پاکستان کے سیاسی حالات کو کتنی اچھی طرح جانتے اور ان کی پیش بینی کس قدر درست تھی۔

اسی عرصہ میں مزدور کسان پارٹی کی کانفرنس لائل پور میں سیف کے گھر پر منعقد ہوئی میں میں میجر اسحاق اور غلام نبی کلو موجود تھے۔ حالانکہ روسی چینی جھگڑے کے وقت سے سیف اور میجر اسحاق میں سیاسی دوری رہی لیکن ذاتی دوستی ویسے ہی برقرار تھی اور 70ء کی دھائی کے وسط تک بہت سے مسائل پر اُن کا نکتہ نظر قریب آیا تھا۔

کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی دوسری کانگریس

سیف خالد کی زندگی میں کمیونسٹ پارٹی کی دوسری کانگریس کا انعقاد اہم ترین واقعات میں سے ایک واقعہ تھا۔ پارٹی کی زیرِ زمین سرگرمیوں میں اس اعتبار سے کامیاب ترین تھی کہ تین روز تک جاری رہنے والی پارٹی کانگریس کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ سیف خالد کی زندگی کا یہ آخری اہم واقعہ تھا۔ اس کے بعد وہ جلد ہی بیمار پڑ گئے۔ بیماری کے باوجود اگرچہ لائلپور، لاہور اور کراچی میں ان سے وقتاً فوقتاً ملاقاتیں ہوتی

رہیں لیکن کانگریس کے موضوع پر کبھی بات نہ ہوئی۔ کانگریس کے دنوں میں میں جامشورو میں تھا لیکن مجھے بھی اس کانگریس کا پتہ نہ چل سکا۔ کانگریس فیڈرل بی ایریا کراچی میں عبدالوحید کے گھر پر منعقد ہوئی۔ شرکاء میں نمایاں شخصیات میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے سیکرٹری جنرل امام علی نازش امروہوی، سیف خالد، جمال نقوی، عبدالوحید، ڈاکٹر اعزاز نذیر، شمیم واسطی، تنویر شیخ، سائیں عزیز اللہ، جاوید شکور، صوفی عبدالخالق، خیر جان بلوچ، مختار باچہ، حسن رفیق، افراسیاب خٹک، مولا بخش چانڈیو، رانا حمید، شمیم اشرف ملک، چوہدری جمیل، کلثوم جمال، نسیم اشرف، اقبال سلطانہ، ڈاکٹر م۔ ر۔ حسان، نواز بٹ، رمضان میمن، مسعود احسن، صالحہ اطہر، ڈاکٹر منظور و دیگر شریک ہوئے۔

کانگریس کو خفیہ رکھنے کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ اسی بلڈنگ کے اوپر والے حصہ میں منصور سعید رہتے تھے انہیں بھی اس کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ یوں تھا کہ جو گھر کے اندر آگیا، اسے باہر جانے کی اجازت نہ تھی اور باہر سے کوئی غیر متعلقہ شخص اندر نہیں آسکتا تھا۔ کانگریس تین روز تک جاری رہی۔ عبدالوحید بتاتے ہیں کہ صرف وہ کھانا وغیرہ یا استعمال کی دیگر اشیاء لانے کے لئے باہر جا سکتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ گھر سے باہر دو کارکنوں کی حالات پر نظر رکھنے کی ڈیوٹی تھی اور ان دونوں کو ایک دوسرے کا پتہ نہ تھا۔ کانگریس کے اجلاسوں میں آزاد قومی جمہوریت، اس عہد میں سوشلزم کے فیصلہ کن قوت ہونے، مابعد بنگلہ دیش پاکستان کی صورت حال، پاکستانی سماج کی طبقاتی ساخت، پاکستان کے حکمران طبقات، پاکستان کے جمہوری اور محنت کش طبقات، جمہوری اور محنت کش طبقات کا مشترکہ مقصد اور سوشلزم کی جانب عبوری مرحلہ آزاد قومی جمہوریت کے لئے جدو جہد کا تیرہ نکاتی پروگرام، پاکستان کے مخصوص مسائل کے ضمن میں ناہموار معاشی ترقی، قومی حقوق کا سوال، ہندوستان کے ساتھ بہتر اور خوشگوار تعلقات اور تدابیر یا طریق کار کے حوالے سے بھرپور بحث ہوئی۔ آخر میں ایک تفصیلی سیاسی قرار داد منظور کی گئی۔

دستاویزات کے پیش لفظ میں سیکرٹری جنرل امام علی نازش نے بتایا کہ دوسری کانگریس اس قدر تاخیر سے اس لئے منعقد ہوئی کہ پاکستان کے حالات اس کی اجازت

نہیں دیتے تھے۔ کانگریس میں پاکستان کے ہر علاقے سے نمائندہ کمیونسٹ مندوبین شریک ہوئے۔ یہ مندوبین مزدور طبقہ، دانشور، نوجوان اور دیگر انقلابی طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں کم عمر نوجوانوں سے لے کر بزرگ تک شامل تھے۔ جیسا کہ کانگریس میں ہونا چاہئے تھا کہ نیا خون زیادہ ہو، نوجوان ساتھی نسبتاً زیادہ تعداد میں تھے۔ بقول سیکرٹری جنرل ''کانگریس کے اندر خلوص اور کامریڈ شپ کا ماحول پایا جاتا تھا اور بحث وتمحیص بے باکانہ اور سنجیدہ ہوئی۔

دستاویزات پر بھرپور بحث رہی اور پاکستان کی پارٹی کے ماضی کا جائزہ، تنقید اور خود تنقیدی کے مسلمہ لیننی اصولوں کی روشنی میں لیا گیا۔''

امید ظاہر کی گئی کہ ان دستاویزات کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ ملک کے متعدد مسائل، جن سے عوام دوچار ہیں کو کمیونسٹ کس نظر سے دیکھتے ہیں اور پارٹی ان کو حل کرنے کے لئے کیا لائحہ عمل مرتب کرتی ہے۔

حکمت عملی کی دستاویز میں پاکستان میں آزاد قومی جمہوریت کے لئے جدو جہد، 1960ء کے تھیسس اور تاریخ کی پیش قدمی کے ضمن میں مندرجہ ذیل نکات شامل تھے:

ا) 1968 میں پارٹی نے 1957ء کے 'امن منشور' اور 1960ء کے 81 پارٹیوں کے بیان میں بین الاقوامی صورت حال کے تجزیے کی روشنی میں جب اپنی حکمت عملی کی لائن بنائی اور پروگرام تیار کیا، اس وقت سے اب تک بین الاقوامی اور ملکی ہر دو سطح پر بہت سے ایسے واقعات پیش آچکے ہیں، جنہوں نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ان واقعات سے ''سوشلزم کے ہمارے عہد کے فیصلہ کن قوت بن جانے کے دعوے'' کی مزید توثیق ہوئی ہے۔ نوآبادیاتی راج کی آخری باقیات کو مٹایا جارہا ہے اور غیر سرمایہ دارانہ راہ ترقی اپنانے والے ملکوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ امریکی سامراج ویت نام چھوڑنے پر مجبور ہوا ہے۔ چلّی میں پیچھے ہٹنے کی باوجود جنوبی امریکہ میں امن جمہوریت ورسوشلزم کی تحریک آگے بڑھ رہی ہے۔ امریکی سامراج

اور اس کے پٹھو اسرائیل کے خلاف عربوں کی جدو جہد پھیل رہی ہے۔ مشرق وسطیٰ کے تیل پیدا کرنے والے ممالک نے تیسری دنیا کے ممالک کو یہ راستہ دکھایا ہے کہ وہ اپنے خام مال کے وسائل کو کیسے سامراج کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں۔ پرتگال میں تبدیلی سے نہ صرف افریقہ میں نسل پرستی کے مقدر میں موت لکھ دی گئی ہے۔ اور نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کا عمل تیز ہوا ہے۔ بلکہ اس سے یورپ کے لئے بھی روشن امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ اٹلی اور فرانس میں پہلے ہی بائیں بازو کی جانب جھکاؤ نمایاں ہے۔ بنگلہ دیش کی آزادی سے، اس ملک کے عوام کو درپیش حالیہ عارضی پسپائی کے باوجود برصغیر ہند میں اور اس خطے میں قوتوں کا توازن یکسر بدل کر رہ گیا ہے۔

ب) سامراج دشمن قوتوں کی روز بڑھتی ہوئی طاقت اور سامراج کے کمزور ہونے کی وجہ سے سامراج کی ایک نئی جنگ چھیڑنے کی صلاحیت مزید گھٹی ہے۔ اگرچہ کہ اس کا خطرہ اب بھی موجود ہے۔ اس لئے امن پسند قوتوں کو بے پناہ چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ سامراج روز بروز حقیقتوں کو تسلیم کرنے اور پر امن بقائے باہمی کی پالیسی قبول کرنے پر مجبور ہوتا جا رہا ہے۔ پر امن بقائے باہمی کی پالیسی طبقاتی جدو جہد کو کند نہیں کرتی بلکہ سامراج دشمن قوتوں کو جدو جہد کے لئے سازگار بین الاقوامی ماحول فراہم کرتی ہے اور اس سے سامراج کو حاصل مواقع اور اختیارات محدود ہوتے ہیں۔ سوشلسٹ کیمپ نے صلح جوئی (دی تاں) کی جس پالیسی کی ابتدا کی ہے، جسے 1949ء میں منعقدہ کمیونسٹ اور ورکرز پارٹیوں نے تیار کیا تھا، پہلے ہی یورپ میں کافی کامیابی حاصل کر چکی ہے اور جو ہیلسنکی کانفرنس کی شکل میں عملی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایشیا میں سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کا پیش کردہ ایشیائی اجتماعی سلامتی کا نظریہ، جس کا مقصد امریکی سامراج کی ریشہ دوانیوں اور اثر ونفوذ کو گھٹانے کے لئے ایشیائی ملکوں کے مابین تعاون اور ایک دوسرے پر انحصار کا فروغ ہے، رفتہ رفتہ جڑیں پکڑ رہا ہے۔ اور ایشیاء کے عوام الناس اور ان کے ساتھ ساتھ

ایشیائی حکومتوں کی روز بڑھتی ہوئی تعداد کی توجہ حاصل کر رہا ہے۔

ج) بین الاقوامی صورت حال میں سازگار تبدیلی کے ساتھ ساتھ ملک کے اندر بھی کئی ایک تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ون یونٹ توڑا گیا۔ اور ملک میں بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات ہوئے۔ بنگلہ دیش کو آزادی ملی جس کے نتیجے میں سابقہ مغربی پاکستان اب پاکستان بن گیا۔ بھٹو حکومت اقتدار میں آئی۔ بلوچستان کا صوبہ بنا، سرحد اور بلوچستان میں نیپ اور جمیعت علماء اسلام کی مخلوط حکومتیں بنیں اور ٹوٹیں، شملہ سمجھوتے پر دستخط ہوئے۔ پاکستانی بنک اور بیمہ کمپنیاں (شعبہ زندگی) ریاستی تحویل میں لے لی گئیں۔ اور بہت سے دوسرے واقعات پیش آئے۔ یہ بات اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ 1968ء کا تھیسس وقت کی آزمائش پر پورا اترا ہے۔ اور اس نے پارٹی کو ایک متفقہ اور واضح گائیڈ لائن فراہم کی ہے۔ جس کی روشنی میں پارٹی اس قابل ہوئی کہ وہ ان پیچیدہ مسائل پر جن سے پارٹی اور ملک کو اس عرصے میں سامنا رہا، صحیح پالیساں وضع کر سکے۔

د) 1960ء کے 81 پارٹیوں کے مشترکہ بیان کی رہنما لائن پر عمل کرتے ہوئے ہماری پارٹی نے آزاد قومی جمہوریت کو اپنی حکمت عملی کا نصب العین قرار دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ پاکستان کے مخصوص خدوخال کو ملحوظ رکھا گیا اور ملک میں موجود مخصوص صورت حال کی روشنی میں اس عوامی لائن کی تخلیقی انداز میں وضاحت کی گئی اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ملک میں ترقی ناہموار طور پر ہوئی ہے اور یہ کہ سماجی ارتقاء کی سطح ایسی ہے کہ معاشی ہم آہنگی خصوصی طور پر ملک کے دونوں حصوں میں انتہائی کمزور تھی۔ پارٹی نے اس راہ کی پیش بینی کی جس پر پاکستان کی جمہوری تحریک جا سکتی تھی۔ یعنی ٹکڑوں میں آزادی کی راہ۔ چنانچہ جب سابقہ مشرقی پاکستان میں بحران پیدا ہوا تو پارٹی اس نظریہ سے لیس تھی کہ ''آزاد قومی جمہوریت کی تحریک کے فروغ پانے کے حالات پاکستان کے کسی ایک خطے میں پختہ ہوئے تو وہ خطہ ملک کے دوسرے علاقوں میں ایسے ہی حالات کے پختہ ہونے کا انتظار کئے

بغیر اپنی جدو جہد کا آغاز کردے گا۔'' چنانچہ پارٹی فوری طو پر صحیح رہنمائی فراہم کر سکی۔ سابقہ مغربی پاکستان میں پارٹی نے اس وقت کی صورت حال کے لحاظ سے صحیح ترین لائن اپنائی کہ سیاسی مسائل کو سیاسی طور پر حل کیا جانا چاہیے، فوجی طریقے سے نہیں۔ اس طرح پارٹی نے پورے ملک کی جمہوری تحریک کی اور بنگلہ دیش کی معروف جدو جہد عوام کی جانب اپنی ذمہ داری کو پورا کیا۔ اور بنگلہ دیش کے بہادر عوام کے ساتھ یک جہتی کی لائن کی تشہیر کی۔

ہ) بعد کے حالات نے تاہم یہ ثابت کیا کہ پارٹی نے ملک میں سامراج کے اثر ونفوذ کو کم کر کے دیکھا تھا اور اس کا بھی صحیح اندازہ نہیں کر پائی تھی کہ حکومت پاکستان امریکی سامراج کی کسی حد تک راضی بر رضا آلہء کار ہے۔ اسی طرح پارٹی سوشلزم کے ہمارے عہد کی فیصلہ کن قوت بن جانے کے مضمرات کا بھی پورے طور پیر احاطہ نہیں کر پائی تھی۔ چنانچہ اس نے خود اپنی قوت کو کم کر کے دیکھا اور بہت سے ایسے مواقع کھو دیئے جب جرأت مندانہ پہل کاری کی ضرورت تھی اور بعض اوقات یہ بور ژوا طبقات کی دم چھلہ بن گئی۔ لیکن ان سب غلطیوں کے باوجود جنہیں ٹھیک کیا جانا باقی ہے یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ 1968ء کا پارٹی کا حکمت عملی کا تھیسس ہماری پارٹی کے لئے ایک قابل اعتماد رہبر عمل ثابت ہوا ہے۔

و) اگرچہ کہ حکمت عملی کا وہ دور جس سے پاکستان آج گذر رہا ہے، وہی ہے جو 1968ء میں تھا لیکن بین الاقوامی سطح پر بھی ملکی سطح کے ساتھ ساتھ بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ خاص طور پیر بنگلہ دیش کی آزادی سابقہ مغربی پاکستان کو پاکستان کی شکل دے دی ہے ان مقداری تبدیلیوں نے قوتوں کی شیرازہ بندی کو بدلا ہے۔ جس کی وجہ سے صورت حال کا از سر نو جائزہ لینا، ترجیحات کا از سر نو یعین اور نئی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے نئی تدبیریں وضع کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

کانگریس کی دستاویزات کے باب دوم میں دعویٰ کیا گیا کہ سوشلزم ہمارے عہد کی فیصلہ کن قوت ہے۔ بدقسمتی سے وقت نے اس دعوے کو غلط ثابت کر دیا۔ کہا گیا کہ

سوشلزم کی طاقت اس کے برتر سماجی نظام ہونے میں مضمر ہے۔ یہ بھی دعویٰ کیا گیا کہ یہ سرمایہ داری کے عمومی بحران کا دور ہے جو روز بروز عالمی تاریخ کی ترقیوں پر سامراج کی مرضی تھوپنے کی صلاحیتوں کو کم کر رہا ہے۔ البتہ سامراج کا خطرہ ابھی بالکل ٹلا نہیں ہے۔

قیام بنگلہ دیش کے بعد کی پاکستانی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا گیا کہ سابق مغربی پاکستان اب پاکستان بن گیا ہے جس سے پاکستان کی جغرافیائی سیاسی صورت حال یکسر تبدیل ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی یہ غلط دعویٰ بھی کیا گیا کہ اس علاقے میں امن کی قوتیں مستحکم ہو رہی ہیں اور سامراج تیزی سے پسپائی اختیار کر رہا ہے یہ دعوے بھی قابل غور ہیں کہ بنگلہ دیش کی آزادی نے مذہب کی بنیاد پر قومیت کے نظریئے پر گہری ضرب لگائی ہے اور پاکستان کے عوام پر اس کی گرفت کو بڑی حد تک کمزور کیا ہے۔ کمیونسٹ ساتھیوں کو یاد نہیں آیا کہ صرف دو سال قبل 1974ء میں احمدیہ فرقے کو اسی ریاست نے غیر مسلم قرار دیا تھا۔ یہ دعویٰ بھی مضحکہ خیز ثابت ہوا کہ حکمران طبقات کو بری طرح جھٹکے لگے ہیں اور وہ کمزور پڑے ہیں حالانکہ صرف ایک سال بعد ضیاء مارشل لاء کے باعث حکمران طبقات کی اقتدار پر گرفت مزید مضبوط ہوگئی۔ پارٹی یہ دیکھنے سے بھی قاصر رہی کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے پاکستان کی جمہوری اور سیکولر قوتیں کمزور پڑی ہیں۔

پاکستان کی طبقاتی ساخت کے حوالے سے بتایا گیا کہ پاکستان مختلف طبقات مزدور، کسان، درمیانی طبقہ، جاگیر دار اور سرمایہ دار طبقات پر مشتمل ہے جو پورے طور پر جدید نو آبادیاتی نظام کے چنگل میں ہے۔ بتایا گیا کہ ملک کی ناہموار معاشی حالت کے باعث وسیع خطے آج بھی نامیاتی طور پر معیشت کے ماقبل سرمایہ دارانہ مرحلے میں ہیں، پاکستان کا مزدور طبقہ دنیا بھر میں انتہائی محروم اور استحصال کے شکار طبقوں میں سے ایک ہے۔ درمیانے طبقے کا وہ حصہ جو براہ راست پیداوار میں شریک نہیں ہے، طالب علموں، دانشوروں اور نوکری پیشہ لوگوں پر مشتمل ہے۔ خواتین کے بارے میں کہا گیا کہ اگرچہ وہ سماج کے مختلف طبقات سے متعلق ہیں لیکن سماجی اعتبار سے ایک علیحدہ وجود بھی رکھتی ہیں۔ جنہیں مردوں کے ساتھ سماجی برابری حاصل نہیں ہے۔ خواتین کے ساتھ ساتھ بچوں کا ذکر

کرتے ہوئے کہا گیا کہ بچوں کو سماج کا اثاثہ سمجھنے کی بجائے بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ حکومت کی توجہ خود بچوں کی جانب کم اور خاندانی منصوبہ بندی یعنی بچوں کی روک تھام کی طرف زیادہ ہے۔ پاکستانی سماج کی طبقاتی ساخت کو کافی حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

پاکستان کے حکمران طبقات میں نوکر شاہی کی بالائی پرت، سرمایہ داری اور جاگیر داری شامل ہیں جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ ان کے برعکس جمہوری اور محنت کش طبقات کا تجزیہ بھی کافی حقیت پسندانہ ہے۔ ان طبقات کو سوشلزم کی جانب عبوری مرحلہ قرار دیا گیا۔ جو تاریخی طور پر غلط ثابت ہوا۔ سوویت یونین اپنے انہدام سے صرف پندرہ برس کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ آزاد قومی جمہوریت کے لئے جدو جہد کے 13 نکاتی پروگرام میں محب وطن طبقات کی حکومت سامراج سے نجات، زمیندارانہ باقیات کا خاتمہ، حکومت میں عوام کی سرگرام شمولیت، منصوبہ بند غیر سرمایہ دارانہ معاشی ترقی، مزدوروں کی انتظامیہ میں شرکت، ثقافتی معیار کو بڑھاوا، مکمل قومی حقوق، ایشیائی ملکوں کے مابین اجتماعی سلامتی کی جدو جہد، خوش ہمسائیگی کے تعلقات، سوشلسٹ ممالک سے تعلقات اور سامراج دشمن خارجہ پالیسی شامل تھے۔

پاکستان کے مخصوص مسائل کے ضمن میں مندرجہ ذیل مسائل کی نشاندہی کی گئی۔

1۔ ناہموار معاشی ترقی

2۔ قومی حقوق کا سوال اور

3۔ ہندوستان کے ساتھ بہتر اور خوشگوار تعلقات

پاکستان میں آزاد قومی جمہوریت کے قیام کی جدو جہد میں مختلف تدابیر کی نشاندہی کی گئی۔ کہا گیا کہ اگرچہ مزدور طبقہ انقلاب کی واحد مرکزی قوت نہیں ہے تاہم مزدور طبقے کا ہی کام ہے کہ وہ انقلابی تحریک کو ایک واضح سامراج دشمن رُخ دے اور انقلاب کو عالمی سوشلسٹ انقلاب کے ایک حصے کے طور پر ترقی دے۔

آخری اور اہم تدبیر یہ بیان کی گئی کہ ملک میں سامراجی اثر ونفوذ اور استبداد سے عبارت حالات کو سامنے رکھتے ہوئے، ہماری پارٹی کو، اپنے آپ کو روپوش حالات میں

برقرار رکھنا پڑتا ہے چنانچہ مزدور طبقہ اور عوام کے درمیان قانونی طریقے پر اور کھلے عام کام کرنے کے ساتھ ساتھ پارٹی کو اس کے لئے بھی پورے طور پر تیار رہنا چاہئے کہ جب صورت حال کا تقاضہ ہو تو وہ جدو جہد کی ایک شکل سے دوسری شکل کی طرف جا سکے۔

دوسری کانگریس کی آخری دستاویز:

سیاسی قرارداد میں کہا گیا کہ فوجی اور سول نوکر شاہی جاگیر دار عناصر اور بڑے اور گماشتہ سرمایہ داروں کی حکومت ملک میں امریکی سامراج کو مزید اثر ونفوذ پیدا کرنے کی چھوٹ دے رہی ہے۔ یہ روز افزوں اثر ونفوذ پاکستان کو نہ صرف عالمی جمہوری اور امن کی قوتوں کے اصل دھارے سے کاٹتا ہے بلکہ ملکی وسائل کو غیر پیداواری فوجی مصارف میں لگا کر ملک کے حال و مستقبل پر اعلیٰ فوجی افسروں کی پہلے ہی سے خطرناک حد تک مضبوط گرفت کو اور مضبوط بنا کر ہمارے ملک کی زندگی کے مختلف شعبوں میں امریکی سراغرساں اداروں کے گھسنے کے مواقع فراہم کر کے اور حکومت پاکستان کے تادیبی بازوؤں یعنی پولیس، سیکورٹی اور جاسوسی کے اداروں کو جو عام طور پر عوام اور خاص طور پر سامراج دشمن اور جموری تحریک کو کچلنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، مضبوط بنا کر ملکی ترقی میں بگاڑ پیدا کرتا ہے۔۔ سامراجی اثر ونفوذ ملک میں متوازن معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔

سیاسی قرارداد کا دوسرا اہم نکتہ اس پیغمبرانہ پیشن گوئی سے مزین تھا کہ بھٹو حکومت اپنی گرفت کو مضبوط کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے جو آگے چل کر بہر حال ناکام ہو گی۔ اس لئے کہ ایک طرف فوجی ٹولے اور نوکر شاہی کا مضبوط مفادات کے درمیان اور دوسری طرف عوام کے درمیان تضادات ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ بڑھتے جا رہے ہیں۔ بھٹو حکومت کو اس وقت اقتدار دیا گیا تھا جب فوجی حکمرانوں کا دیوالیہ پن مکمل طور پر بے نقاب ہو چکا تھا۔ فوجی حکومت اس فوجی ٹولی اور نوکر شاہی سرمایہ کے مفادات کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ رجعت پسند طبقات اور کسی حد تک پیٹی بورژوا طبقہ میں اپنی بنیاد کو وسیع کرنے کی کوشش کر رہی ہے تا کہ وہ فوجی ٹولہ کو پردے کے پیچھے رہنے پر مجبور

کرے اور اپنے راج کو تسلسل دے سکے۔ لیکن چونکہ بھٹو حکومت رجعت پرست طبقات کی حکمرانی کا ایک آلہ ہے اور اس کی پالیسیاں ان ہی کے مفادات کی حفاظت کرنے اور انہیں قوت بخشنے کے مقصد پر مبنی ہیں اس لئے وہ عوام اور حکمران طبقات کے درمیان تضاد کو مزید بڑھا رہی ہے۔ سیاسی قرارداد میں مزید کہا گیا کہ:

سامراجی اثر و نفوذ میں اضافے کے علاوہ موجودہ حکومت کے زمانہ میں مخصوص مفادات، بالخصوص فوجی نوکر شاہی کے مفادات کا اثر صنعت اور زراعت دونوں ہی میں تیزی سے بڑھا ہے جس کی وجہ سے بھٹو حکومت اس قابل نہیں رہی ہے کہ وہ حکمران طبقات سے ناطہ توڑے بغیر ملک کو درپیش مسائل کو حل کر سکے۔ لیکن ایسا کرنے کی بجائے بھٹو حکومت عوام کو کچلنے، انہیں دھوکہ دینے اور اندرون ملک رجعت پرست حکمران طبقات اور حلقوں اور سامراج کے مفاد میں عوام میں نفاق اور پھوٹ کا بیج ڈالنے کے لئے پوری مستعدی کا اظہار کر کے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے ریاستی مشینری کے جبر کے اداروں کو بہت زیادہ مضبوط بنا رکھا ہے۔ اس حکومت نے مزدور طبقہ کی تحریک کو حتیٰ کہ ٹریڈ یونین تحریک تک کو انتہائی بربریت سے کچل ڈالا ہے۔ مزدور لیڈروں کو خریدنے اور انہیں بدعنوان بنانے اور تشدد اور انتقامی کارروائیوں کے علاوہ اس نے ایسے ٹریڈ یونین قوانین بنائے ہیں کہ مزدور طبقہ کے مشترکہ اقدامات اور قانونی ہڑتالیں ناممکن ہو گئی ہیں۔ اس نے چھوٹی قومیتوں کے حقوق کے لئے لڑنے والوں کو جو بیشتر نیپ سے متعلق تھے اور ان کے پارلیمانی حلیفوں کو سرحد اور بلوچستان میں عارضی مدت کے لئے اقتدار دے کر اور یوں انہیں سیاسی طور پر نہتا کر کے قومی اسمبلی سے ایک رجعت پرست آئین منظور کرا لیا۔

بھٹو حکومت نے نیپ اور جمیعت العلمائے اسلام کی مخلوط حکومتوں کو بے بنیاد الزامات کے تحت برطرف کر دیا اور بلوچستان کے عوام کے خلاف بڑے پیمانے پر فوجی کارروائی کا آغاز کیا جو اب بھی جاری ہے۔''

نیپ کے حوالے سے سیاسی قرارداد میں مزید کہا گیا ہے:

''اس وقت جب کہ نیشنل عوامی پارٹی کے دائیں بازو کی موقعہ پرستی نے انہیں پورے طور پر بے نقاب کر دیا تھا اور اندرونی طور پر بہت کمزور کر دیا تھا اور جب انہوں نے متحدہ جمہوری محاذ میں شامل ہو کر خود کو دنیا کی جمہوری اور ترقی پسند قوتوں کے دھارے سے کاٹ لیا تھا اور جب کہ نیپ میں بائیں بازو کی قوتیں اپنی سامراج دشمن اور جمہوری لائن کو دوبارہ منوانے اور نیپ کو ایک حقیقی جمہوری اور سامراج دشمن پلیٹ فارم بنانے کے لئے پوری طرح مستور تھیں تو اس وقت بھٹو حکومت نے نیپ پر 10 فروری کو پابندی لگا دی۔ بھٹو حکومت نے نیپ پر ''دستوری'' پابندی لگا کر اپنے رجعت پرست آقاؤں کا جی خوش کیا اور اس طرح کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے علاوہ جمہوری ترقی پسند اور سامراج دشمن پلیٹ فارم کی حامل ایک بڑی پارٹی کو راہ سے ہٹا دیا۔ نیپ پر پابندی لگائے جانے کے بعد سے حکومت جمہوری اصولوں کی بجائے آرڈیننسوں کے ذریعہ چل رہی ہے۔ بھٹو حکومت نے دستور میں ''نظریہ پاکستان'' کو مقدس مقام دیا ہے جو بلا شبہ اس بات کی علامت ہے کہ ملک کے عوام کے ذہنوں سے رجعت پسندانہ دو قومی نظریہ تقریباً پورے طور پر ہو چکا ہے لیکن اس سے موجودہ حکومت کو اپنی من مانی عوام دشمن کارروائیوں کو آئینی طرز عمل کے پردہ کے پیچھے چھپانے میں مدد ملتی ہے۔''

سیاسی قرار داد سے کمیونسٹ پارٹی کی بھٹو دشمنی بھی مترشح ہوتی ہے۔ شاید وہ اس فہم سے عاری تھی کہ ولی بزنجو اختلافات کی آڑ لے کر اگر بھٹو دشمنی کو اس حد تک نہ بڑھا دیا جاتا تو ضیاء مارشل لاء سے بچا جا سکتا تھا۔ قرار داد کے آخر میں کہا گیا کہ:

''کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی یہ دوسری کانگریس تمام کمیونسٹوں، مزدور طبقہ کے کاز کے تمام بہی خواہوں، سوشلزم پر یقین رکھنے والوں اور امن کے مجاہدوں، تمام محنت کشوں اور انقلابی جمہوریت پسندوں، تمام محبان وطن اور عوام کے تمام حلقوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ مشترکہ جدو جہد کے لئے متحد ہو جائیں اور سامراجیوں اور ان کے حلیفوں کی موجودہ حکومت کی جگہ ایسی حکومت لے آئیں جو ہمارے ملک کے کروڑہا عام لوگوں کی امنگوں کی ترجمان ہو۔''

بھاشانی کا انتقال:

17 نومبر 1976ء کو مولانا بھاشانی ڈھاکہ میں انتقال کر گئے جس کا سیف خالد کو بہت صدمہ ہوا۔ چھ سال قبل جب مولانا پاکستان کانفرنس میں شرکت کے لئے لائل پور آئے تو اختلافِ رائے کے باوجود وہ میاں محمود احمد کی رہائش گاہ پر، مولانا کی میزبانی کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ وہ ہمیشہ ذکر کرتے کہ یہ مولانا بھاشانی جنہوں نے 1957ء میں پاکستان نیشنل پارٹی کے ساتھ مل کر نیشنل عوامی پارٹی کی بنیاد رکھی، نیپ کے پہلے مرکزی صدر مقرر ہوئے۔ اس عہدے پر وہ 1968ء تک قائم رہے۔ 1968ء میں جب پارٹی نیپ ولی اور نیپ بھاشانی گروپ میں تقسیم ہوگئی تو وہ نیپ بھاشانی گروپ کے صدر برقرار رہے۔ انہوں نے ٹوبہ ٹیک سنگھ کانفرنس میں مغربی پاکستان کو خدا حافظ کہا۔ فیض احمد فیض جو اس کانفرنس میں شریک تھے، جب انہوں نے مولانا سے اس بیان کی شکایت کی تو وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ شیخ مجیب ٹھیک کہتا ہے۔ مرکز نے مشرقی پاکستان کا استحصال کرنے کے سوا اور کیا کیا ہے۔ انتقال کے وقت مولانا کی عمر 97 سال تھی۔

انتخاب 1977ء

جنوری 1977ء میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے 7 مارچ کو قومی اسمبلی اور 10 مارچ کو چاروں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا حالانکہ ابھی اسمبلیوں کی ایک سال سے زائد کا عرصہ باقی تھا۔ اس عجلت کی غالباً وجہ یہ تھی کہ حزبِ اختلاف کی جماعتیں انتشار کا شکار تھیں اور پیپلز پارٹی بزعم خود مقبولیت کے نقطۂ عروج پر تھی۔ انتخابات کا اعلان ہوتے ہی سیاسی جماعتوں نے اپنی صف بندی شروع کر دی۔ حزب اختلاف کی نو سیاسی جماعتوں پاکستان مسلم لیگ، تحریک استقلال، جماعت اسلامی، پاکستان جمہوری پارٹی۔ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی، جمعیت علمائے پاکستان اور جمعیت علمائے اسلام نے اپنے باہمی اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے تین روز کے اندر اندر اتحاد قائم کر لیا۔ ان کا پہلا

اجلاس رفیق احمد باجوہ کی رہائش گاہ پر ہوا اور وہی پاکستان نیشنل الائنس کے سیکرٹری جنرل مقرر کئے گئے۔ جب کہ جمیعت علمائے اسلام کے سربراہ مولانا مفتی محمود پاکستان قومی اتحاد کے صدر بنے۔ نوابزادہ نصراللہ خان کو نائب صدر چن لیا گیا۔ وقت کم اور مقابلہ سخت تھا لیکن 9 ستاروں کے نام سے مشہور ہونے والی تنظیم نے جلد ہی اپنی انتخابی مہم کا آغاز کر دیا جبکہ پیپلز پارٹی کے نامزد امیدوار بلا مقابلہ منتخب ہونا شروع ہو گئے۔ جن میں ذوالفقار علی بھٹو بھی شامل تھے۔ بھٹو کو بلا مقابلہ منتخب کرانے کے لئے لاڑکانہ کی انتظامیہ نے بھٹو کے مد مقابل جان محمد عباسی کو گرفتار کر لیا اور ان کی رہائی اس وقت عمل میں آئی جب کاغذات نامزدگی جمع کرانے کا وقت گزر چکا تھا اور یوں بھٹو صاحب خود بخود بلا مقابلہ کامیاب قرار دیئے گئے۔

اس وقت تک نیشنل پروگریسو پارٹی (این پی پی) قائم ہو چکی تھی۔ جس کے قیام میں مرکزی کردار سیف خالد اور نواز بٹ کا تھا۔ پارٹی نے پی این اے (PNA) کی شدید مخالفت کی جس میں پنجاب سے سیف خالد پیش پیش تھے۔ نواز بٹ بتاتے ہیں کہ کراچی سے این پی پی نے دو نشستوں پر انتخاب لڑا، ڈاکٹر منظور احمد نے صوبائی اسمبلی کی نشست کے لئے انتخاب لڑا۔ قومی اسمبلی کے لئے ڈاکٹر اعزاز نذیر نے جیل سے این ڈی پی کے شیر باز مزاری کے مقابلے میں انتخاب لڑا۔ پارٹی کے وسائل کی یہ حالت تھی کہ ٹھیلے پر میگا فون سے انتخابی کنویسنگ ہوتی۔ این پی پی کے قیام پر سیف خالد پارٹی کے کنوینر اور نواز بٹ جنرل سیکرٹری چنے گئے تھے۔

انتخابات میں پیپلز پارٹی کو زبردست فتح نصیب ہوئی۔ بھٹو نے بیان دیا کہ پاکستان کے عوام نے پیپلز پارٹی کی انقلابی اصلاحات کی توثیق کر دی ہے پی این اے نے دھاندلی کا الزام لگاتے ہوئے 10 مارچ کے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ باقی سب تفصیل تاریخ کا حصہ ہے۔ اپوزیشن کے مظاہرے، گرفتاریاں، تین شہروں میں مارشل لاء، پی این اے اور پیپلز پارٹی کے مذاکرات، 5 جولائی کو ضیاء الحق کا شبخون، تیسرا مارشل لاء، حیدر آباد سازش مقدمے کا خاتمہ، بھٹو کے عدالتی قتل کا فیصلہ وغیرہ،

یہ تمام واقعات تاریخ میں درج ہیں۔ سیف خالد ان واقعات کے عینی شاہد تھے۔ بلوچ قیادت بھی ان واقعات کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ پی ایم کٹی کے بقول:

''جون 1977ء میں حکوت اور پی این اے کے درمیان ایک تحریری معاہدہ طے پا گیا تھا اور 5 جولائی کو اس پر بھٹو نے اپنے دستخط ثبت کرنا تھے۔ بہر کیف بات چیت میں شریک ٹیم کے جذبہ و جوش کے باوجود پی این اے کے کچھ رہنماؤں کو اس معاہدے پر تحفظات تھے۔ فوجی جرنیل جو پہلے ہی ان مذاکرات کے طوالت پکڑنے پر بے صبری کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ انہوں نے بھٹو کی سربراہی سے فوراً ہاتھ کھینچ کر 5 جولائی 1977ء کو اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس بغاوت کو جو بعد میں ''آپریشن فیئر پلے'' کے نام سے متعارف کرائی گئی۔ اس پر کسی کو بھی حیرانی نہیں ہوئی۔

''اب یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ نیپ کے رہنما جلد ہی رہا ہو جائیں گے لہٰذا بائیں بازو کے ترقی پسند عناصر نے جو اب تک 'این ڈی پی' میں نیم دلی سے شامل تھے اپنے حقیقی رہنماؤں کے جیل سے باہر آنے کی اِمید میں اپنا مستقبل کا راستہ ہموار کرنے میں پیش پیش رہنے لگے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ مجھ جیل سے رہائی کے بعد عبدالعزیز کرد، بزن بزنجو او امیر الملک مینگل بھی مشورہ سازی کے لئے کراچی میں موجود تھے۔ ہمارا مقام ملاقات مستی خان کی رہائش گاہ یا ڈاکٹر رکن الدین حسان، فصیح سالار، ڈاکٹر ایم اے محبوب، ڈاکٹر منظور احمد، لالہ محمد حسین کے گھر اور بعض اوقات بیرسٹر ودود کا سول ہسپتال کے نزدیک دفتر ہوا کرتا تھا۔''

حیدر آباد سازش مقدمہ ختم کر دیا گیا۔ نام نہاد ٹربیونل توڑ دیا گیا۔ غیر مشروط رہائی کے بعد رہاشدگان اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہونے لگے۔ کٹی اس منظر نامہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۔۔ میں اور میرے کچھ احباب اپنے رہنماؤں کی رہائی سے دو روز پہلے کوئٹہ روانہ ہو گئے تاکہ اپنے لیڈرز کا وہاں ریلوے سٹیشن پر استقبال کر سکیں۔ یہ ایک انتہائی جوش بھرا تپاک تھا کہ نیپ کے تمام رہنما جو جیل میں تھے اور جو بچ کر رو پوش تھے، اب

دوبارہ مل رہے تھے۔

میر صاحب کا اپنا گھر کوئٹہ میں نہیں تھا۔ جب وہ اپنے دوسرے بلوچ رہنماؤں کے ہمراہ کوئٹہ آئے تو میر محمود عزیز کرد کی ریلوے کالونی میں واقع رہائش گاہ پر قیام کیا اور بعد ازاں وہ جب بھی کوئٹہ آتے اسی کے ہاں ٹھہرتے۔ محمود عزیز کرد کے انتقال کے بعد وہ اپنے برادرِ نسبتی یعقوب بزنجو کے گھر جو ریلوے کالونی میں تھا رہائش رکھتے جو ایک کارپوریشن کے مینیجنگ ڈائریکٹر تھے۔ اگلے دس سال تک وہ انہی کے ہاں قیام پذیر ہوتے رہے۔

ملک ایک بار پھر فوجی جرنیلوں کی ہوسِ اقتدار کا شکار بن چکا تھا۔ لیکن مارشل لاء کا تسلط صرف اس ہوسِ اقتدار کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اس میں پاکستانی کیمونسٹوں کی غلطیاں بھی شامل تھیں۔ کہا جاتا ہے اور اس بات میں خاصا وزن معلوم ہوتا ہے کہ کیمونسٹ پارٹی بھٹو دشمنی میں اتنی آگے نہ بڑھ گئی ہوتی تو غالباً مارشل لاء کی نوبت نہ آتی۔ اس دلیل کو ضرورت سے زیادہ سادہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ معاملات کو اس سطح تک پہنچانے میں بھٹو صاحب کا اپنا کردار بھی تھا۔ سیف خالد، نواز بٹ اور این پی پی کے دیگر رہنما اب اس بات کا اعتراف کر رہے تھے کہ انتہا پسندانہ صورتِ حال سے بچا جا سکتا تھا یہ بھی درست معلوم ہوتا ہے کہ جب بھٹو صاحب نے بی ایم کٹی کے ذریعے بزنجو صاحب سے صلح صفائی کی کوششیں شروع کیں تو بہت دیر ہو چکی تھی اور اب معاملات کو نہیں سنبھالا جا سکتا تھا۔

یہ مارشل لاء کے دو ماہ بعد کی بات ہے کہ میں جامشورو سے لاہور آیا ہوا تھا۔ ستمبر 1977ء کے پہلے یا دوسرے ہفتے کی بات ہے کہ میں شمیم اشرف ملک سے ملنے گیا تو ان سے سیف خالد کا بھی ذکر آ گیا تو کہنے لگے، سیف لائلپور کا نام بدلے جانے پر بہت غصہ میں ہے۔ آج کل ہر ایک سے اس کی بات کرتا ہے۔ ان دنوں وہ لاہور میں ہی تھے۔ ان سے ملنے گیا تو واقعی وہ بہت رنجیدہ تھے کہنے لگے۔

”لائلپور میری پہچان تھی“

میں نے طنز کیا، سامراجی پہچان؟ سیف خالد فیض صاحب کی طرح غصے میں اونچی

آواز میں بات نہیں کرتے تھے لیکن اس دن ان کی آواز خاصی اونچی ہوگئی۔ بولے

''کیا اب ضیاء الحق مجھے بتائے گا کہ میری پہچان لائلپور نہیں، فیصل آباد ہے۔ لائل بیشک سامراجی حکمران تھا لیکن اس نے شہر کو بسایا تھا۔''

میں نے کہا ''اسی روز ضیاء الحق نے کراچی کی مشہور شاہراہ ''ڈرگ روڈ کا نام بھی تو شاہراہِ فیصل رکھ دیا ہے۔ وہاں کے لوگوں نے تو بُرا نہیں مانا''

اب وہ دھیمے لہجے میں بول رہے تھے۔ کہنے لگے ''وہاں کے لوگوں کی جڑیں کراچی میں نہیں ہیں اگر دہلی یا لکھنؤ کا نام فیصل آباد رکھ دیا جاتا تو وہ لکھنوی یا دہلوی ہی رہتے۔ فیصل آبادی نہ بن جاتے۔''

سیف خالد کی باتوں میں خاصا وزن تھا۔ مجھے یاد ہے، کئی سال بعد جب لندن میں مشہور ترقی پسند شاعر بخش لائلپوری سے ملاقات ہوئی تو وہ بھی اسی طرح رنجیدہ تھے اور کہہ رہے تھے

''میں تو بخش فیصل آبادی نہیں بن سکتا''

مرتے دم تک بخش لائلپوری ہی کہلانا پسند کروں گا'' اور واقعی ایک دن میں نے خبر پڑی ''بخش لائلپوری کا انتقال ہوگیا''

لائل پور کا نام تبدیل ہونے والے روز جنرل ضیاء نے اکتوبر میں ہونے والے انتخابات کو ملتوی کرنے کا عندیہ دیا اور یکم اکتوبر کو تاحکم ثانی انتخابات ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ پیپلز پارٹی کا ردعمل تو آنا ہی تھا۔ پی این اے سے باہر کی تمام پارٹیوں نے بھی اس اعلان کی مخالفت کی۔ جنرل ضیاء نے 5 جولائی کو مارشل لاء نافذ کرتے ہوئے اکتوبر میں انتخابات کروانے کا وعدہ کیا تھا۔ التواء کے اعلان کے پس پردہ پیپلز پارٹی کی انتخابات میں کامیابی کا خوف جھلک رہا تھا۔ فوجی آمر نے روزنامہ مساوات لاہور کے مدیر ان کو گرفتار کر لیا اور مساوات کراچی کے مدیر اور ترقی پسند افسانہ نگار ابراہیم جلیس بھی زیر عتاب تھے۔ وہ کسی بھی لمحے گرفتاری کے لئے تیار بیٹھے تھے، اسی دوران دماغ کی شریان پھٹنے سے 26 اکتوبر کو ان کا انتقال ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد جب سیف خالد سے ملاقات

ہوئی تو ان حالات کی وجہ سے وہ شدید دباؤ میں تھے، ان کو رنج محسوس ہوتا تھا کہ اس انتہا پسندی کے وہ بھی ذمہ دار ہیں۔ حالات روز بروز بگڑتے جا رہے تھے اور طلبہ تنظیموں اور پیشہ ور انجمنوں پر پابندی لگادی گئی۔ 30 نومبر کو فیڈرل سیکورٹی فورس (ایف ایس ایف) کا ڈھانچہ توڑ دیا گیا۔ اسی مہینے 10 نومبر کو نصرت بھٹو کیس میں ضیاء مارشل لاء کو جائز قرار دیا گیا جو بھٹو کے عدالتی قتل کا نقطہء آغاز تھا۔

سیف اس عرصے میں نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو سے بھی ملے اور اُن سے یک جہتی کا اظہار کیا۔

دسمبر 1977ء میں ضیاء نے کئی عوام دشمن اور غیر جمہوری اقدامات کئے۔ 16 دسمبر کو قذافی سٹیڈیم لاہور میں بیگم نصرت بھٹو کا ہنگامہ آرائی میں سر پھاڑ دیا گیا۔ 17 دسمبر کو ذوالفقار علی بھٹو کو عدالت کے وقار کو مجروح کرنے کا الزام عائد کر کے عدالت سے نکال دیا گیا۔ 18 دسمبر سے 25 دسمبر تک لاہور میں ان گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ 27 دسمبر کو بیگم نصرت بھٹو کمرہء ہسپتال میں نظر بند کر دی گئیں، 29 دسمبر کو ولی خان نے جنرل ضیاء سے اہم ملاقات کی اور انتخابات سے پہلے احتساب کے نعرے کی حمایت کی۔

ولی خان اور حیدر آباد سازش مقدمہ کے دیگر ملزموں کی رہائی کے بعد سازش مقدمہ ختم کر دیا گیا۔ حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ 18 مارچ 1978ء کو لاہور ہائی کورٹ نے ذوالفقار علی بھٹو کو سزائے موت سنا دی۔ بھٹو نے لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مشتاق حسین کے جانبدارانہ روّیے کے باعث پہلے سے ہی عدالت کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ سزائے موت کا فیصلہ مختلف مراحل طے کر کے 4 اپریل 1979ء کو بھٹو کے عدالتی قتل کی صورت اختیار کر گیا۔ پی این اے کے صدر مفتی محمود نے کہا کہ آج بھٹو سے ہمارے تمام اختلافات ختم ہو گئے۔ 19 اپریل کو غوث بخش بزنجو، عطا اللہ مینگل، قسور گردیزی، گل خان نصیر اور عبدالحمید جتوئی نے این ڈی پی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ 11 اپریل کو جنرل ضیاء نے اکادمی ادبیات پاکستان کی پہلی ادبی کانفرنس منعقد کی۔ مشہور ادیب منصور قیصر نے یہ کہہ کر تقریب میں شرکت سے معذرت کر لی کہ جب گھر میں ماتم ہو تو ہم لوگ

تقریبات میں شرکت نہیں کرتے۔" بی ایم کٹی اپنی خودنوشت سوانح حیات میں لکھتے ہیں کہ جب میں نے 5اپریل کو صبح کے اخبارات میں یہ خبر پڑھی تو بہت دیر تک روتا رہا۔"

ان دنوں سیف خالد فالج کی تکلیف سے گزر رہے تھے۔ انہیں پہلے ہی تین بار ہارٹ اٹیک ہو چکا تھا۔ ان کے دیرینہ ساتھی پروفیسر عبدالقیوم بتاتے ہیں کہ سیف خالد جب دوسرے ہارٹ اٹیک سے بچ کر واپس گھر آئے تو انہی دنوں کمیونسٹ پارٹی لائل پور کے آفس سیکرٹری بابا ستار کا انتقال ہوا تھا۔ سارے دوستوں کا خیال تھا کہ سیف خالد سے بابا ستار کی یاداشتیں ریکارڈ کرنی چاہئیں۔ سیف خالد کی صاحبزادی بتاتی ہیں کہ اسی دور ے کے دوران انہیں اپنی بیوی کے کینسر کی اطلاع ملی، "جب مارچ 1979ء میں امی کا آپریشن ہوا تو وہ سارا دن روتے رہے کہ وہ اپنی رفیقہ حیات کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے اسی رات انہیں اپنا جسم بے جان ہوتا محسوس ہوا۔ صبح تک وہ بول بھی نہیں سکتے تھے۔ جب انہیں ہسپتال لے جایا گیا تو پتہ چلا کہ رات ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا ہے۔ یہ 3اپریل تھا۔ اس روز نصرت اور بے نظیر بھٹو صاحب سے آخری ملاقات کر رہی تھیں۔ یہ خبر سیف خالد سے چھپائی گئی۔ ان کی حالت اتنی خراب تھی کہ انہیں یہ خبر دی نہیں جاسکتی تھی۔

افغان انقلاب 27اپریل 1978ء

سیف خالد اپنی اور اپنی اہلیہ کی زندگی کے لئے جدو جہد کر رہے تھے جب 27اپریل 1978ء کو اچانک ریڈیو کابل سے لوک گیت سنائی دینے لگے۔ یہ کسی عوامی تبدیلی کا عندیہ تھا۔ کچھ ہی دیر بعد پی ٹی وی اور بی بی سی سے کابل میں انقلاب کی خبریں آنے لگیں۔ 27 اپریل ایک تاریخ ساز دن تھا۔ بی بی سی نے اس انقلاب کو پاکستان اور ایران کے لئے خطرہ قرار دیا۔ کچھ عرصہ بعد جب سیف خالد کی صحت بحال ہوگئی اور یہ خبر ان تک پہنچائی گئی تو سیف ایک طرح سے جی اٹھے۔

30 اپریل کو انقلابی حکومت کے فرمان نمبر 1 کے مطابق "عوامی جمہوریہ افغانستان کی انقلابی کونسل نے اپنے اجلاس میں نور محمد ترہ کئی کو انقلابی کونسل کا چیئرمین اور ملک کا

وزیر اعظم منتخب کیا۔ انقلابی کونسل نے اقتدار کے اعلیٰ ترین ادارے کی حیثیت سے اعلان کیا کہ آج (30اپریل 1978ء) سے افغانستان کا نام ڈیموکریٹک جمہوریہ افغانستان ہو گا۔ انقلابی کونسل کی منتخب حکومت عوامی جمہوریہ افغانستان کی حکومت کہلائے گی۔ انقلابی کونسل نے یکم مئی کو اپنے دوسرے فرمان میں متفقہ طور پر ببرک کارمل کو کونسل کا نائب چیئر مین مقرر کیا۔ ببرک کارمل کو نائب وزیر اعظم، حفیظ اللہ امین کو نائب وزیر اعظم اور وزیر خارجہ اور اسلم وطن جار کو نائب وزیر اعظم اور وزیرِ مواصلات چنا گیا۔ (بعد ازاں انقلاب دشمن سرگرمیوں کے الزام میں ببرک کارمل اور 6دیگر وزراء عبدالقادر، نور احمد، سلطان علی کشتمند، ڈاکٹر اناہیتاراتب زاد، محمد رفیع اور نظام الدین تہذیب کو ان کے عہدوں اور پارٹی سے برطرف کر دیا گیا۔ 14مئی 1978ء کو فرمان نمبر 3کے ذریعے مقننہ اور ریاستی اداروں کے فرائض کا تعین کیا گیا۔ 15مئی کو فرمان نمبر 4کے ذریعے، عوام کے تہذیبی حقوق بحال کرتے ہوئے، ان کی مادری زبانوں میں ادب، تعلیم اور طباعت کی سہولتیں دینے کا اعلان کیا گیا تاکہ ملک میں ایک ترقی پسند قومی ثقافتی نظام قائم ہو اور قومی مسئلے کو جمہوری طریقے سے حل کیا جا سکے۔ چنانچہ اس اعلان کو عملی شکل دینے کے لئے وزارتِ اطلاعات و ثقافت اور ریڈیو، ٹیلی ویژن کی وزارت نے ازبکی، ترکمانی، بلوچی اور نورستانی زبانوں کے پروگرام نشر کرنے اور ملک کی تمام قومیتوں کی ثقافتوں کو ابھارنے کے کام کی ابتداء کر دی۔

12جون 1978ء کو فرمان نمبر 5کے ذریعے نادر شاہی خاندان کے 23افراد کو بشمول ظاہر شاہ اور ان کے خاندان کو قومی غدار قرار دیتے ہوئے ان سے شہریت کے حق سمیت تمام حقوق چھین لئے گئے۔

12جولائی 1978ء کو فرمان نمبر 6کے ذریعے انقلاب کے صرف ڈھائی ماہ بعد کسانوں کو صدیوں پرانے جوئے سے آزاد کرالیا گیا۔ انقلابی حکومت لاکھوں چھوٹے کاشتکاروں کو بنیوں اور سود خوروں کے چنگل سے چھڑانے میں کامیاب ہو گئی اور تمام ناجائز قرضے اور ان کے سود یک جنبش قلم منسوخ کر دیئے گئے۔

17اکتوبر 1978ء کو، چھ ماہ سے بھی کم عرصے میں انقلابی حکومت نے پرانے

جاگیرداری اور ماقبل جاگیرداری ظالمانہ نظام میں جکڑی ہوئی عورت کی آزادی کا اعلان کیا۔ اس فرمان کے ذریعے عورت اور مرد کے حقوق برابر کر دیئے گئے۔ شادی بیاہ کی رسوم میں انقلابی تبدیلیوں کے ذریعے لڑکیوں کے رشتے کے عوض نقد رقم یا اشیاء وصول کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ دولہا سے شادی یا منگنی کے اخراجات وصول کرنا قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا۔ حق مہر کی شرح 300 افغانی (پاکستانی 93 روپے) مقرر کی گئی۔ شادی کی کم سے کم عمر لڑکوں کے لئے اٹھارہ سال اور لڑکیوں کے لئے سولہ سال قرار دے دی گئی۔

سیف خالد افغانستان کی انقلابی حکومت ان اقدامات سے بے حد خوش تھے۔ میں جام شورو سے لاہور آیا ہوا تھا۔ جب ویو پوائنٹ کے دفتر میں امین مغل کے کمرے میں سیف خالد سے ملاقات ہوئی۔ فرمان نمبر 6 اور 7 سے وہ خاص طور پر خوش اور پُر امید تھے کہ ایک روز اسی طرح ہمارے کسانوں اور خواتین کی بھی نجات ہوگی۔

آٹھواں باب

جاں سے گزر گئے
(1978-1988)

جیسا کہ گذشتہ باب میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ بھٹو کی پھانسی سے ایک روز قبل سیف خالد پر فالج کا شدید حملہ ہوا۔ ابھی وہ اس بیماری کی کشمکش میں مبتلا تھے کہ سیاسی ٹوٹ پھوٹ کا عمل تیز ہو گیا۔

این ڈی پی میں کشیدگی

سیف خالد، جو اپنی بیماری سے قبل این ڈی پی سے شکایات کے باوجود، اسی میں رہتے ہوئے جدو جہد کر رہے تھے۔ اب ان کی بیماری کے دوران پارٹی میں کشیدگی اس قدر بڑھ گئی کہ اسے یکجا اور متحد رکھنا ممکن نہ رہا۔ اسی اثناء میں پارٹی کے صدر شیر باز مزاری نے پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے عہدیداروں کو پارٹی سے نکال باہر کیا کیونکہ ان صوبوں سے بی ایم کٹی کے الفاظ میں ''بزنجو مینگل کے حمایتی لوگ آسانی سے جیت جاتے جبکہ اس نے صوبہ سرحد (خیبر پختونخوا) کے الیکشن کی بھرپور حمایت کی جہاں سے ولی خان کے حمایت یافتہ امید وار جیت گئے تھے۔

اس مسئلے پر مزید بحث کرتے ہوئے کٹی لکھتے ہیں:

’’مزاری کے گھر ایک میٹینگ کا جس میں بزنجو، مینگل، میر گل خان، قسور گردیزی، عبدالحمید جتوئی اور پارٹی کے اہم کارکنان اور راقم شریک تھے، نتیجہ یہ نکلا کہ بزنجو نے NDP سے جدا ہونے کا اعلان کر دیا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر نکل آئے۔ وہ مستی خان ہاؤس میں دوبارہ جمع ہوئے۔ اب اس گروپ کے کنوینر کے چناؤ کا سوال پیدا ہوا۔ اگرچہ سردار عطاء اللہ نے سرسری طو پر ایک یا دو نام تجویز کئے لیکن متفقہ فیصلے کے تحت میر غوث بخش بزنجو کنوینر منتخب کر لئے گئے۔ اب ایک کنوینگ کمیٹی کے قیام پر اتفاق رائے ہو گیا تاکہ نئی جماعت کے قیام کے لئے ایک خاکہ تیار کیا جائے۔ میر صاحب کو پارٹی کا نام رکھنے میں دیر نہ لگی۔ انہوں نے صریحاً اس کا نام ’’پاکستان نیشنل پارٹی‘‘ تجویز کر دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے وہاں موجود حاضرین کو بتایا کہ یہ ہماری ماسبق پارٹی تھی۔ جو تمام علاقائی جماعتوں بشمول استمان گل قلات کے ملاپ سے 1956ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس طرح انہوں نے مشورہ دیا کہ اس نام کے احیاء سے ہم اپنے اصل مقام کی طرف لوٹ سکیں گے۔‘‘

22 اپریل 1979ء کو میر غوث بخش بزنجو نے ایک تفصیلی بیان جاری کر کے صورت حال کی وضاحت کی جس کے اہم اقتباسات درج ذیل ہیں:

• این ڈی پی کی اعلیٰ قیادت نے جمعرات 19 اپریل کو پارٹی سے الگ ہونے والے سندھ، بلوچستان اور پنجاب کے ممتاز اراکین کے خلاف الزام تراشیوں کی ایک مہم شروع کر رکھی ہے اور ان بنیادی نظریاتی اختلافات کو نظر انداز کیا جا رہا ہے جن کی وجہ سے ہمیں پارٹی سے الگ ہونا پڑا۔ یہ تاثر پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ بعض بلوچ لیڈروں نے پارٹی کی قیادت پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کے بعد پارٹی سے علیحدگی اختیار کی ہے اور یہ بلوچ لیڈر اپنی الگ جماعت (بلوچوں کے لئے) بنائیں گے۔ ان کا مقصد بلوچوں اور پٹھانوں میں پھوٹ ڈالنا ہے اور ان کی علیحدگی 'بائیں بازو کے انتہا

پسندوں" کی پارٹی توڑنے کی کوشش کا نتیجہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

• حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ جنہوں نے 19 اپریل جمعرات کو پارٹی سے علیحدگی اختیار کی ہے وہ ملک بھر میں پارٹی کے اراکین کی نمائندگی کرتے ہیں اور جو لوگ ہم پر پارٹی کے "آئین" کی خلاف ورزی کا الزام دھرتے ہیں وہ ملک کے مخصوص مفادات کے "اتحادیوں" کا ایک چھوٹا سا "گروہ" ہیں اور یہ لوگ ان قوتوں کا لازمی حصہ ہیں جو جان بوجھ کر ملک میں ایک ترقی پسند جمہوری نظام کے قیام میں رکاوٹ ڈالتے ہیں یہ لوگ مخصوص مفادات رکھنے والے حکمران طبقے کے مفادات کی تکمیل کرتے ہیں جن کی نمائندگی انتہائی جارحانہ صورت میں "افسر شاہی" کرتی ہے جو عوام کے سماجی، معاشی و سیاسی استحصال کے جدید "نو آبادیاتی" نظام کو برقرار رکھنا چاہتی ہے اور یہ وہی افسر شاہی ہے جس نے 25 برس پہلے غلام محمد کی نوکر شاہی کی حکومت کے گردان (COUP) کے ذریعے سیاسی و معاشی اقتدار کی باگ ڈور سنبھالی تھی وہ ہم پر اس لئے جھپٹ رہے ہیں کہ ہم سختی کے ساتھ پارٹی "منشور" کے وفادار تھے جو "جاگیردارانہ"، "سرمایہ دارانہ" معاشرے کے خاتمے اور کسانوں، صنعتی مزدوروں اور بالعموم محنت کار طبقوں کے استحصال کی تمام مشکلوں کو ختم کرتے اور "تمام تہذیبی ولسانی وحدتوں" کے حقوق کا تحفظ کرنے اور وفاق پاکستان کی اس طرح تشکیل کرنے کی پابند تھی کہ ان "وحدتوں" کے مشترکہ مفاد پر مبنی رضا کارانہ اتحاد اور عوام کے وسیع تر اتحاد سے پاکستان ترقی کرے اور خوشحال ہو۔

• منظم افواج کو ہمارے خلاف ابھارنے کے لئے ہمارے بعض سابق رفیقوں نے یہ اشارہ کیا ہے کہ 19 اپریل کو ہم نے جو پریس کانفرنس کی تھی اس میں جناب عطاء اللہ مینگل نے مسلح افواج کے خلاف الزام تراشی کی ہے جو بقول ان کے سنگین نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں میں کہوں گا کہ اوّل تو یہ ایک بے بنیاد تہمت ہے کیونکہ پریس کانفرنس میں ان کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا تھا تاہم یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جب بھی فوج کا کوئی ایک حصہ پوری فوج، ریاست بشمول ملک کی داخلی و خارجہ پالیسیوں کو چلانے میں براہِ راست ملوث ہوتی ہے اور اس عمل میں اس سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں

تو ظاہر ہے وہ پھر تنقید سے مبرّا نہیں ہو سکتی یہی وجہ ہے کہ ہم نے این ڈی پی کے ''منشور'' کی شق نمبر 9 (ج) کے مطابق ملکی سیاست میں فوج کی مداخلت کی مخالفت کی ہے۔

یہ کہنا کہ ''پارٹی کے منشور میں ایسی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی جس سے برہم ہو کر ہم پارٹی چھوڑ دیتے'' یہ کہنا رائے عامہ کو گمراہ کرنے کی ایک کوشش ہے منشور کو تبدیل کرنا اور اس تبدیلی پر قائم رہنا زیادہ بہتر ہے نسبتاً اس کے منشور کو جوں کا توں رکھ کر سیاسی مصلحتوں کے مطابق اس کے واقعات کی خلاف ورزی کی جاتی ہے اور یہی شیر باز مزاری اور ان کے رفقاء کر رہے ہیں۔ ہم منشور پر صحیح عمل کرتے رہے اور وہ غلط۔ اس لئے ہمارے پاس پارٹی چھوڑنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، ان کی طرف سے رد و قبول پارٹی منشور اور اس کی نظریاتی روح کے مطابق نہیں تھا، انہوں نے تنظیمی طور پر بھی پارٹی کے آئین کی خلاف ورزی کی ہے۔

اعلیٰ قیادت کی طرف سے پارٹی کے تنظیمی معاملات میں پارٹی کے آئین کی خلاف ورزیاں بھی اتنی ہی سنگین تھیں اور پارٹی کے اراکین کی اکثریت اس کے خلاف تھی منشور کے خلاف ان کی سیاسی لائن کی پیروی نہ کرنے والے ممبروں کا بلا امتیاز اخراج پنجاب کے منتخب الیکشن کمیشن کو توڑنا اور اس کی چیئرمین سیدہ عابدہ حسین کو معطل کرنا، سید قسور گردیزی، رانا مقبول اور دیگر ممتاز اراکین کو خارج کرنا۔ کراچی کی حقیقی پارٹی کی تنظیم نو کو نظر انداز کرنا اور اپنی مرضی کے جی حضوریوں کے ذریعے پارٹی کی تنظیم کو چلانے کی کوشش کرنا۔ اپنے وفاداروں کے ہاتھ میں پارٹی کی قیادت و کنٹرول دینے کے لئے بار بار بلوچستان کی تنظیم کو توڑنا اور بنانا اور بالآخر ملک بھر کے چوٹی سے لے کر وارڈ سطح تک پارٹی کے عہدیداروں کو برطرف کرنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ مزاری صاحب اور ان کے رفقاء کے چھوٹے سے حلقے کا پارٹی کے عام کارکنوں پر سے اور عام کارکنوں کا ان پر سے اعتماد ختم ہو گیا تھا۔ عام کارکن اور اعلیٰ قیادت ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں کھڑے تھے۔ اور ان کے درمیان بد اعتمادی کا ایک وسیع خلاء حائل تھا اس طرح یہ ٹوٹ پھوٹ درمیان میں نہیں بلکہ قیادت اور عام کارکنوں کے درمیاں ہوئی ہے۔

مزاری صاحب اور ان کے دوستوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ گو کہ جسمانی طور پر پی این اے سے الگ ہو گئے تھے مگر ذہنی طور اب بھی پی این اے ہی کی سیاست کرنے کے پابند تھے۔ جب پی این اے نے مرکز کی غیر جمہوری حکومت میں شرکت کی تو مزاری صاحب نے یہ کہا تھا کہ این ڈی پی حکومت میں شامل نہیں ہو گی۔ مگر بدستور پی این اے میں شریک رہے گی یہ غیر منطقی مؤقف پی این اے سے این ڈی پی کی علیحدگی کے بعد بھی برقرار ہے اور این ڈی پی کی اعلیٰ قیادت واضح وجوہ کی بنیاد پر این ڈی پی کے پلیٹ فارم سے پی این اے کی رجعت پرستانہ فرقہ وارانہ اور غیر جمہوری سیاسی لائن چلانے پر تلی ہوئی ہے پی این اے تو حکومت میں سرگرمِ عمل ہے اور این ڈی پی وفادار ''حزب اختلاف'' کا کردار ادا کرنے کے لئے باہر رہی ہے یہ بات پارٹی کے منشور کی روح اور جوہر کو جو ''عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعہ ملک میں خالص جمہوریت اور قانون کی حکمرانی'' قائم کرنے (منشور کا دیباچہ شق ''ج'') اور ترقی پسند، سکالر اور جمہوری سیاست کی علمبردار ہے اسکے پاؤں تلے روندنے کے مترادف تھا کیونکہ ان کے مفادات حکمران طبقے کے مخصوص مفادات سے قریبی طور پر جڑے ہوئے ہیں اس لئے ان کو این ڈی پی کے منشور کو مسخ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

مزاری صاحب اور ان کے دوست شائد یہ نہیں جانتے کہ اب وقت ان کے ساتھ نہیں ملک کے محنت کار عوام ''قومی جمہوری انقلاب'' چاہتے ہیں تاکہ وہ نوآستعماری نوکر شاہی سے سیاسی اور معاشی اقتدار چھین سکیں جیسے وہ گذشتہ تیس برس سے غصب کئے بیٹھی ہے ہم نے ثابت قدمی کے ساتھ منشور کا دفاع کیا ہے اور انہوں نے کھلے عام اس کی خلاف ورزی بالآخر ہم نے پارٹی چھوڑی تاکہ این ڈی پی کے منشور کے ''شق نمبر 1 ''(د) کے مطابق وطن دوست عوام یعنی مزدوروں، کسانوں، چھوٹے زمینداروں، چھوٹے مالکوں، چھوٹے کارخانہ داروں، پیدا کاروں، کاروباری افراد وطن دوست، قومی سرمایہ دار، درمیانہ طبقے کے دانشور، پیشہ وروں، تکنیک کاروں، دفتری کارکنوں اور طالب علموں کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر قومی جمہوریت کے حصول کے لئے کوشش کریں۔ ملک کے تمام

حصوں میں این ڈی پی کے عام کارکنوں کی اکثریت ہمارے ساتھ ہے اور دوسری جمہوری اور ترقی پسند قوتوں کے ساتھ مل کر اس مقصد کے حصول کے لئے ہم کوشش کریں گے۔ ظاہری اور پوشیدی ہر قسم کی دھمکیاں، کیچڑ اچھالنا، جھوٹ بلیک میلنگ اور بہتان تراشی ہمی ہمارے مشن سے باز نہیں رکھ سکتی۔''

کراچی میں ڈیموکریٹک کنونشن اور پاکستان نیشنل پارٹی کا قیام

این ڈی پی سے نکلنے کے بعد کراچی میں ایک جمہوری کنونشن کا انعقاد ہوا جس نے پاکستان نیشنل پارٹی کے قیام کی راہ ہموار کی۔ بی ایم کٹی کے الفاظ میں:

''یکم جون 1979ء کا اجتماع جمہوریت پسند سامراج مخالف قوتوں کے اظہار کا بے مثال نمونہ تھا جسے ملک بھر میں سراہا گیا۔ ملک کے چاروں صوبوں سے وفد شریک ہوئے۔ ان میں مختلف ترقی پسند، بائیں بازو کے اور قوم پرست ارکان، مصنف، شعراء ٹریڈ یونین کے عہدیداران، حقوق انسانی کے علمبردار شامل تھے۔ اس میں وہ رہنما اور ورکرز حضرات بھی شریک تھے جنہوں ے یا تو ''این ڈی پی'' کو خیر باد کہہ دیا تھا یا اس میں ابھی تک شریک نہیں ہوئے تھے، مثلاً بلوچستان سے میر غوث بزنجو، سردار عطاء اللہ مینگل، میر گل خان نصیر، میر محمود عزیز کرد، ڈاکٹر عبدالحکم لہڑی، بزن بزنجو، امیر الملک مینگل، ڈاکٹر عبدالحئ بلوچ، ملک عبدالعلیٰ کاکڑ اور دیگر ارکان۔ سندھ سے عبدالحمید جتوئی، سید شاہ محمد شاہ، قمر الزمان راجپر، ابوبکر زرداری، یوسف مستی خان، ڈاکٹر ایم اے محجوب، فصیح الدین سالار، بی ایم کٹی، بابر ایاز، ڈاکٹر رکن الدین حسان، لالہ گل محمد، قادر بخش مطاہر، کرامت علی، عثمان بلوچ، داد رحمان، لالہ محمد حسین، لال بخش رند وغیرہ۔ اسی طرح پنجاب سے سید قسور گردیزی، شمیم اشرف ملک باجی نسیم اشرف ملک، سید امتیاز علی شاہ، اور ظفر ملک وغیرہ اور صوبہ سرحد سے ڈاکٹر شیر افضل ملک، مصطفیٰ کمال وغیرہ نے شرکت کی۔ اس میں دوسری پارٹیوں کے اہم افراد جیسے قربان علی شاہ، شہرت یافتہ عوامی شاعر حبیب جالب، ٹریڈ یونین لیڈرز شفیق قریشی، طفیل عباس، نبی احمد، کنیز فاطمہ، سلیم رضا اور سیکڑوں دیگر اہم شخصیات

نے بھی شرکت کی۔ پارٹی پروگرام اور آئین کا ایک ڈرافٹ منظور کر لیا گیا اور ایک انتظامی کمیٹی بنائی گئی جسے رکن سازی کی مہم اور ہر حلقے کے پارٹی الیکشن کے انعقاد یعنی وارڈ کی سطح پر نیشنل کونسل تک کی ذمے داری سونپی گئی۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ نئی جماعت کا پہلا نیشنل کونسل سیشن اکتوبر 1979ء میں لاہور میں منعقد ہو گا۔ اس وقت کے سیاسی اور اقتصادی معاملات پر نہایت سنگین نوعیت کی قرارداد پاس کرنے کے علاوہ میر صاحب نے ایک اور اہم اعلان کیا کہ اگر مذہبی جماعتوں کے عناصر نے افغانستان کا انقلاب مخالف ایکشن کمیٹیاں قائم کیں تو پاکستان نیشنل پارٹی فوری اپنا ردعمل ظاہر کرے گی اور افغانستان کے انقلاب کے دفاع میں آواز اٹھائے گی۔

سیف خالد کی سنگین علالت:

یہ سارا عرصہ سیف خالد علیل رہے۔ 1979 کے آخری دن تھے، جب ڈاکٹر اعزاز نذیر کے فرزند حسن ناصر ان سے ملنے لاہور آئے۔ ان کا کہنا ہے کہ سیف چاچا خاصے بیمار تھے۔ میں ملنے گیا تو شمیم آنٹی اپنی بیماری بھول کر ان کی تیمار داری میں لگی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر بولیں ''چاچا کو مل لو لیکن ان دنوں وہ کسی کو پہچانتے نہیں''۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ کروٹ لے کر لیٹے ہوئے تھے۔ آنٹی نے کہا، ''سیف! دیکھو کون آیا ہے''۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا اور بولے ''بیٹا آیا ہے''۔ ان کی بیماری کی شدت میں کمی ضرور آجاتی تھی لیکن ان کی صحت مکمل طور پر کبھی بحال نہ ہو سکی۔ اسی حالت میں وہ جون 1979 میں کراچی منتقل ہو گئے لیکن 1979 کے اختتام تک وہ لاہور واپس آ گئے۔

بیماری کے ابتدائی دور میں ابھی وہ لائلپور میں ہی تھے کہ بقول ان کی صاحبزادی:

> ''لاہور سے ایک سپشلسٹ کو بلایا گیا جنہوں نے دیکھ کر بتایا کہ وہ اپنی باقی زندگی نہ بول سکیں گے نہ بیٹھ سکیں گے۔ اگر انہیں بر وقت طبی امداد مل جاتی تو شاید وہ بچ جاتے۔ لیکن ہم بچوں کو ان تمام چیزوں کا ادراک نہیں تھا۔ ہم بچے دو ہسپتالوں میں بٹ گئے۔ اگر میرا بھائی

ایک ہسپتال کھانا لے کر جاتا تو میں دوسرے ہسپتال جاتی۔ گھر کا بندو بست ہماری پھوپھی نے سنبھال لیا تھا۔ ابھی امی کی پٹیاں بھی نہیں کھلی تھیں جب انہوں نے ابو کو اٹھانا شروع کر دیا۔ امی کی پٹیوں سے خون رواں ہوتا لیکن وہ اپنی طرف توجہ دیئے بغیر اپنے شوہر کی تیار داری میں مصروف ہوتیں۔ ہر روز صبح ابو کا اصرار ہوتا کہ انہیں ہسپتال لے جایا جائے۔ شام کو کہتے کہ مجھے گھر جانا ہے۔

ہسپتال جاتے ہوئے انہیں امید ہوئی کہ وہ ٹھیک ہو جائیں گے، جب یہ امید دم توڑ دیتی وہ گھر لوٹ آتے لیکن ان کی امید ہمیشہ قائم رہی کہ وہ ایک روز ٹھیک ہو جائیں گے۔ جب ڈاکٹر نے انہیں فیز یو تھراپی کرانے کا کہا تو لائل پور میں کوئی اچھا فیزیو تھراپسٹ موجود نہیں تھا۔ انہیں علاج کے لئے لاہور یا کراچی منتقل کرنے کی ضرورت تھی۔ 1980 کے آغاز میں گھر کو کرایہ پر چڑھا کر امی ابو کو کراچی لے آئیں اور بچے لاہور میں خالہ کے گھر منتقل ہو گئے۔ کراچی میں ابو خوش نہیں تھے۔ وہ بزنس میں بھی مطمئن نہیں تھے ان کے پارٹنر عبدالرزاق کے مشورے پر انہیں لاہور لے جایا گیا۔ اسی دوران ان کے بڑے بیٹے کی منگنی ان کے دوست ملک نورانی اور ممتاز نورانی کی بیٹی حوری سے طے پا ئی۔ ہمارے تایا ایسے موقع پر منگنی سے خائف تھے لیکن ابو اور امی نے بیٹے کا ساتھ دیا۔ 1981ء کے اوائل میں وہ ابو کو لے کر لاہور آ گئیں۔

ہم سب لوگ لاہور میں نیو مسلم ٹاؤن میں رہنے لگے۔ اسی دوران ہمیں پتہ چلا کہ امی کا کینسر پھیل چکا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ امی صرف چند مہینے کی مہمان ہیں اور وہ تین سے چھ مہینے سے زیادہ جی نہ پائیں گی۔ دو ماہ کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ندیم جو کہ ماسکو میں اپنے فائنل امتحان دے رہے تھے کو ان کی والدہ کے انتقال کی اطلاع نہیں

دی گئی۔ امی نے وفات کے صرف دو دن پہلے اپنے بیٹے سے فون پر بات کی اور اسے تسلی دیتی رہیں کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔تم پاکستان صرف تعلیم مکمل کر کے ہی آؤ گے۔

ہم نے بہت اصرار کیا وہ اسے آخری مرتبہ مل لیں لیکن انہیں خدشہ تھا کہ وہ پاکستان آیا تو واپس نہیں جا پائے گا۔''

27 مئی 1981ء کو لاہور میں بیگم شمیم اپنے محبوب شوہر اور بچوں کو داغِ مفارقت دے کر زندگی سے رخصت ہوگئیں۔ ان کے انتقال کی اطلاع ماسکو ان کے بیٹے ندیم خالد کو نہ دی گئی کہ ان کے امتحانات ہو رہے تھے۔ یہ اطلاع انہیں پندرہ بیس روز بعد دی گئی۔ سیف خالد کی دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ لیکن انہوں نے حوصلہ نہ ہارا۔ ان کی طبیعت آہستہ آہستہ سنبھلنے لگی۔ 1981ء تا 1986ء وہ لاہور میں ہی رہے۔ اب انہوں نے لاٹھی کے سہارے چلنا پھرنا سیکھ لیا تھا۔''ویو پوائنٹ'' کا دفتر ان کے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ وہ کئی بار لاٹھی ٹیکتے ہوئے ویو پوائنٹ کے دفتر آجاتے۔ یہاں وہ ایلس فیض سے گپ شپ کرتے۔ امین مغل ابھی ویو پوائنٹ میں ہی تھے۔ ان کی سب سے دلچسپ گپ شپ میاں نظام سے ہوتی جو فیض صاحب کے زمانے سے پرانے ریکارڈ کیپر تھے۔ ان دنوں میرا کراچی میں قیام تھا جب بھی لاہور آنا ہوتا، ان سے ضرور ملاقات ہوتی۔ 1981۔1986 کے دوران ضیاء الحق کی آمریت عروج پر تھی۔ معروف شاعرہ فہمیدہ ریاض ہندوستان میں جلاوطنی کاٹ رہی تھیں۔ اسی عرصے میں تحریک بحالی جمہوریت (آر ایم ڈی) کی سرگرمیاں پاکستان بھر اور سندھ میں پورے زور وشور سے جاری رہیں۔ 1983ء میں سندھ میں یہ سرگرمیاں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئیں۔

ستمبر 1983ء میں، میں لاہور آیا ہوا تھا۔ حسب معمول میں ویو پوائنٹ کے دفتر گیا وہاں سیف خالد بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کی صحت کافی تشویشناک تھی۔ بمشکل بول پا رہے تھے۔ زیادہ باتیں میں نے کیں۔ میں نے جب اندرون سندھ ایم آر ڈی کے واقعات سنائے تو وہ بے چین ہو گئے۔ چند روز قبل پنجاب کے متعدد صحافیوں اور شاعروں،

ادیبوں نے سندھی عوام کے ساتھ یکجہتی کا بیان جاری کیا تھا۔ جس کی پاداش میں بیشتر صحافیوں کو پریس ٹرسٹ کے اخبارات سے نکال دیا گیا تھا۔ امروز سے مسعود اشعر، شفقت تنویر مرزا اور بدر الاسلام کو نکال دیا گیا۔ اسی طرح ڈاکٹر انور سجاد، منو بھائی اور متعدد دوسرے ادیبوں کو ریڈیو، ٹی وی سے بین کر دیا گیا۔ سیف خالد اس بات پر خوش تھے کہ آخر پنجاب کے اہل قلم نے بھی اپنی خاموشی توڑ دی ہے۔

1985-86ء کے دوران ایم کیو ایم بنی اور نمایاں ہوئی۔ کراچی میں آپریشن کلین اپ کا شور بلند ہوا۔ 1986ء میں بے نظیر بھٹو کی لندن سے لاہور واپسی ہوئی اور تاریخی جلوس نکلا۔

1986ء میں سیف خالد کے صاحبزادے ندیم خالد انہیں اپنے ساتھ کراچی لے گئے۔ تا کہ ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جا سکے۔ اس بار وہ اپنے بیٹے کے گھر ٹھہرے۔ وہ جہاں جانا چاہتے، جس سے ملنا چاہتے، ندیم اس کا انتظام کر دیتے۔ ان کے پرانے ساتھی مرزا زین العابدین بتاتے ہیں کہ:

''جب سیف خالد نے کراچی جانے کا فیصلہ کیا تو انہوں نے مجھے بلایا۔ پاک۔ چیکوسلواکیہ فرینڈ شپ سوسائٹی کے پروگرام وہ تواتر سے کرتے تھے۔ اس سوسائٹی کا سامان جس میں ایک پروجیکٹر، کتابیں، مارکس، لینن، اینگلز کی بڑی تصاویر اور رسائل شامل تھے۔ میرے حوالے کر دیا۔ میں نے وہ تمام سامان لاثانی پل، سرگودھا روڈ پر واقع اپنی ورکشاپ میں منتقل کر دیا۔ یہ ضیاء دور تھا اور ہمارے گھروں اور کام کی جگہوں پر پولیس چھاپے معمول کی بات تھی۔ اس لئے بہت سی تصاویر اور کتابیں کامریڈوں میں تقسیم کر دیں۔ جب میں گرفتار ہوا تو بہت سی کتابیں اور مواد ورکشاپ کے ملازمین نے گڑھا کھود کر دفن کر دیا۔ جس سے وہ ضائع ہو گیا۔

نواز بٹ سیف خالد سے اپنی آخری ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

''1981ء میں، میں پارٹی سے الگ ہو گیا تھا مگر دوبارہ ہائی جیکنگ کیس میں پکڑ کر جیل میں ڈال دیا گیا۔ معراج محمد، فتحیاب علی

خان، پیار علی الانہ، امیر حیدر خان، سب کو 15 نمبر بیرک میں رکھا گیا
تھا۔ ہم تین چار ماہ بعد رہا ہو گئے یہ 1988ء کی بات ہے۔ سیف
خالد سے میری آخری ملاقات پاک۔ سوویت فرینڈز سوسائٹی کے ایک
پروگرام میں ہوئی۔ میر غوث بخش بزنجو نے خطاب کرنا تھا۔ سیف خالد
اپنی لاٹھی لئے بیٹھے تھے۔ میں حیران تھا کہ اس حالت میں بھی آ گئے۔
پھر ایک رات فون آ گیا کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔"

اس تقریب میں میں بھی شامل تھا اور میں نے انہیں اس روز آخری بار دیکھا تھا۔
ان کے ایک پرانے ساتھی مہدی انور کے بیٹے منیب انور ان کے آخری دنوں کے بارے
میں کہتے ہیں کہ وہ دن بہت تکلیف کے تھے۔ ان کا درد ناقابل برداشت ہو گیا لیکن اس
حالت میں بھی ان کی آنکھوں میں زندگی کی چمک تھی۔

جون 1988ء میں میں کراچی سے لاہور آ گیا۔ وہیں ویو پوائنٹ کے دفتر میں،
مجھے سیف خالد کے انتقال کی خبر ملی۔ وہ ایک روز قبل 7 جولائی کو کراچی میں انتقال کر
گئے۔ "سرخ پرچم" نے ان کے انتقال کی خبر ان لفظوں میں دی:

"پارٹی کے دیرینہ رفیق اور رہنما کامرید سیف خالد طویل
علالت کے بعد 7 جولائی کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر
60 سال تھی۔ کامریڈ نے اپنی وراثت میں ایک طویل شاندار جدو جہد
چھوڑی ہے جو پارٹی کے لئے باعث افتخار ہے۔

سیف خالد پارٹی کے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اس میں
شامل ہوئے انہوں نے عملی سیاست کی ابتداء ڈی ایس ایف میں
شمولیت سے کی۔ وہ اپنے کالج کے جریدے کے ایڈیٹر بھی رہے۔
1954ء میں پارٹی پر پابندی کے بعد وہ نیشنل عوامی پارٹی لے پلیٹ
فارم سے کام کرنے لگے اور اس کی مرکزی کمیٹی کے ممبر، مرکزی نائب
صدر اور پنجاب شاخ کے سیکرٹری جنرل رہے۔ نیشنل عوامی پارٹی پہ

پابندی کے بعد وہ این ڈی پی (پروگریسو) کے بانی کنوینر اور بعد ازاں نیشنل پروگریسو پارٹی کے نائب صدر رہے۔ وہ پنجاب میں پاک سوویت فرینڈشپ سوسائٹی کے بانیوں میں سے تھے۔

اپنی طویل سیاسی جدو جہد کے دوران انہیں بار بار جیل کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ انہیں بدنام زمانہ شاہی قلعہ کے ٹارچر سیل میں بھی رکھا گیا۔ 1978ء میں ان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ معذوری کی بنا پر زیادہ فعال نہیں رہ سکے۔ پارٹی کی تقسیم کے بعد دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر انہوں نے پارٹی کے اتحاد کے لئے کوششیں کیں جو نام نہاد اکثریتی دھڑے کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکیں۔

پارٹی کا توسیعی اجلاس اپنے تمام ساتھیوں اور مرحوم کے اہل خانہ کے غم میں برابر کا شریک ہے اور کمیونسٹ آدرش کے لئے مرحوم کی چالیس سالہ جدو جہد کو سلام پیش کرتا ہے۔

سیف خالد کے انتقال کو چالیس دن گزر چکے تھے جب 17اگست 1988ء کو بہاولپور کی سرزمین سے ایک طیارہ ہوا میں بلند ہوا اور بلند ہوتے ہی پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ روایات کے مطابق طیارے میں آموں کی پیٹیاں رکھی تھیں جن میں دھماکہ خیز مواد بھرا گیا تھا۔ اسی تھیم پر مشہور صحافی محمد حنیف نے انگریزی زبان میں اپنا ناول لکھا جسے عالمی شہرت نصیب ہوئی۔

یہ وہی ضیاء الحق تھا جس کے خلاف سیف خالد ان کے ساتھیوں اور ان کی پارٹی نے زندگی بھر جدو جہد کی۔

سیف خالد کا کردار

سیف خالد نے ایک بھرپور سیاسی زندگی گزاری۔ ساٹھ برس کی عمر میں کم و بیش ساٹھ برس ہی زندگی کی۔ ان کے دوستوں اور ساتھیوں نے ان کے بارے میں جو کچھ کہا،

وہ ان کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔ ہم ان کے چند رفیقوں کی گفتگو سے اقتباسات پیش کرتے ہیں جو ان کی شخصیت اور کردار پر روشنی ڈالتے ہیں۔

میں نے 30 جنوری 2017ء کو پروفیسر جمال نقوی سے رجوع کیا۔ ان کے الفاظ میں:

> ''سیف بہت اچھے انسان اور بہت اچھے رفیق تھے۔ ان سے جو بھی ملاقاتیں تھیں، پارٹی کے حوالے سے ہی تھیں۔ اندازاً کہہ سکتا ہوں کہ پہلی ملاقات لاہور میں، 50-1949ء میں ہوئی ہوگی''

بقول نواز بٹ:

> ''سیف خالد نے ناظم آباد میں ایک مکان لیا ہوا تھا۔ جب انہیں فالج سے قدرے افاقہ ہوا تو اہل خانہ انہیں لے کر کراچی اس مکان میں آگئے۔ میں دو تین بار وہاں گیا لیکن سیف کو اس حالت میں دیکھنا ناقابل برداشت تھا۔ اس سے پہلے میں نے سیف خالد اور میاں محمود احمد کو بھاگتے، دوڑتے ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے دیکھا تھا۔ بعد ازاں دونوں میں روس چین کے معاملے پر سرد مہری رہی۔ جب این ڈی پی بنی، میں اور سیف اکٹھے تھے۔ ہم نے اس کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ جب رابطہ کمیٹی بنی تو ہم نے برکت علی ہال لاہور میں اس کا بڑا جلسہ کیا۔ جالب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ سیف خالد نے اجلاس کی صدارت کی۔ نیشنل پروگریسو پارٹی میں سیف خالد صدر اور میں سیکرٹری تھا۔ پارٹی کے اعلان کے لئے سیف خالد نے پریس کلب لاہور میں پریس کانفرنس کا اہتمام کیا۔ شمیم اشرف ملک نے حسن رفیق کو پنجاب پارٹی کا صدر بنایا تو سیف اس کا بہت مذاق اڑاتا تھا۔''

پروفیسر عبدالقیوم بتاتے ہیں کہ سیف سے ملاقات سے قبل ان سے ذہنی ملاقات تھی۔ لائل پور میں ترقی پسندی کا ذکر آئے تو ممکن نہیں کہ سیف خالد کا ذکر نہ ہو۔ لائل پور

میں ترقی پسندی کی جو روشنی دکھائی دیتی ہے وہ سیف خالد کی جلائی ہوئی شمع کے سبب تھی۔
پروفیسر عبدالقیوم مزید کہتے ہیں

''اس اثناء میں لائل پور میں فیض کی 65ویں سالگرہ منائی گئی۔ اس تقریب میں بائیں بازو کے ستر کارکنوں نے شرکت کی۔ اس میلے میں صرف دو خواتین کے نام شامل تھے ایک سیف خالد کی اہلیہ اور ایک میری بیوی شاہینہ۔

اس میں کیوبا کے یوتھ فیسٹیول کی تیاری کمیٹی تشکیل دی گئی۔ میں نے اس میں کافی حصہ لیا۔ کمیونسٹ پارٹی سے اس تیاری کمیٹی میں عزیز موٹا، میری اہلیہ شاہینہ اور میں خود نمائندگی کر رہے تھے۔ شاہینہ اس کمیٹی کی سیکرٹری جب کہ ایک وکیل ذوالقرنین جو کیمونسٹ پارٹی کے رکن تو نہیں تھے مگر لیفٹ کے حامی تھے اس کمیٹی کے صدر بنے۔ کمیٹی میں زین مرزا سمیت کافی دوست بھی شامل تھے۔

کیوبا یوتھ فیسٹیول کی تیاری کے حوالے سے لائل پور میں خوب سر گرمی ہوئی۔ اس حوالے سے تقریب کرنے کا فیصلہ ہوا تو کوئی تقریب کے لئے جگہ دینے کو تیار نہیں تھا تا ہم سیف خالد اور رانا حمید نے منزدا کلب میں تقریب کے لئے اجازت حاصل کر لی۔ تقریب کے لئے خوب لوگ جمع کئے گئے۔ تا کہ دھوم دھام سے تقریب ہو۔ پنڈال جم گیا اور سٹیج پر سیکرٹری نے جیسے ہی تقریب کے آغاز کا اعلان کیا تو پولیس نے کلب کو گھیرے میں لے لیا۔ پارٹی کے رہنماؤں اور تیاری کمیٹی کے پنڈال کے کارنر پر ہنگامی میٹنگ ہوئی۔ جس پر میں نے غصہ میں کہا کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے اتنی تیاری ہوئی اب ہر صورت تقریب ہو گی۔ پولیس نے روکا تو ٹکرا جائیں گے۔ جس پر سیف خالد نے تقریب کی مخالفت کی اور کہا کہ تقریب کرنے سے اب کیا ہو گا؟ کیا انقلاب آ جائے گا؟ جس

پر میں نے کہا کہ انقلاب تو نہیں ہو گا مگر ہم نے تقریب کے لئے اتنی محنت کی ہے۔ جس پر سیف خالد نے کہا کہ ''سب لوگ آ گئے، تقریب بن گئی۔ ہمارا مقصد پورا ہو گیا۔، اب تقریب کر لو گے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا نہ کرو گے تب بھی کچھ نہیں ہو گا، میں یہ نہیں چاہوں گا کہ بلا وجہ کی قربانیاں دو۔''

سیف خالد سے ابتدائی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر عبدالقیوم بتاتے ہیں:

'' 1973ء میں جب ایم ایس سی کر کے لاہور سے لائل پور آیا تو اس وقت میں کیمونسٹ پارٹی کا رکن بن چکا تھا۔ تعلیم مکمل کر کے لاہور سے لائل پور واپس ہوا تو کیمونسٹ پارٹی کی جانب سے مجھے کہا گیا کہ لائل پور میں سیف خالد سے ملوں۔

یہ نہیں یاد کہ کس طرح ملاقات ہوئی۔ تاہم ان سے ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ ان دنوں لائل پور میں صرف سیف خالد کی بیوی واحد خاتون تھیں جو لیفٹ کے حوالے سے جانی جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ ایک اور خاتون صبیحہ شکیل جو لیفٹ سے تو نہیں تھیں مگر مزدور یونین کے حوالے سے سرگرم تھیں۔

جن دنوں سیف خالد سے میری ملاقات ہوئی نیپ پر بھٹو نے نئی نئی پابندی لگائی تھی۔ ان دنوں ولی خان کا یہ مؤقف تھا کہ ''مجھے بھٹو کے خلاف شیطان سے بھی ملاقات کرنا پڑے تو کروں گا۔'' ان حالات میں سیف خالد کو نئی پارٹی بنا کر اس کا سیکرٹری بنایا گیا تھا۔

''ایک بار میں نے سیف خالد سے سوال کیا کہ وہ کیمونسٹ کیسے بنے۔ سیف خالد بتانے لگے ''میں میٹرک امتحان دے کر فارغ ہوا اور نتیجے کا انتظار تھا کہ والد کے پاس جیل چلا جاتا جو سپرنٹنڈنٹ جیل تھے۔ وہاں ایک قیدی بابا لال خان سے ملاقات ہوئی جو کئی ملاقاتوں پر پھیل

گئی۔ جب میرا میٹرک کا رزلٹ آیا تو میں کیمونسٹ بن چکا تھا۔ بابا لال خان کیمونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اور اُن اولین کیمونسٹوں میں سے تھے جن سے میں نے کیمونزم کی تعلیم حاصل کی۔ سیف خالد سے میں بے حد متاثر تھا، ان کی باتوں کو دھیان سے سنتا۔ وہ دوسرے ہارٹ اٹیک سے بچ کر گھر واپس آئے تو مجھے بتانے لگے''یار قیوم، میرے ساتھ عجیب بات ہوئی۔ڈاکٹر احسان اور فلاں فلاں مجھے دوائی دے رہے تھے تو ان کے چہروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں میرے بچنے کی امید نہیں ہے۔ اس دوران نرس نے گھبراہٹ میں مجھے مطلوبہ ڈوز سے زیادہ دوائی دے دی جس پر ڈاکٹرز اس نرس کو ڈانٹنے لگے۔ مگر اس اوور ڈوز کے مثبت اثرات ظاہر ہونے لگے اور میں بہتر نظر آنے لگا۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جیسے کوئی ڈرامہ چل رہا ہو۔ اب میں تماشا نہیں بلکہ خود تماشائی تھا۔ اب ڈاکٹر بالکل پُرسکون ہو چکے تھے۔ میں بالکل پریشان نہیں تھا۔ اگر مجھے یہ خیال آیا کہ میرے بچے چھوٹے چھوٹے ہیں اور میں نے بیٹی کی شادی کرنی ہے تو میں پریشان ہوتا اگر یہ خیال آتا کہ بڑے بڑے گناہ کیئے ہیں، آگے جا کر حساب دینا پڑے گا تو پریشانی کی بات تھی۔ میں نے سوچا میں نے کون سا آگے جا کر کوئی حساب دینا ہے۔ زندگی بھر جدو جہد کی ہے۔ مر بھی گیا تو کیا ہے، سیف خالد کی یہ بات سن کر موت کے بارے میں میرا خوف ختم ہو گیا۔۔۔ سیف خالد کا انسانی حسن اور خوبی کا معیار ایک تھا۔ ان کے منہ سے کبھی نہیں سنا کہ فلاں کیمونسٹ ہے اس لئے اچھا ہے اور فلاں کیمونسٹ نہیں ہے، اس لئے اچھا نہیں ہے۔''

صحافی جاوید صدیقی کے بقول:

''میری صحافت سے وابستگی 1971ء کے اوائل میں ہوئی۔ میرا

تعلق چونکہ پی ایس ایف سے رہا تھا۔ میرے بائیں بازو کے حلقوں سے روابط رہے۔ سیف خالد سے میرا تعارف پروفیسر میر عبدالرشید عشک صاحب کے ذریعے ہوا۔ انہوں نے سیف خالد سے ملنے کا کہا تو میں ان سے ملنے گیا۔

اس دور میں سیف خالد کے گھر کے سامنے دکانیں نہیں تھیں اور شام کو گھر کے باہر مجلس لگتی جہاں سیف خالد اور دوست بیٹھتے تھے، روز محفل سجتی، لوگ یہاں آکر بیٹھتے اور سیاسی گفتگو ہوتی۔ سیف خالد کی سیاسی بیٹھک میں مختلف قسم کے لوگ آتے۔ اس محفل میں مکالمہ ہوتا تھا جس میں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ بہت رکھ رکھاؤ والے تھے۔ میں چھوٹا تھا بہت شفقت سے پیش آتے۔ اسی گلی میں ہی میاں محمود احمد رہتے تھے جو مولانا بھاشانی کے چین نواز گروپ کے تھے۔ سیف خالد اور ان میں سیاسی اور نظریاتی اختلافات ہونے کے باوجود بہت گہرا تعلق تھا۔ ان کی محفل میں قائد اعظم جب لائل پور تشریف لائے تو ان کے گارڈ بننے کی سعادت حاصل کرنے والے ظفری بٹ سے لے کر دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے شہر کے سیاسی کارکن بھی آتے تھے۔ ان کی محفل میں مخالف کا نقطۂ نظر سننے اور مکالمے کی تربیت ہوتی تھی۔ سیف خالد کا اپنا رجحان تو نیپ کی طرف تھا مگر پیپلز پارٹی کے پہلے صدر میاں اقبال جو بعد میں سینیٹر بھی بنے ان کی محفل میں بیٹھتے تھے۔ سیف خالد گو کہ نیپ ولی خان کے حامی تھے مگر وہ دوسری جماعتوں کے اچھے اقدامات اور پالیسی کی تعریف کرنے میں کبھی کنجوسی نہیں کرتے تھے۔

شہر میں ان کے گھر کے باہر محفل ایک باقاعدہ سٹڈی سرکل ہوتا تھا۔ گو کہ انہوں نے اس کو کوئی نام نہیں دیا تھا۔ ان کی اس محفل میں

مخالف سیاسی جماعتوں کے کارکن بھی آتے اور سیاسی سوالات اٹھاتے تو ان کو بہت نرمی سے جواب دیتے تھے۔''

سیف خالد کے دو بھانجوں عبدالوحید اور نجم الحسن نے سیف خالد کی شخصیت کا خوب احاطہ کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں:

''سیف خالد بہت اچھے منتظم تھے۔ وہ ایجی ٹیشن کی سیاست نہیں کرتے تھے۔ وہ خاموشی سے کام کرتے تھے۔ انہوں نے لکھنے کا کام نہیں کیا لیکن خطوط بہت جذباتی انداز میں لکھتے تھے۔۔۔ سیف خالد نے گھر پر ہی سٹڈی سرکل قائم کر رکھا تھا اور خود مارکسزم پڑھاتے تھے۔۔۔

سیف خالد کا رنگ سانولا تھا مگر بہت پر کشش شخصیت کے مالک تھے۔ بہت ملنسار اور عاشق مزاج تھے۔ ان کی سی آر اسلم سے بہت دوستی تھی۔ ایک بار ان کے گروپ کے ساتھ سی آر اسلم کا غان گئے تو یہ کہتے ہوئے واپس چل دیئے کہ سیف! یہ کن کھڈوں میں لے آئے ہو۔۔۔ سٹڈی سرکل، ثقافتی سرگرمیاں، طلباء کی اعانت اور سیاسی کردار سیف خالد کی شخصیت کے اہم پہلو رہے۔ سماجی طور پر بہت متحرک تھے۔ کراچی میں ان کے بہت دوست تھے۔ رحمان ہاشمی، ڈاکٹر کرمانی، بیرسٹر ددود وغیرہ سے اچھی دوستیاں تھیں۔ بیماری میں بھی رحمان ہاشمی اور کرمانی سے ملنے چلے جاتے تھے۔ ہمارا دفتر شاہراہ فیصل پر تھا۔ عمارت کی سیڑھیاں عمودی اور چڑھنے میں بہت مشکل تھیں۔ سیف خالد چھڑی کے سہارے چلتے تھے مگر وہ یہ سڑھیاں چڑھ کر ملنے آجاتے۔ ان کی وجہ سے یہ شخصیات ہماری بھی دوست بن گئیں۔۔۔ سیف خالد کے پاس بڑی لائبریری تھی۔ ان کی کتابیں، بعد میں لوگ لے گئے۔ ایک بار پولیس والے آئے اور کہا کہ پوری لائبریری لے جانی ہے۔ لائل پور

میں سیف خالد کے دوستوں میں دادا لطیف اور رانا ذوالقرنین بھی تھے۔ اُن کے دوستوں میں ستار بھی شامل تھا۔ جو نہایت ذہین تھا مگر کسی بیماری کی وجہ سے اُسے نوکری ملنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ سیف خالد نے اپنے بڑے بھائی سے کہہ کر اسے ملز میں نوکری دلوادی۔ وہ بہت تیز تھا اور جلد ہی اُس نے وہاں اپنی جگہ بنالی اور بعد میں ٹیکسٹائل ملز میں اہم عہدوں پر تعینات رہا۔

سیف خالد کی انسانوں سے محبت ضرب المثل تھی۔ انسان تو انسان، وہ جانوروں سے بھی کم محبت نہیں کرتے تھے۔ ان کی صاحبزادی صبوحی گل کو آج تک یاد ہے کہ "انہوں نے گھر میں دو کتے بھی پال رکھے تھے جو ہمارے خاندان کا اہم حصہ تھے ان کا نام گپو اور کملی تھے۔"

سیف خالد کی پرانی رفیق کلثوم جمال اپنے شوہر عاصم جمال کے ساتھ طویل عرصہ تک کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں میں کافی فعال رہی ہیں۔ انہیں اپنے سے سینئر کامریڈ سیف خالد کے ساتھ کام کرنا اچھی طرح یاد ہے۔ وہ پرانے دنوں کو یاد کرتے ہوئے بتاتی ہیں:

"سیف خالد کو میں تب سے جانتی ہوں جب میں صرف پندرہ برس کی تھی۔ میری وابستگی کمیونسٹ پارٹی کے طلبہ محاذ سے تھی۔ سیف خالد بھی اپنی طالب علمی کے دور میں ڈی ایس ایف کے سرگرم رہنما تھے بعد میں کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے سیاسی محاذ نیپ اور این پی پی وغیرہ پر کام کرتے رہے۔ انہوں نے نوجوانی سے لے کر آخری وقت تک بھرپور طریقے سے سیاسی کام کیا۔ میری ملاقات اکثر ان کے گھر پر ہوتی کیونکہ میں انجمن جمہوریت پسند خواتین (پارٹی کے خواتین محاذ پر کام کرنے لگی تھی۔ انجمن کی سرگرمیوں کی رپورٹ وہ ماسکو کے اخبارات میں بھیجتے تھے۔ مجھ سے کہا کرتے کہ میں آپ کے کام کو بہت غور سے دیکھتا ہوں، وہ لائل پور میں پارٹی کی سیاسی اور دیگر محاذوں کی

سر گرمیوں کا محور تھے۔ نیشنل عوامی پارٹی، پاک سوویٹ فرینڈ شپ سوسائٹی، انجمن ترقی پسند مصنفین، لیبر فیڈریشن اور کسان کمیٹی کی سر گرمیوں کا وہ خود اہتمام کرتے۔انہوں نے لائل پور میں ولی خان اور اسفندیار ولی کا جلسہ بھی منعقد کروایا جہاں میری نیپ کے مرکزی رہنماؤں سے ملاقات رہی۔ افراسیاب خٹک کی گرفتاری کے بعد ہم نے لائل پور میں مظاہرے اور جلوس منظم کیے۔ جب رہائی کے بعد افراسیاب لائل پور آئے تو سیف خالد نے ان سے میرا تعارف کرواتے ہوئے پوچھا 'انہیں جانتی ہو، یہ وہی افراسیاب ہیں جن کی رہائی کے لیے تم نے مظاہرے کئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک دبلا پتلا اور گورا سا لڑکا تھا۔ یہ اس وقت کے افراسیاب تھے۔ میں 1976ء میں پارٹی کی دوسری کانگریس میں بھی شریک ہوئی، جس میں سیف خالد بیشتر کارکنوں کی توجہ کا مرکز تھے۔ پارٹی کی طرف سے مختلف عوامی محاذ بنائے جاتے۔لائل پور میں سیف خالد ان تمام محاذوں میں شرکت اور رہنمائی کرتے۔ وہ پارٹی کے کارکنوں کو متحرک رکھتے۔ وہ زندہ دل اور انتہائی متحرک کامریڈ تھے اور اپنی رائے کو متحرک طریقے سے بیان کرتے تھے۔"

اُن کے دیرینہ دوست، شاعر اور ادیب مسعود قمر جواب سویڈن میں مقیم ہیں بتاتے ہیں: بعض لوگ شہر کی پہچان ہوتے ہیں شہر کا مان ہوتے ہیں شہر کا چہرہ ہوتے ہیں سیف خالد لائل پور کا چہرہ لائل پور کا مان تھے۔ خاص طور پر لائل پور میں بائیں بازو کی سیاست کرنے والوں کے لیے وہ بہت بڑا سہارا تھے۔ وہ نہ صرف بائیں بازو کی سیاست کرنے والوں کے ہر دلعزیز تھے بلکہ دائیں بازو کی سیاست کرنے والوں کی دل میں بھی ایک مقام رکھتے تھے اور شہر کے بہت سے دائیں بازو کی سیاست کرنے والوں کے دل میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، یہ سب ان کے پاس آکر نہ صرف ملکی سیاست صورت حال پہ تبادلہ خیال کرتے تھے بلکہ اپنی سیاسی زندگی کے بارے فیصلہ کرنے سے پہلے ان

سے تبادلہ خیال ضرور کرتے تھے پاکستان پیپلز پارٹی سے وابستہ لوگ اکثر ان سے صلح مشورہ کرتے تھے۔ لائل پور شہر سے تعلق رکھنے والے پیپلز پارٹی کے رانا شمیم احمد خان جو پنجاب اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر بھی تھے اور لائل پور پیپلز پارٹی کے صدر میاں اقبال پہ جب ضیا حکومت نے قتل کے مقدمات درج کیے اور ان پہ برا وقت آیا تھا تو سیف خالد ہی تھے جنھوں نے ان دونوں کو دو دن اپنے گھر میں روپوش رکھ کر ان کو لندن فرار کرانے میں مدد کی۔ رانا شمیم احمد خان کو پٹھانوں کے روپ میں پشاور پہنچایا اور وہاں اپنے دوستوں کی مدد سے ان کو افغانستان پہنچایا۔ پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے ایک اور دوست رانا ذوالقرنین کی اکثر شامیں سیف خالد کے گھر گزرتی تھیں، اصل میں وہ سیف خالد سے سفارش کروا کے غلام نبی میمن کے ذریعے اسمبلی کا ٹکٹ لینا چاہتے تھے اسی طرح رانا سخاوت علی خان بھی سیف خالد سے سیاسی استفادہ حاصل کرتے رہتے تھے۔ پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے عبدالستار نے تو اپنی مل کی ملازمت بھی سیف خالد صاحب کی وجہ سے حاصل کی جو سیف صاحب نے اپنے بھائی کو کہلوا کر دلائی۔ اس ملک میں جب بھی کوئی سیاسی معاشی بحران آیا تو سب سے پہلے سیف خالد ہی اس شہر میں متحرک ہوتے، اس کا آغاز وہ لائل پور شہر کی ڈسٹرک بار کونسل سے کرتے، جہاں تمام وکلا ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ سیف صاحب بار روم سے سیاسی ظلم کے خلاف کوئی قرار دادا منظور کراتے وکلا کا احتجاجی جلوس نکلواتے یا بھوک ہڑتالی کیمپ لگواتے، میں دس گیارہ بجے بار کونسل پہنچ جاتا سیف صاحب یا تو پہلے سے موجودہ ہوتے یا آ رہے ہوتے بس پھر وکلا کرسیاں اٹھائے سیف خالد صاحب کے پاس آکر بیٹھتے جاتے اور سیف صاحب ایک قسم کا اسٹڈی سرکل لیتے رہتے۔ وہاں سے ہم دو بجے کے قریب اٹھ کر سیف صاحب کے ساتھ ان کے گھر چلے آتے میں نے بہت کم دیکھا کہ وہ دوپہر کا کھانا اکیلے کھا رہے ہوتے اکثر ان کے ساتھ ایک گروپ ہوتا۔ کھانے کے بعد وہ پارٹی کا کام کرنا شروع کر دیتے، لوگوں سے ملاقاتیں دوسرے شہر کے پارٹی کے لوگوں سے رابطے اور پھر شام کو محکمہ ایکسائز کے ساقی آجاتے مجھے سیف خالد جی کے ساتھ اکثر سفر کرنے کے موقعے ملے ہیں لاہور چارمزنگ میں جب

بھی میٹنگ ہوتی میں، دادا لطیف رانا حمید شاہ بھائی سیف جی کے ساتھ ہیجاتے کامیرڈ عزیز اکیلے جاتے کیونکہ کامریڈ عزیز کی سیف خالد جی کے ساتھ کبھی نہیں بنی پتہ نہیں کوں۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے بڑی دفعہ کوشش کی سیف خالد پیپلز پارٹی میں شامل ہو جائیں اس کے لیے بھٹو نے انھیں سینٹ کی سیٹ، وزارت اور پارٹی کے مرکز میں بڑا عہدہ دینے کی بھی پیشکشیں کی مگر سیف خالد نے لاہور کے شاہی قلعہ میں جاکر بیٹھنا قبول کر لیا مگر اپنے نظریات سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ بہادر بننا اور بات ہے مگر آخری دم تک اپنے نظریات پہ قائم رہنا اور بات ہے ورنہ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ کیونسٹ جب بڑھاپے کی طرف بڑھتے ہیں تو اپنی نظریات سے پیچھے ہٹنا شروع کر دیتے خاص طور پر اگر وہ بیمار ہو جائیں۔ سیف خالد جب بہت بیمار پڑھ گئے خاص طور پر جب ان پہ فالج کا حملہ ہوا اور وہ بولنے سے بھی معذور ہوگئے اس وقت بھی سیف خالد اپنے نظریات پہ قائم رہے۔

وہ آدمی جو چوبیس گھنٹے بے تھکان بولنے والا ہو اور بول نہ سکے تو آپ اس کی حالت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک دن سیف جی کی والدہ محترمہ کہیں سے پانی دم کرا کر لائیں اور انھیں پلانا چاہا تو سیف صاحب امی جی محبت میں پی تو گئے مگر ہنستے رہے اور جب امی جی قرآن کی آیات پڑھ کر سیف جی کے چہرے پہ پھونک کر چلی گئیں تو سیف جی نے قریب پڑھے ڈان کی طرف اشارہ کر کے کہا، یہ پڑھ کر سناؤ، اصل میں دوست اور گھر والے سیف جی سے اخبارات چھپا کر رکھتے تھے کیونکہ ضیا کی ظالم ترین مارشل لا کی وجہ بہت بھیانک خبریں چھپ جاتی تھیں جنھیں پڑھ کر سیف جی کی طبعیت بہت بگڑ جاتی تھی اب مجھے یاد نہیں کہ پنجاب ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ نے جب بھٹو کا پھانسی دینے کا فیصلہ سنایا تھا تو گھر میں اخبار بند کرا دیا تھا اور ٹی وی کو بھی بند کر دیا۔ سیف خالد نے جہاں میری سیاسی تربیت کرنے میں بہت مدد کی وہیں شہر کے بتہ سے نوجوان کو بائیں بازو کی سیاست سے روشناس کرایا۔

جیسا کہ میں نے کہا کہ سیف خالد لائل پور شہر کا چہرہ لائل پور کا مان اور لائل پور کی پہچان تھے اسی طرح ان کے جانے کے بعد لائل پور سیاسی طور پر یتیم ہوگیا تھا۔

سیف خالد کے سب سے بڑے بیٹے ندیم خالد نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھا۔ محض چند یادوں کی مدد سے انہوں نے اپنے والد کی زبردست کردار نگاری کی ہے۔ یہاں ان یادوں کو دہرانے کا موقع نہیں ہے۔ اس تکرار سے بچتے ہوئے صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس باب کو پڑھنے کے بعد پیش لفظ پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیں۔ میری بات کی تصدیق ہو جائے گی۔

ورثہ:

انہوں نے اپنی مختصر زندگی میں بھرپور نظریاتی ورثہ چھوڑا۔ دنیاوی کاروبار میں وہ بری طرح ناکام رہے اس کے باوجود ان کے اثاثے ان کی آمدنی سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ وہ یوں کہ لائل پور سے انہوں نے سو سے زیادہ بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے ماسکو بھجوایا۔ آج وہ حیات ہوتے تو قومی احتساب بیورو کی تحقیقات بھگت رہے ہوتے کہ تمہارے اکاؤنٹ میں صفر بیلنس شیٹ کے باوجود اتنے تعلیم یافتہ بچوں کا اندراج کیسے ہو گیا۔تم جو پروجیکٹر پر سوشلسٹ نظریات کی حامل فلمیں دکھاتے تھے،تم نے جو اتنی بھاری بھرکم لائبریری بنا رکھی تھی۔تم جو آئے دن ثقافتی تقریبات منعقد کرتے تھے، ان سب کی کبھی ریٹرن کیوں نہ جمع کرائی۔تم نے ساری زندگی اتنے کام کئے۔ ان کی منی ٹریل کہاں ہے؟ کیوں نہ تمہارے خلاف بعد از مرگ ریفرنس دائر کیا جائے؟ مجھے یقین ہے سیف خالد قبر میں بھی اس مقدمے کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو جاتے۔

اولاد

نظریاتی اعتبار سے ان کا بہت بڑا کنبہ تھا۔ لائل پور کی گلیوں سے لے کر پوری دنیا میں پھیلا ہوا لیکن دنیاداری کے اعتبار سے ان کے چار بچے ہیں جو آج بھی ان کا نام لے کر جیتے ہیں۔ انہیں اس بات پر فخر ہے کہ ان کے والد کا نام سیف خالد تھا مختصر ترین

لفظوں میں ان کی اولاد کا ذکر درج ذیل ہے:

ان کے سب سے بڑے بیٹے کا نام ندیم خالد ہے۔ وہ یکم نومبر 1958ء کو پیدا ہوئے، اس وقت ایوب خان کے مارشل لاء کو بمشکل تین ہفتے ہوئے تھے۔ اس وقت پورا ملک قید خانہ بنا ہوا تھا۔ خصوصاً نیشنل عوامی پارٹی کی تمام قیادت کو پابند سلاسل کیا گیا تھا۔ قید و بند کے اس ماحول میں آنکھ کھولنے والے ننھے ندیم خالد اور ان کی نسل کو تعلیم و تربیت کے بہتر مواقع نصیب ہوئے۔ ندیم نے پیٹرس لومبا پیپلز یونیورسٹی، ماسکو، سے تعلیم حاصل کی۔ اسی اور نوے کی دہائی میں وہ بائیں بازو کی سرگرمیوں میں شامل ہوئے۔ اس دور ان انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے اپنے بعض ساتھیوں کی مدد سے "ریسرچ فورم" کے نام سے ایک سائنسی علمی ترقی پسند جریدہ جاری کیا۔ جس کے دس شمارے آج بھی علمی حوالے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ بالعموم سیاسی اور سماجی موضوعات پر لکھتے ہیں۔ آجکل وہ ادویات کی ایک کمپنی چلا رہے ہیں۔ انہوں نے ممتاز ترقی پسند ناشر ملک نورانی اور انجمن جمہوریت پسند خواتین کی رہنما بیگم ممتاز نورانی کی صاحبزادی حوری نورانی سے شادی کی جو ماسکو میں ان کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ ندیم اور حوری کے دو بچے ہیں۔

سیف خالد کی دوسری اولاد، بیٹی صبوحی گل ہیں۔ وہ 4 اگست 1960ء کو پیدا ہوئیں۔ پیشے کے اعتبار سے معلمہ ہیں۔ ان کے تین بچے ہیں۔

ان کی تیسری اولاد بیٹا نیاز خالد ہیں جو 9 اپریل 1962ء کو پیدا ہوئے وہ کیلیفورنیا میں حفظان صحت کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ شادی شدہ ہیں اور ان کے دو بچے ہیں۔

ان کی چوتھی اولاد سب سے چھوٹا بیٹا خرم خالد ہے۔ وہ 8 مئی 1966ء کو پیدا ہوئے۔ ان دنوں سیف خالد نیشنل عوامی پارٹی کے ایک ممتاز رہنما تھے۔ خرم نے اعلیٰ تعلیم بلغاریہ اور امریکہ میں حاصل کی اور اب کینیڈا میں رہائش پذیر ہیں۔ وہ ادویات سازی کے کاروبار سے وابستہ ہیں۔ وہ شادی شدہ ہیں اور ان کے تین بچے ہیں۔